دن ڈھلے
ابوالفضل صدیقی

دِن ڈھلے

ابوالفضل صدیقی

بک مارک (پرائیویٹ) لمیٹڈ
پاک چیمبرز، 5- ٹمپل روڈ
پوسٹ بکس نمبر 523 لاہور - 54000

فہرست

دِن ڈھلے

گرفت

مثل مشہور ہے، جوبندہ یابندہ' اور پھر ایک نہیں دونوں اپنی اپنی جگہ پر طالب، تو طلب کی شدت اور مطلوب تک رسائی کس قدر آسان اور ڈھونڈے سے تو خدا ملتا ہے۔ ادھر تو میاں عبدالحلیم خاں کو چڑھی ہوئی کہ جیسے بنے بڑے بھائی کو ان کے لڑکے سے پہلے ان سے اونچے گھر بیاہ کر دکھادیں۔ اپنی لڑکی ان کی بیوی نے دیا کیسے ہے طعنہ جب ٹھیکرے کی منگنی تھی کہ تمہاری بیٹی کو سوا میرے پاس کہیں دُنیا میں بَر نہیں ادھر میاں ضمیرالاسلام کے صاحبزادے شوکت الاسلام خاں نَو سال ولایت میں رہ کر انجینیری کی اعلیٰ ڈگری لے کر آئے تھے اُنھیں اپنے اکلوتے بیٹے کے پیوند کی شدید فکر دامن گیر تھی، اور ولایت پلٹ بیٹوں کی شادی کی فکر شاذونادر اگر کبھی ماں باپ کو ہوتی ہے تو سیاسی اغراض کی بنا پر اور ضمیرالاسلام خاں بیچارے اور ان کی بیگم غریب تو کھلم کھلا کہتے تھے کہ ہمیں تو اپنے بیٹے کی شادی صرف شادی کی غرض سے ہی نہیں کرنا ہے ہمیں تو اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی جاگیر کا وارث دیکھنا ہے تو ہماری اخیر سانس اطمینان سے کھنچے گی۔ شبہ تو میاں ضمیرالاسلام خاں کو بھی ہوگیا تھا، مگر ان کی بیگم نے تو ستم ہی کر دیا۔ تنہائی میں ولایت پلٹ صاحب زادے نے اماں جان پر فوراً ظاہر کر دیا تھا کہ وہ شادی کر کے لندن میں چھوڑ آئے ہیں۔ اس کا اثر انھوں نے یہ لیا کہ جیتی مکھی نگل گئیں۔ بس بند سونے کی چڑیا، آج تو میرے ہاتھ میں ہے اور جب ملازمت کو چلا گیا اور میم گھر میں آگئی تو پھر میرے ہاتھ آتا نہیں اور میں رہ گئی ایسی ہی اور گدی ویران ہوگئی یا ماں ٹینی، باپ کلنگ، بچے نکلے رنگ برنگ کوئی نیم فرنگی کرستان، صورتیں میری جاگیر

پر قابض ہوں گی۔ انھیں کیا دلچسپی اونے پونے بیچ کے لندن کو سدھاریں گے۔ لہٰذا خلوتوں میں بڑی بی روئیں پیٹیں۔ اور بالآخر اپنی مادری بے پناہ نسوانی قوتوں سے بیٹے کو زیر کر ہی لیا اور اسے اپنی نسل صحیح رکھنے اور ایک نجیب الطرفین پوتے سے گود بھرنے کے لیے دوسری شادی پر آمادہ کر ہی لیا۔

مسٹر شوکت فینسی ڈریس بال کی تیاری کے معیار اور شوق سے ماں کی فرمائش پر آج دوسری شادی کو بھی تیار ہو گئے اور کسی مکسڈ کلب کے ڈرامے کی طرح انھوں نے مشرقی دولھا کا پارٹ لینا منظور کر لیا۔

اگرچہ خالص مشرقی اور قصباتی جاگیردار تمدن میں مسٹر شوکت نے آنکھ کھول کر عمر کے انیس سال پرورش پائی تھی مگر نو سال کی ولایت کی جگمگاتی زندگی نے مشرقیت کو بالکل ماند کر کے انھیں پورا پورا مسخ کر دیا تھا اور وہ صحیح معنی میں ٹھیک ٹھیک رند مشرب قسم کے انگریز بن کر پلٹے تھے۔ شادی سے پیشتر اور دوران کے ہنگاموں کا ایکٹ مسٹر شوکت رشتہ کی بھاوجوں اور بہنوں اور ان کی سہیلیوں اور سہیلیوں کی رنگین مخلوط سوسائٹی میں نہایت شوخی کے ساتھ مذاق مذاق کے طور پر نہایت کامیاب کھیلے، اب رقت کا بند آیا اور مسٹر شوکت سٹھی بھولے۔ ان ہونی بھی ہو چکی تھی جیسے تین ہفتے کے سارے نشے چوتھے ہفتے میں اترنا شروع ہوئے اور جیسے ہی رخصت ہو کر آئی تو گویا مغربی فیشن کے پروردہ شوکت پر پچھلی تمام ہنگامہ آفریں صحبتوں کا خمار سا ٹوٹ پڑا۔ ٹھیٹ مشرقی وضع کا حجلۂ عروسی سولہ آنہ مشرقی رنگینیوں کے ساتھ ان کا منتظر تھا۔ ان کی بڑی بہن اپنی ساری چکڑی کے ساتھ ان کی اپنی خواب گاہ میں گیارہ بجے شب کے داخل ہوئی، جہاں وہ تھکے تھکائے سو رہے تھے اور سب کی سب انھیں سونے سے اٹھا کر "گر نہ ستانی بہ ستم میرسد" ڈرامہ کے ڈراپ سین والے ایکٹ کے لیے اٹھا کر لائیں، بالکل اس طرح جیسے بز قصاب بکرے کو گھسیٹ کرلے جاتا ہے اور کشاں کشاں آنکھیں ملتے ہی ملتے حجلۂ عروسی میں ڈھکیل کر باہر سے دروازہ مقفل کر دیا۔

مشرقی خوشبوؤں اور مشرقی روشنیوں سے معطر اور جگمگاتی فضا اور بیچوں بیچ ایک شاندار چھپر کھٹ کے رنگین قدرے دھندلے سے پردے میں مشرقی رومان اور مشرقی حسن اور مشرقی وضع

کا پورا پورا نمونہ ایک مشرقی دلہن چپر کھٹ کی رنگینیوں کا ایک جزُ سا بنی ہوئی دبکی دُبکائی پڑی۔ بڑے بڑے شوخ اور خیرہ کن مغربی اکھاڑوں کے پچیت کھلاڑی۔ سے کچھ کرتے بن نہ پڑی۔ تین ہفتے کے قہقہوں، چُہلوں اور مذاقوں کا ردِ عمل پورے زور کے ساتھ طاری ہو گیا۔ اس نے ڈرامہ کے سب ہی پارٹ تجاہل عارفانہ کے ساتھ حسنِ درون پردہ کی رنگینیوں اور شوخیوں میں گھُل مل کر بڑے کامیاب کھیلے تھے اور چمک دمک حاضر جوابی اور بذلہ سنجی اور ہاتھاپائی میں ہر موقع پر سوا جا رہا تھا، مگر عملی پارٹ میں تو اسے جیسے ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑ رہا تھا اس پر اس وقت بیڈھب سنجیدگی سوار تھی۔ اس نے ادھر ادھر شوخ رنگ کا کاغذ منڈھی ہوئی کمرہ کی دیواروں پر نظر کی۔ اس نے موٹے بھاری نیچے بچھے ہوئے سُرخ قالین کا گداز لمس اپنے بڈ روم سلیپر کے تلووں پر محسوس کیا، اس نے حجلۂ عروسی کی جگمگاتی بھانت بھانت کے رنگین فانوسوں اور تھرتھرانے سے جھاڑوں سے آراستہ قوسی کرنیں چھوڑتی اور مثلث شیشوں پر روشنی کے عکس سے ایک مسلسل اور متواتر حرکت سی پیدا کرتی چھت دیکھی۔ اس کے شامّہ نے ایک عجیب قسم کی بھینی بھینی خوشبو سے تمام کمرہ معطر پایا اور پھر اس کی ٹکٹکی سامنے پڑے ہوئے چپر کھٹ کے بلند اور سُرخ پردے پر بندھ کر رہ گئی۔ اسے اپنے اس روایاتی ماحول سے کچھ گھن سی آئی۔ جیسے یہ خوشبو یہ ملبت۔ اور منقش در و دیوار، یہ دیوالی کی سی رنگینیوں سے پُر کمرہ ہر چیز سے انتہائی مشرقیت اور دقیانوسیت کے بھوارے چھوٹ رہے ہیں — اور اس نے دل میں کہا — اس لال پردے کے اندر؟ بھلا اس کے اندر مشرقی تمدّن کی سب سے روشن حماقت — ہندوستانی سماج کا ہزاروں سال پرانے کھیل کی تکرار بس ایک گڑیا، پلک مارتی گڑیا، سہاگ، مشک، عنبر اور حنا کی بھاری بھاری خوشبوؤں سے اچھی خاصی معجون مرکب بنی ہوئی سکڑی سہمی ٹیلی پتلی — دانت مسّی سے کالے اور ہونٹ دھڑی سے عنابی، سر پر بالوں کا جال سا بنا ہوا اور غریب مجھے دیکھ کر ایسی جھجکے گی جیسے جنگل کی پکڑی ہوئی بندریا — توبہ! یہ کس مصیبت میں پڑ گیا — مذاق ہی مذاق میں آفت سر باندھ لی — اپنی سوسائٹی کا جوڑ، اور خائن اتنے بڑے اخلاقی جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے ذرا نہ سوچا — اماں جان تو عورت ذات، ڈو سو برس پرانی باتیں لیے پھرتی ہیں اور مجھے آلۂ کار بنا کر اپنے دقیانوسی رسم و رواج کو پٹنا تھا انھیں،

مگر میں کم بخت کیوں اس وقت ان کی پُرنم آنکھیں دیکھ کر ایسا احمق بن گیا۔ انھیں تو اپنی ہزار سالہ پرانی روایات کو بیسویں صدی میں بھی زندہ رکھنا تھا۔ انھیں دولہن چاہیئے تھی، وہ باہر سے لے کر اندر تک، ایک ہنگامہ کی خواہشمند تھیں، ڈھول تاشا، ناچ گانا، ہنسی مذاق، انعام اکرام دعوتیں، جلسے اور محض اپنی ذہنی تسلی کے لیے ایک بے زبان لڑکی کی تقدیر پھوڑ دی اور مجھے نہ اُس سوسائٹی کا رکھا کہ میم گھر میں ہے، کرسٹان بھنگی ہے اور نہ وہاں کا کہ مکّار فریبی ہے سوسائٹی میں بیٹھنے کے قابل نہیں۔ دوسری شادی کے جرم کا مرتکب ہوا ایک مہذب خاتون کو دھوکہ دیا اس سے تو بہتر تھا کہ رنگین کٹھ پتلی کو کپڑے پہنا کر ہنسی، مذاق اور کھیل تماشے کی تکمیل کر لی ہوتی — بھلا اس سانس لیتے تندرست مردے کو لانے کی کیا ضرورت تھی۔ کہاں فرانس، اور انگلینڈ کی اول درجے کی آباد سوسائٹیوں کا رجحان اور کہاں یہ بے چاری جاہل دیہاتی قصباتی لڑکی —— ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا۔ بھلا یہ اور میری شریک حیات، اور میں اس کا شوہر!! کچھ نہیں اس غریب بے زبان انسان نما حیوان کی مٹی خراب کر دی انھوں نے اور اپنے سب ارمان نکال لیے۔ پھر یہ بھی چند روز کی بات ہے۔ بڑی بی تو پکّا پان ہیں اپنے رستے جائیں گی اور یہ بچاری اپنی زندگی کا پہاڑ کاٹنے کو رہ جائیں گی۔ چھ چھ چھ لعنت ہے تجھ پہ ہندستانی سماج اور مغربی روایات ؎ کچھ عجیب اضطراری کیفیت شوکت میں ان خیالات کی پیچیدگیوں نے طاری کر دی اس نے کچھ جذباتی کیفیت کے عالم میں بار بار اپنی دھاری دار سلک کے لباس شب خوابی پر ہاتھ پھیرے۔ ایک انگڑائی لے کر ادھر اُدھر دیکھا پھر دروازہ کی جانب متوجہ ہوا، "اوہو، یہ دروازہ باہر سے مقفّل کر گئیں — بس اب آج سے ان کا مذاق گراں معلوم ہونے لگا بھئی —— تہذیب اور ایٹی کیٹ سے باہر ہو گئی ہیں سب کی سب — ہیں نا دیہاتنیں — اور ہاں پھر ذرا باجی کو تو دیکھو — سب کے ساتھ میں پڑھ کر اور ادب لحاظ بالائے طاق رکھ کر وہ بھی میرے پیچھے پڑی ہیں، اور سب میں پیش پیش ہیں — اور کمرے کے اندر مشرقی رومان کی ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو، کتنے بڑے کمرے میں بس ایک چھپر کھٹ، کوئی آرام کرسی تو درکنار اسٹول بھی نہیں، نہ معلوم کتنی راتوں کا جاگا تھکا ہارا اور انھیں سب بے ایمانیوں کا ستایا سو رہا تھا، سو یہاں دھکا دے کر چلی گئیں — اور سگریٹ بھی نہیں! اب رات کیسے کٹے اس نے غور سے ادھر ادھر دیکھا اور ایک

کونے میں ایک چھوٹی سی چوکی پڑی نظر آئی، غنیمت سمجھ کر ادھر بڑھا، آفتابہ اٹھا کر نیچے رکھا، مٹی کی ٹھیلی دوسری جانب پھینکی، تسبیح ایک طرف کی اور مصلے بچھا کر دیوار کا تکیہ لگا کر بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی جھپکیاں لینے لگا۔"

یک دم نیند میں بے خبر نماز کی چوکی پر گھٹری سے بنے پڑے ہوئے شوکت کا کسی نے کان کھینچا اور کھینچا اور یہاں تک کھینچا کہ وہ لیٹے سے بیٹھ گیا "ہوں، ہوں" شوکت غریب کہتا ہی رہا مگر کان تنتا ہی رہا یہاں تک کہ کھچاؤ نے اسے بیٹھے سے کھڑا کر دیا "ایں ایں چُپ چُپ چُپ کر کے شوکت نے بڑی تیزی سے بار بار پلک مارے اور سامنے نظر کی تو ایک خوب صورت چہرہ اپنے اوپر مسلط پایا۔ نیند سے ماؤف دماغ اور بوجھل آنکھیں کچھ تمیز نہ کر سکیں، مگر جسم نے ڈھیل دے کر کان کے تناؤ سے قدرے خلاصی حاصل کی ایک ہاتھ فطری طور پر کان پر گیا اور دوسرا آنکھیں ملنے لگا۔ دو مرتبہ آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر نیند سے بھاری ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ " ہیں ہیں ب ب باجی میرا کان تو چھوڑو۔"

"نہیں چھوڑوں گی آج تجھے موذی۔ میں ساری رات تیری حرکتیں دیکھتی رہی ہوں۔ ہم سب تجھ کو اس لیے چھوڑ گئی تھیں، کہ نماز کی چوکی پر آ کر سو جائے۔ بے ایمان ہم سب کو اُلّو بنایا۔ چل۔"

اور میاں شوکت کشاں کشاں بہن کے ساتھ بکری کی طرح کان کے تناؤ پر چل دیے۔ خیر ایسے مذاق تو مہینہ بھر سے وقت اور بے وقت چل ہی رہے تھے۔ آنکھوں سے نیند کا خمار غائب تھا۔ اس کی بہن نے اسے دلہن کے چھپر کھٹ کے برابر کھڑا کر دیا اور چھپر کھٹ کا پردہ اٹھا کر نہایت آہستہ سے سوتی ہوئی دلہن کا گھونگھٹ اٹھایا اور نہایت تلخ اور طنزیہ انداز میں کان کو ایک ہلکا سا جھٹکا دے کر کہا۔

"نااہل فرنگی! بہت سی موم بتیاں دیکھی ہوں گی وہاں ولایت میں۔ یہ دیکھ۔ ہم پٹھانیوں کو۔ سچّی چینی، کچّی چاندی۔"

شوکت کی نگاہ حسنِ خوابیدہ پر جم کر رہ گئی، وہ متعجب ساکت و سامت کھڑا رہ گیا۔ جیسے کسی مصلح خوش مذاق بت تراش نے سنگِ مرمر پر اپنے کمال کا فن دکھایا۔ "سبحان اللہ! "بے اختیار اُس

کے منہ سے نکلا اور جوں ہی اس کی بہن نے آہستہ سے گھونگھٹ درست کیا تو جیسے رنگینیوں اور رومانوں کا ایک سیلاب سا شوکت کے سینے میں اُمنڈ پڑا۔ اور چپر کھٹ کے پردے کے اندر کی تمام فضا میں رنگین شرارے سے طرارے بھرنے لگے ـــ "پھونک دیا! " اللہ اکبر! " اس نے دل میں خیال کیا " جس وقت یہ فتنہ خوابیدہ آنکھ کھولے گا تو کیوں نہ قیامت کبریٰ برپا ہو جائیگی اور جیسے یورپ کے سب نگار خانوں کے رومان اور رنگینیاں سب آج اسی چھوٹے سے کمرے میں سمٹ آئے ہیں۔ شوکت کے سینے میں ایک رنگین آگ کا بغارہ سا اٹھا اس نے آہستہ سے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کچھ ٹھٹکا اور ٹھہرنے کا انداز بنا کر اس کی خمار آلود آنکھوں نے جیسے کچھ اپنی بہن سے استدعا سی کی ـ مگر بہن نے پہلے ہی انداز پر سب کچھ بھانپ کر اور بغیر ہی شوکت کے کچھ کہے سب کچھ سن کر کہا ـ

"جی نہیں ـــ چلئے اب باہر تشریف لے جائیے، میں دلہن کو نماز پڑھانے آئی ہوں ـــ دیکھو تو بے چاری تمام رات یوں ہی پڑی رہی۔"

شوکت نے قدرے مڑکر چپر کھٹ پر ایک پردہ توڑ نگاہ ڈالی جو کھلی آنکھوں بول رہی تھی " کاش ایک نظر ہی اور " مگر ـ بے درد بہن نے زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ اپنے اختیارات کا پورا استعمال کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا ـ

" یا اللہ ـ مجھے ابھی دلہن کو وضو کرانا ہے، میکے کی ملازمہ آئے گی باہر سو رہی ہے، جاؤ بھی، دیر ہو رہی ہے۔"

اور دروازے کی جانب اشارہ کیا اور مسٹر شوکت کچھ عجب احمق سے بنے بار بار مڑ کر پیچھے دیکھتے دروازے تک گئے اور دروازے پر جا کر پھر کچھ ٹھٹکے اور قہر درویش بر جان درویش باہر ہو گئے ـ

بنتے تو ویسے بڑے جاگی ہو مگر یار شوکت میں نے تم سب ولایت پلٹ ایسے ہی گرگے دیکھے ـ ابھی ذرا دیر ہوئی تو مجھ سے تمہاری باجی نے تذکرہ کیا کہ آپ جا کر نماز کی چوکی پر لٹھک گئے

اور بس وہیں گدھے کی طرح تمام رات خرّاٹے لے کر صبح نکال دی ۔ اور جب انھوں نے گوشمالی کی اور چپر کھٹ کا پردہ ہٹا کر دکھایا تو پھر منہ میں پانی بھر آیا ۔ "کیا کہیں دولہا بھائی " ۔ اور پھر باجی کی چڑھ بنی "

کچھ نہیں، جاؤ نرے لونڈے ہی ہو ۔ وہی مثل کہ بارہ برس لندن میں رہے بھاڑ جھونکا ۔ ارے میں کہتا ہوں تم لوگ لندن پیرس کے اکھاڑوں میں کیسے ہاتھ مار جاتے ہو اور ایک تم ہی کیا، میں نے تو جتنے صاحب بہادر دیکھے، سب ایسے ہی خرِ نامشخص دیکھے "

"اب جو کچھ کہو دولہا بھائی وہ ٹھیک ہے اور انھیں باجی کو بھی مجھ غریب پر پھر ذرا رحم نہ آیا، بستر پر آ کر گھڑی دیکھی تو ڈو گھنٹہ رات باقی تھی "

"بہت ٹھیک کیا انھوں نے ۔ میں بہت خوش ہوا ۔ تم سے گدھوں پر رحم کھانا ظلم ہے ۔ ارے بے وقوف ایسے موقع پر تو مت چوکا ہوتا "

"خیر اب جو کچھ بھی کہو، ٹھیک ہے، قاعدہ میں پھنس گیا ہوں آج تو "

"نہیں یہ بات نہیں ہے تم ویسے تو سب انگلینڈ ریٹرن بڑے چالاک بنتے ہو مگر چیز کی پرکھ نہیں جانتے یار ۔ بس فیشن، پوڈر، کریم اور تتلی کی سی تھرک کے حیا سوز اور بے غیرت عریاں مناظر پر مٹتے ہو ۔ کاغذی پھول کی رنگتیں دیکھ کر بھنگو کی طرح ناچتے پھرتے ہو ۔ ارے سفید گدھو جانتے ہو کہ حسنِ مہندی لازوال مانا گیا ہے ۔ لازوال "

"جی اب تو احمق بن ہی گئے ۔ باجی نے تو رات حماقت پر سچ مچ گوشمالی کر ہی دی ۔ اور آپ یہ بھگو بھگو کر رسید کر رہے ہیں ۔ اب آپ دونوں میاں، بی بی خواہ نا اہل فرنگی کہو یا سفید گدھا بناؤ "

"اجی صاحب بہادر ! احمق سے احمق آپ بنے ہیں ! ! شاہی احمق بندہ نواز ۔ آج تک ہندستان بھر میں ایسا احمق کوئی نہیں بنا "

"خیر دولہا بھائی، آج بھی تو رات آئے گی "

بڑے زور سے قہقہہ لگایا اور کہا ۔ " اجی صاحب بہادر بس اب نہیں آئے گی کبھی ۔ یہ رات تو بس عمر میں ایک مرتبہ آیا کرتی ہے روز روز نہیں آتی ۔ اور پھر بڑے زور سے قہقہہ

لگایا اور ہنستے ہنستے لوٹ گئے اور بولے "میاں تمہارا قصور نہیں، ولایت پلٹ سولین ہوتے ہی ایسے کھڑپے ہیں ــ نرے کاٹھ کے اُلّو سولجر سپاہی "ــ پھر جھینپتے ہوئے شوکت کی جانب دیکھ کر سنجیدہ ہوکر کہا، بھئی یہ تمہارا قصور نہیں ہے بلکہ اس سوسائٹی اور ماحول کا قصور ہے ــ در اصل عشق وحُسن اور رومان کی ساری شوخیاں پردہ اور محرومی تک ہیں ــ شب عروسی کے رومان کی رنگینیاں کچھ اسی کی آنکھوں میں آسکتی ہیں جسے روزِ عروسی حاصل نہ ہو۔ ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات، تمہاری سوسائٹی کی کساد بازاری تم لوگوں کو بے حِس کر دیتی ہے اور مجھے تو کچھ ایسا لگتا ہے کہ طوائف کے پیچھے ساز بجانے والے بھنڈیلوں کی طرح تم حسن وعشق کے رومان سے تو در کنار جنسی جذبات سے بھی عاری سے ہو کر رہ جاتے ہو ــ ارے ظالم ہندستانی عقیدے میں رات تو نے اپنی لیلۃ القدر کا خون کر دیا ــ چہ چہ چہ، توبہ توبہ ــ قربان جاؤں، تمہاری عقل کے، بھر پیٹ ہو، واللہ ــ"

اور پیچھے سے شہاب النساء کی آواز آئی "آپ تو بڑے عقلمند ہیں ــ کیا بیوقوف بنائے چلے جا رہے ہیں میرے بیرن کو ــ ہوں، پڑ جائے اک ذرا سی کان میں، اور پھوٹے ڈھول کی طرح اور بس!"

خیر یہ تو تم اچھی طرح جانتی ہو کہ عقلمند نہیں تو ایسے بے وقوف بھی نہیں ہیں بندۂ درگاہ جیسے یہ سات سمندر کا پانی پیئے جنٹلمین ہوتے ہیں۔"

"اوہو! اوہو! کیا کہنے آپ کی عقلمندیوں کے قربان جائیے ــ میرا بیرن ذری شرما گیا تو بس آپ کی بھی چڑھ بندھ گئی"۔

"اے سبحان اللہ! ــ کیا کہنے بھیا جانی کی شرم وحیا کے"۔

"اچھا باجی ــ خیر آداب عرض ــ شکریہ، آپ نے پھر شروع کر دی نا ــ عمر بھر کا ادب لحاظ آپ نے اس شادی کی بھینٹ پڑھا دیا ایں!؟"

یک دم پوری چکڑی قہقہے لگاتی آگئی ــ بس آج تو سب کے آثار بہت شدید تھے اور پچھلے تین ہفتے کے چپکے ہوئے جملے اور بدلے سب اتار رہی تھیں ــ ہر ایک شیر تھی۔

"اے ہے پیاری نازو!" ایک بھاوج نے جھک کر شوکت کا چہرہ جھانک کر کہا اور

قہقہوں کی نقرئی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

"اوہو! — شرمیلی — چوتھی کی دلہن کا سا نکھار ہے۔"

"اے کیوں نہ ہو خیر سے ابھی گھونگھٹ بھی تو نہیں کھلا ہے، بے چاری بُوبُو بٹیا کا۔"

"کاوشِ اخفا میں اُلٹی اور رُسوائی ہوئی۔ کہئے اب اٹھتی نہیں کیوں آنکھ شرمائی ہوئی۔" اور پھر سُریلے قہقہوں سے فضا گونج اٹھی۔

"ابھی شرم نہیں ٹوٹی ہے نگوڑی — ننھی بٹیا ہے۔"

"اے ہے! بُوبُو بس یہی سیکھ کے آئیں لندن سے ساری رات چوکی پر پڑی رہیں چوکیدار بنی۔"

"اے ہے خیر سے ابھی ننھی منی ہیں کیا جانیں، ابھی نتھ بھی تو نہیں پڑی ہے۔"

"منہاری آئی ہے دلہن بیگم! — چوڑی نہیں پہنو گی۔"

شوکت مُسکراتا رہا، سنتا رہا سنتا رہا، قہقہوں سے ساری فضا گونجتی رہی، پھر نہایت سنجیدگی سے اوپر مُنہ اٹھا کر بولا۔

"خواتین آپ مجھے معاف فرمائیں۔ آج شب میں آپ سب کی شکایات رفع کردوں گا۔"

قہقہوں سے ساری فضا گونج اٹھی۔ شوکت کے بہنوئی نے بڑا فلک شگاف قہقہہ لگا کر ہاتھ ملایا اور سب خواتین مُنہ پر ہاتھ رکھ رکھ کر ادھر اُدھر کو منتشر ہوگئیں۔

(۳)

وارفتگی

موسم بہار کے گرم اور روشن دن میں صبح سے شام تک رس چُوستے بھونرے کی طرح شوکت نے شام سے صبح تک ایک رات اپنی نوعروس کے ساتھ بھی گذاری نہ سہی ایک شب شمع محفل میڈم کے ساتھ چراغِ خانہ بیگم ہی کے ساتھ سہی۔ ایک مہینہ پیرس اور لندن کی شوخ و بیباک و بے لگام سوسائٹی کے ہنگاموں کی بجائے نیچی نگاہوں اور شُستہ مزاج والے شاداب اور نمکین، خوش

مذاق چہروں کے ساتھ ہی گذرا تو کیا بات تھی، کچھ عمر تو اس ماحول میں گذاری نہیں تھی۔

رخصتی سے تیسرے روز یعنی شبِ عروسی کے بعد جو دوسری شب آئی، وہ ریل میں سفر کر رہا تھا۔ شادی کے جوش اور ہنگامے، مہینہ بھر کی پُر لطف جاگیر دارانہ مذاق کی رہائش، اور مشرقی سوسائٹی کی نیرنگیاں اور باعصمت پاک دامن حسین و شوخ مستورات کی خوش مذاقیاں اور مشرقی عشق و رومان کا مجسمہ اپنی ایک رات کی دلہن، ہر چیز کو اپنی مخصوص سوسائٹی اور ماحول کے شیریں خیالات میں فراموش کرتا اپنی جائے ملازمت پر گھر سے ایک ہزار میل دور سمندر کنارے جا رہا تھا، جہاں اس کا دفتر تھا، اس کی محبوب سوسائٹی تھی۔ جہاں وہ اپنے پہنچنے سے ہفتہ بھر بعد اپنی مغربی بیوی کو بندرگاہ پر لینے پہنچتا۔ جائے قیام پہنچ کر ہفتہ بھر تک مہینہ بھر کی رنگین زندگی اور اپنی بہت رنگین قسم کی نوعروس کے نقوش کچھ کچھ باقی رہے اور میڈم شوکت کے پہنچتے ہی تو بس ہر چیز محو ہو کر رہ گئی، ان کا مغربی وضع کا بنگلہ چمک اٹھا۔ "نغمہ، سوسائٹی، زندگی! مقصدِ حیات دراصل خوب جانتے ہیں مغربی لوگ۔ بھلا چاٹا کرے کوئی لے کر حسنِ درونِ پردہ کو۔ انسان کو کم از کم اتنا تو محسوس ہو کہ اس کا شریکِ زندگی کوئی آدمی ہے۔" وہ اپنی فردوسی زندگی، اپنی متمدن دنیا کی تخلیق رفیقۂ حیات کے ساتھ کچھ فردوسی کیفیتوں سے گذار رہا تھا۔ تمام سوسائٹی میں اس کی رفیقۂ حیات حسن، شعور اور اخلاق اور خوش مذاقی، پُر آمیزی، بذلہ سنجی اور ہنگامہ آفرینی کے لحاظ سے رشک کی نظر سے دیکھی جاتی تھی، مجال کیا کہ اپنے مخصوص دائرہ میں کوئی دن چپ چاپ سیدھا سادہ گذر تو جائے اور جب ایسی آزاد اور خوب صورت، بہمہ صفت موصوف بیوی کو دیکھتا اور پھر اپنے ساتھیوں اور دوستوں کو رشک کرتے سنتا، تو اس کا دل احساسِ برتری سے لبریز ہو جاتا — اور وہ کبھی کبھی سوچتا کہ اگر میڈم شوکت کو میری اس حماقت کی اطلاع ملی تو خیریت نہ رہے گی۔

سات مہینے اسی طرح دن عید اور رات شب برات شوکت اور میڈم شوکت کو گذرے تھے کہ شوکت کو اس کے ماموں کا دعوتی رقعہ ملا اس کے ماموں زاد بھائی کی شادی تھی اور ماموں نے اس اقرار کے ساتھ طلب کیا تھا کہ اگر نہیں آؤ گے تو تاریخ ملتوی کر کے خود بلانے آؤں گا۔ وہ اپنے ماموں کو خوب پہچانتا تھا کہ کس قسم کے کھرے اور سپاٹ پٹھان ہیں۔ اگر میں نہ گیا تو سیدھے

تاریخ شادی پر یہیں دکھائی دیں گے، لہٰذا جانا اول اور جانا آخر، بچ ہی نہیں سکتا۔ اور اگر گریز کیا اور خوانخواستہ ماموں یہاں آدھمکے تو بہ ساز و سامان میڈم شوکت اور ماموں" مندار اور ملنگ" ایک جگہ جمع ہوئے تو نہ معلوم کیا مصیبت برپا ہو جائے۔ لہٰذا جانا ناگزیر تھا۔ ماموں کو نہایت ادب کے ساتھ خط لکھا کہ نہ آپ کو تاریخ ہٹانے کی ضرورت ہے نہ تکلیف فرمانے کی۔ برات سے ایک روز قبل شام تک حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔

براہِ راست کار سے چلا ہوا شوکت، عین شادی کے ہنگامے میں برات سے ایک روز قبل شب میں سات مہینے بعد پھر نظام آباد میں داخل ہوا۔ ماموں نے صدر پھاٹک کے دوسری منزل والے بالاخانے پر قیام کا انتظام کیا۔ صبح تڑکے پھاٹک کے سامنے اس نے اپنے باپ کی کار دیکھی، چاروں طرف رنگین پردوں سے بند، وہ سمجھ گیا کہ اس کی ماں وغیرہ ہیں، نشست سے اٹھ کر سیدھا پیچھے والے دروازے پر پہنچا، کار پھاٹک میں داخل ہو کر اور چوک میں ڈیوڑھی سے ملا کر بالکل قریب لگادی گئی، یہ اوپر برآمدے سے چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔ ڈرائیور باہر گیا اور پہلے پردے میں سے ایک ملازمہ برآمد ہوئی کچھ بیگمات کے آنے کے ساز و سامان ہوئے۔ پھر دوسری ملازمہ نکلی جس کی گود میں اس کی بہن کا سہ سالہ بچہ تھا۔ پھر اس کی بہن اُتری، اس کے بعد والدہ برآمد ہوئیں، اور پھر خود والدہ اور ایک ملازمہ نے سہارا دے کر ایک اور لڑکی کو اتارا۔ اور اتنی دیر میں ملازمہ کی گود سے دیکھ کر اس کی بہن کے بچے نے اسے اُوپر کھڑا پہچان کر بڑے زور سے کل کوری ماری اور "ممو ں جان، ممو ں جان" کہہ کر چلّا پڑا۔ تینوں خواتین کی نگاہیں غیر شعوری طور پر اوپر اٹھیں ــ یہاں شوکت الٹ کر جا پڑے، "غضب رے غضب یہ کون ؟!"

اور پھر مزید ستم یہ کہ ساتھ والی لڑکی نے اوپر دیکھ کر پردہ بھی نہیں کیا بلکہ سب کی طرح آپا سنبھال کر، اور نیچے نگاہ جھکا کر جہاں کی تہاں رہ گئی ــ بڑی بیگم پر تو جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا، وفورِ جذبات میں دور ہی سے بلائیں لینے اور دعائیں دینے لگیں۔ شہاب النسا بھیا کو دیکھ کر کیوڑہ سی کھل گئیں۔ ان کے لڑکے نے، "ممو ں جان، ممو جان" کہہ کر ملازمہ کو نوچنا شروع کر دیا۔ اور بار بار اوپر کو اشارہ کرنے لگا، مگر شوکت کو یہ بھی احساس نہ ہوا، کہ کس وقت اس کا ہاتھ غیر شعوری طور پر سلام کو اٹھ گیا، وہ بدستور سر سے لے کر پاؤں نیچے سر جھکائے اور کسی کسی وقت جیسے کچھ جھینپ

جھینپ کر اک معصوم ادا کے ساتھ اپنا دوپٹہ درست کرتی ساتھن کو گھور رہا تھا جیسے ناخنِ پا سے لے کر موئے سرتک قدرت نے ہر چیز میں اپنی نفاست اور حسن کی تخلیقی قوتوں کا اہتمام کر دیا ہے ہر چیز سانچے میں ڈھلی ہے۔ انسان ہے یا کوئی اور خیالی مافوق البشر مخلوق، بلا کا حُسن، غضب کی دل کشی، اور پھر سب پر ستم ایک قسم کا استغنیٰ اور معصومیت۔ بس میاں شوکت کو ایک مرتبہ کو تو جگمگاتی تہذیب کی سب رنگین روشنیاں اندر دکھائی دیں۔۔۔

سر سے پاؤں تک لازوال، ہر طور سے مائل بہ نموون دونی رات چوگنی قسم کی ترقی کے آثار، تمام وجود پر غضب کی پاکیزگی، بلا کا نکھار، ہر حرکت میں ستم کی شوخی، جیسے ایک ہی نظر میں شوکت ہوش و حواس سب شکار کر ابیٹھا۔ فرصت اسے بیخودی کچھ وہ سامنے کھڑے ہیں۔ نظروں کو ان کی دیدوں نذرانہ زندگی کا۔ وہ اپنے ماحول سے بے گانہ اپنی نگاہ کو بار بار ادھر لانے کی کوشش کر کے "کاش ایک نظر اوپر اور اُٹھ جائے" اپنی آنکھوں سے کہہ رہا تھا۔ اور جوں ہی اس نے سب کے ساتھ چلنے کے لیے اپنی جگہ سے حرکت کی تو اُسے قیامت سی اٹھتی معلوم ہوئی۔ اور اسی عالم رستخیز میں اس کے کانوں میں اپنی ماں بہن کی آوازیں ٹیلیفون کی طرح پن پن کرتی پڑیں "آؤ بچیو" ابھی آتی ہوں بھیا۔۔۔ ذرا ممانی جان کو صورت دکھا آئیں۔۔۔ ہفتہ بھر سے تو یہیں ہم سب کی سب مہمان تھیں کل شام کپڑا زیور درست کرنے چلے گئے تھے آج برات کے لیے۔" اور وہ ڈیوڑھی میں غائب ہو گئیں۔۔۔ شوکت کی نظریں تاحدِ نظر تعاقب کرتی رہیں، کیوں کہ سب سے پیچھے دو نوکرانیوں کے جلو میں وہی چل رہی تھی۔

غائب ہوتے ہی شوکت کو جیسے ہوش سا آیا۔۔۔ "کوئی باجی کی سہیلی ہو گی۔ شاید کچھ اس سے ملتے جلتے خدوخال کے نقوش شادی کے ہنگامہ میں کسی وقت نظر کے سامنے آئے بھی ہیں۔" اس نے اپنے ذہن سے ہٹانے کی ہزار کوشش کی بار بار اپنے ضمیر سے اپنے اوپر لعنت بھجوائی، بھلا کونسی شرافت ہے کہ اگر بہن کی سہیلی نے پردہ نہیں کیا تو اس کو دل میں لے بیٹھیو، توبہ توبہ۔" مگر لاکھ سمجھانے پر بھی دل نہ سمجھا اور نقوش محو نہ ہوئے۔ پیارا پیارا بھولا مکھڑا دل میں بستا ہی رہا اور معصوم ادائیں اور بس ایک مرتبہ چار ہو کر پھر نہ چار ہونے والی بڑی بڑی شراب کے چھلکتے سے پیالے انکھڑیاں آنکھوں میں بسی ہی رہیں، جن کی چڑھی نہ اترنا تھی نہ اتری۔ یہ آنکھوں کے

محدب شیشوں کے ذریعہ دل کے فلم پر اس بت کافر کی تصویر اتار نے کمرے میں آگئے، جوں جوں وقت گذرا، طبیعت ٹھکانے ہوتی گئی اور ہوش و حواس صحیح ہوئے، توسنِ خیال تیزی سے دوڑتا ہی رہا۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ تک برابر دماغ پر زور دینے کے باوجود بھی وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا کہ اتنے میں زینے کے اندر کچھ چاپ پر وہ چونکا۔ کچھ چوڑیاں اور زیور کی آواز کان میں پڑی، ساتھ ہی آہستہ سے بچے کی آواز "ممون جان، ممون جان" یہ سمجھ گیا کہ شہاب النسار آرہی ہیں "باجی" اس نے بیساختہ کہا اور اٹھ کر زینے تک گیا بچہ ممون ممون جان کہہ کر بڑے زور سے لپٹ گیا بہن نے بھائی کے سر پر ہاتھ پھیرا، دونوں بیٹھ گئے۔

"بہت آئے بھیا ہمیں تو کسی کو امید نہ تھی ۔ مگر ۔ ۔ ۔ "

"جی ہاں آپ کو تو کسی کو کیوں امید ہوتی بھلا — میں ماموں کو اچھی طرح پہچانتا ہوں اچھی طرح تم لوگ سب یہ بھی جانتے تھے یا نہیں پھر صاحب امید نہ ہونے کی وجہ!؟"

"ہاں ہاں ماموں تُلے بیٹھے تھے کہ اگر برات سے ایک روز قبل نہ آئے تو شادی کی تاریخ ملتوی کرا کر وہیں رکیں گے، وہ تو تمہارے دو تار انہیں راستے میں مل گئے تھے تو اطمینان سے وہ دن بھر بیٹھے رہے ورنہ انھوں نے تعین تاریخ ہی اسی شرط کے ساتھ کیا تھا بلکہ لڑکی والوں کو ان کی یہ شرط قدرے ناگوار گذری مگر تم جانتے ہو کہ ماموں تو ماموں ہیں بس۔"

"دراصل باجی اس وقت میرے آنے کی کوئی تُک تو تھی نہیں مگر تم جانتی ہو کہ میں ابا میاں سے اتنا نہیں ڈرتا ہوں جتنا امی جان سے اور امی جان سے زیادہ خوف مجھے ماموں میاں سے معلوم ہوتا ہے، بس اس خوف سے کہ ماموں سیدھے یہیں دکھائی دیں گے میں نے چُپکے ہی ان کے پہلے خط پر لکھ دیا کہ حاضر ہوؤں گا۔"

"ہوں پھر ماموں میاں کو محبّت بھی کس قدر بے پناہ ہے ہم دونوں کی، مجھے تو ایسا لگتا ہے بھیا، وہ اپنی اولاد سے زیادہ چاہتے ہیں بہن کی اولاد کو۔"

"ارے باجی مجھے یہاں ماموں میاں کی محبّت بالکل کھینچ کر نہیں لائی ہے بلکہ باجی کی سر کی قسم ان کا خوف — ٹھہراؤں گا کہاں اگر بنگلہ میں ٹھہراتا ہوں تو وہاں مسز شوکت نہ معلوم خان صاحب یہ ساز و سامان اور رنگ ڈھنگ دیکھ کر کیا بڑبڑا پڑیں — ہوٹل میں ٹھہراتا ہوں

تو اکھڑ پٹھان ذرا دیر میں محسوس کرلیں کہ میری توہین کی گھر پر نہیں ٹھہرایا اور دو جوتے میرے رسید کریں اور سمیٹے نہ سمیٹ ملیں لہٰذا باجی مناسب یہ خیال کیا کہ بس چپکے ہی کان ڈالے ہرکارے کی چال روانہ ہوجاؤں۔ اگرچہ باجی یہاں کے ماحول میں میرا دم گھٹتا ہے۔"

"ہوں خیر۔ کتنے روز ٹھہروگے۔"

"ہاں بس یہی دو روز۔۔۔ اور یہ تم اس وقت کہاں سے آئی تھیں۔"

"گھر سے۔۔۔ میں نے کہا نہیں تھا اس وقت کہ ہفتہ بھر سے ہم سب یہیں مہمان تھے۔ کل شام ذرا زیور کپڑا درست کرنے کرانے گھر چلے گئے تھے آج برات کے لیے۔"

"اپنے گھر سے اور کون کون تھا تمہارے ساتھ۔"

"کوئی نہیں، ہمیں سب تھے۔۔۔ انا اور ملازمہ اور کون ہوتا۔"

"نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ وہ کون ؟۔۔۔ کوئی سہیلی ؟ سُرخ زربفت کا غرارہ پہنے آپ کے ساتھ اتریں۔"

شہاب النسا نے چونک کر بھائی کے چہرے کو دیکھا کہ وہ تجاہلِ عارفانہ سے بات کر رہا ہے۔ اور اس کے بعد ذرا متعجب ہو کر کہا اِیں ! میاں سرتاج دلہن۔"

وہ پھر اس نئے خطاب کو نہ سمجھا اور چہرے سے استفسار کیا تو بہن نے قہقہہ لگا کر۔

"اب اتنے انگریز بن گئے میاں تمہاری دلہن تھیں تم نے نہیں پہچانا۔"

شوکت اچھل سا پڑا۔ اس کا چہرہ وفورِ مسرت سے چمک اٹھا جیسے اس کی بہن نے اسے ہفت اقلیم کی ملکیت کا مژدہ سُنایا۔ ہزاروں مغربی ناچوں کے لمس میں اپنی رفتار صحیح رکھنے والا دل بڑے زور سے دھڑک اٹھا جیسے اس کی بہن کی آواز کانوں کے راستے داخل ہوکر رونگٹے رونگٹے میں گونج گئی۔

"میاں تمہاری دلہن تم نے نہیں پہچانیں۔"

"اُفوہ ! ظالم !۔۔۔ مار ڈالا آج" جیسے اس کے اندر سے آواز آئی۔ سانس نے اپنی مسرور کیفیت پر قابو پاکر اپنی آواز حلق میں درست کرتے نہایت اطمینان اور فراغت کے انداز میں کہا۔ "اب پہچانتا کیا میں۔۔۔ جب تو بھی ایسی تھیں نہیں۔۔۔ اب تو کچھ اور ہی پَر پرزے نکالے

ہیں۔"

"پر پرزے نکالنا تو تم مرد ہی کچھ اچھے جانتے ہو ہم بے چاری کیا نکالیں گی بے زبانیں۔ ہاں ماشاء اللہ ذرا بھاری پڑ گئی ہیں، خیر سے امید سے ہیں۔ اللہ سے کیا خوشی ہونے والی ہے جو تم۔ گئے ہو اور اماں نے جال ڈھول پڑی حویلی میں رکھوایا ہے، آج تک نہیں بڑھنے دیا۔"

"توبہ الٰہی وہ کچھ ہونے والی ہے ۔۔ آپ کی خوشی وشی مگر یہ تو بتاؤ کہ مان لیا بھاری پڑ گئی ہے، خیر رنگ بھی کچھ سے کچھ ہو گیا ہے اور مجھے تو قد بھی مٹھی بھر سر کا معلوم ہو رہا ہے۔ چال بھی بدلی ہوئی ہے۔ پھر انگریز بچارے کی خطا جو نہیں پہچانیں، آپ ہندوستانی دیکھتیں تو کیا پہچان لیتیں۔"

" ہاں صاحب کیوں نہیں برابر ۔۔ برابر۔ آپ کیا جانیں ان باتوں کو ۔۔ اور ہاں کہیں اماں جان کے سامنے ایسی باتیں مت کر بیٹھنا کہ بھاری پڑ گئی ہیں، لمبی ہو گئی ہیں، یہ ہے وہ ہے، ورنہ غضب ہو جائے گا۔"

"بس بھیا۔ نہ معلوم کتنی تو تمہیں سنائیں گی اور کتنی نذریں اتاریں گی۔"

"اوہو! ۔۔ اوہو!"

"جی ہاں نہ معلوم کتنی مشکلوں سے تو وہ شادی میں لائی ہیں، ممانی صاحبہ کے بگڑنے پر اور ماموں میاں کے بار بار سر ہونے پر وہ لاتی کب تھیں نظر لگنے کے خوف سے۔"

"اوں ہوں کیا کہنے ۔۔ ان کی سرتاج دلہن کے، تو یعنی ہماری نظر لگ جائے گی ذرا دیکھنا یہاں کوئی ندیدہ بیٹھا ہے ۔۔ ان کی سرتاج دلہن کا۔"

زینہ کی چاپ پر بہار النسا نے کہا "ارے چپو بھی معلوم ہوتا ہے آ رہی ہیں، پان کھاتا چھوڑ آئی تھی۔ دو ملازماؤں کا سہارا لیے ہوئے شوکت کی والدہ آئیں۔ دونوں بہن بھائیوں نے بڑھ کر لیا۔ تھوڑی دیر ہانپتی سی رہیں پھر بڑھ کر بیٹے کی بلائیں لیں ہاتھ چومے، اور رانوں پر شوکت کا سر رکھ کر چارپائی پر تکیے کا سہارا لگا کر بیٹھ گئیں۔ اور جو باتیں مائیں بیٹوں سے کرتی ہیں کر کے چلنے لگیں تو شوکت نے بہن سے کہا۔

"آپ بھی چلدیں باجی۔"

"ہاں میاں ذرا آج تقریب کا دن ہے اور ممانی گھڑی گھڑی بات بات پر پوچھتی ہیں۔"

"خیر مگر ذرا خبر لیتی رہنا۔ میں اکیلا ہوں ادھر ہو جانا سمجھیں اور امی تو بار بار آتے رہیں اور ہماری رسائی آپ لوگوں تک آج ممکن نہیں ایسے میں۔"

"ہاں خیر۔" کہتی ہوئی شہاب النساء ماں کے پیچھے پیچھے زینے سے اُتر گئی۔

سہ پہر کے قریب شہاب النساء کے بچے کو لے کر اس کی انّا آئی تو شوکت نے کہا۔

"کیوں کیا کر رہی ہیں بٹیا۔"

"نماز پڑھ جوڑا بدلا ہے۔"

"اور سرتاج دلہن ؟"

"اور انھوں نے بھی ابھی مالن کو پھول پہناتی چھوڑ آئی ہوں۔"

"خیر ذرا بٹیا سے کہنا کہ اوپر آپ کے بھیا بلا رہے ہیں۔

انّا گئی اور شہاب النساء آئیں۔

"کیوں سب ٹھیک۔"

"ہاں سب ٹھیک باجی مگر رات یہاں پر نیند کچھ ٹھیک نہیں آئی۔"

"کیوں ؟ کمرہ تو معقول ہے۔"

"ہاں وہ کوئی بات نہیں۔ کل راستہ میں دو تین گھنٹے لیٹ ہو گیا اور باجی میری عادت ہے کہ لمبے رن پہ دوگنا پٹرول لے کر چلتا ہوں۔ راستے میں جگہ جگہ پٹرول حاصل کرنے میں دیر ہوئی ویسے خیال تھا کہ چھ بجے تک پہنچ جاؤں گا مگر پہنچتے پہنچتے دس بج گئے۔ یہاں ماموں میاں وغیرہ سب منتظر تھے۔ کسی نے کھانا بھی نہ کھایا تھا۔ خیر کھاتے پیتے بستر پر قریب بارہ کے پہنچا۔ ماموں بے چارے نے خود آکر بڑی محبت کے ساتھ یہاں سامان لگوایا کہ اوپر علٰحدہ بلند کمرہ ہے مگر تاہم شادی کا گھر نیچے پھاٹک اور ڈیوڑھی پر تمام رات تھوڑی بہت آمد و رفت اور کھٹکا ہوتا ہی رہا اور بار بار نیند میں خلل پڑتا رہا۔"

"اونہہ! وہ شادی بیاہ میں ایسا ہوتا ہی ہے۔"

"ہاں میں تھکا ہوا تھا، چھتیس گھنٹے ایک رفتار سے رن کیا تیس چالیس کی اسپیڈ سے

اور سب ملا کر دو چار گھنٹے کے لیے جہاں تہاں پانی بدلنے کو رکا رکایا ہوں گا ورنہ بس چلت ہی رہا

"مگر بڑی سیلون تھی ویسے تو آرام سے آئے ہوں گے۔"

"ہاں خوب بس رات یہاں نیند کی تکلیف رہی اور آج رات کو یہاں اور بھی۔"

"جی اب تو یہاں یہ دو تین دن، دن رات ایک گذریں گے — اور میاں یہاں تو بہت سکون ہے ذرا نیچے اتر کر دیکھو، اندر سے باہر تک سبزی منڈی بنی ہوئی ہے۔ ساری خدا کان پڑی سنائی نہیں دیتی۔ یہاں تو صرف یہ کچھ تھوڑا بہت غزنا اور نوبت کی متواتر آواز آتی ہے۔"

"ہاں مگر مجھے آج رات یہاں سونے میں تکلیف ہوگی۔ میں نے ماموں سے اجازت لے لی ہے۔ دوپہر کھانے پر انھوں نے کہہ دیا کہ تم رات کا کھانا کھا کر اپنے گھر چلے جانا اور صبح تڑکے برات چڑھتے وقت چلے آنا۔"

"خیر ٹھیک ہے کوئی بات نہیں۔"

"اور ہاں اس وقت آپ اکیلی کیوں آئیں۔"

"اماں جان ممانی کے پاس تھیں۔ بری کا جوڑا سنبھلوا رہی تھیں۔"

"نہیں اور وہ — وہ آپ کی بھاوج صاحبہ؟ — وہ تو شاید کالے آدمی سے بات کرتی نہیں ہیں۔"

"آہاہا — ارے تم مردوؤں کو ہم عورتیں خوب پہچانتے ہیں — رال ٹپک ٹپک پڑتی ہے اور تھوک کر چاٹتے ہو۔"

"جی ہاں! میں نے تو ویسے ہی پوچھا — یوں ہی کہ وہ کیوں نہیں آئیں۔"

"بھلا وہ کیسے آتیں! — تم نے یہاں لانے کی ایک ہی کہی میاں، میری چندیا پہ اتنے بال بھی تو نہیں ہیں جانتے ہو بڑی بی (اماں) کو اور ان کی پاپوش کے تڑاقے کو یعنی تم نے صبح موٹر سے اترتے وقت غور نہیں کیا۔ ڈو ڈو پٹریاں فٹ بورڈ کے برابر لگتی ہیں تو ان کی دلہن اترتی چڑھتی ہیں پندرہ انچ اونچے موٹر پر، تو بھلا وہ یہ پچیس سیڑھی کا زینہ چڑھنے اترنے دیں گی، ڈھائی سیڑھی ڈیوڑھی اتراتے چڑھاتے وہ تھر تھر کانپتی ہیں اگر میں نام بھی لیتی تو میری

چوٹی بیندھ کے پھینک دیتیں، ہزاروں صلواتیں سناتیں۔"

"اوہو! اوہو! اللہ خیر کہیں کھچڑی کھاتے پونچہ نہ موچ جائے۔ کروٹ لیتے جھٹکا نہ آجائے، مولی کے پتے پر پاؤں پڑ کے زکام نہ ہو جائے۔"

"بھیا، دیکھو ایسی بات کوئی اماں کے سامنے مت کہہ دینا اب سمجھ لو کہ جمعرات کے جمعرات تو بکرا قربان کرتی ہیں، ہر جمعہ کو میلاد شریف پڑھواتی ہیں اور سینیچر کے دن صدقے اتارتی ہیں اور پانچوں وقت نماز کے بعد سورۂ یوسف خود پڑھ کر پیٹ پر دم کرتی ہیں۔"

"اوہو! دم عیسیٰ پھونکتی ہیں! سورۂ یوسف پڑھتی ہیں اللہ رے حسنِ انتظام۔۔ یا انتظامِ حسن!!"

"جی اور بس جس تاریخ سے تم گئے ہو بڑی حویلی میں ڈھول رکھا گیا ہے آج تک نہیں اٹھا ہے۔ ہر وقت زچہ گیریاں گواتی ہیں۔ کبھی نوکر ہیں چچا میاں، کبھی بی بی صاحبہ خود اپنی سہیلیوں کے ساتھ اور کبھی ہم لوگ جمع ہو لیں تو۔۔ غرض ڈھول کو چین نہیں۔"

"خوب، یعنی تم لوگ بھی چماریوں کی طرح ڈھول پیٹ لیتی ہو۔"

بھئی کیا کریں بڑی بی اگر کسی چیز سے راضی ہیں تو اسی سے کہ دولھن کی زچہ گیریاں گائی جائیں۔۔ اچھا میاں اب میں جاؤں گی ممانی ذرا دیر میں شکایت کرنے لگتی ہیں۔"

شہاب النساء چلی گئی اور مسٹر شوکت آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے اور دن دہاڑے کروٹیں لینے لگے تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ

ع جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

کے انداز سے لیٹے رہے۔ ملازم ناشتہ چار کی کشتیاں لے کر آئے اور میز پر لگا دیں تو شوکت نے کہا۔

"دیکھو ذرا اندر کہلا دو کہ شہاب بٹیا کو اوپر میاں بلا رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر میں شہاب النساء اوپر آئیں۔ شوکت نے دیکھتے ہی کہا۔ "باجی خیر تو ہے صبح سے یہ تیسرا لباس دیکھ رہا ہوں آپ کو پہنے ہوئے۔"

"ہاں میاں برات کا دن ہے، آج سرتاج دلہن تو شاید پانچواں جوڑا بدل رہی ہیں اور شاید

شام ہوتے ہوتے اماں انھیں دو اور تبدیل کرا چھوڑیں گی۔"

"اوہو! اوہو!" شوکت نے طنزیہ کہا۔

"جی صبح تو تم نے دیکھا ہی تھا آتشی گلابی زربفت کا غرارہ اور پیازی پیرس فلاور کا کامدار دوپٹہ اور قمیص، اور یاقوت کا سیٹ پہنے ہوئے تھیں، ناشتہ پر جو آئیں تو کاسنی جال دار جارجٹ چکن کا دوپٹہ اور کاسنی پیرس فلاور کا جمپر اور شلوار اور موتیوں والا سیٹ پہنے ہوئے تھیں پھر کھانے پر دوپہر کو انگوری شیفون کا دوپٹہ، انگوری سلک کا جمپر اور انگوری زربفت کا غرارہ، اور زمرد والا ہلکا ولایتی سیٹ پہن کر نکلیں اور پھر تھوڑی دیر بعد جب نوشہ کی مہندی ابٹن لے کر سالی آئی تو سرتاج دلہن عنابی زربفت کی بھاری ساڑھی اور ہیرے کا پورا بڑا سیٹ پہنے ہوئے نکلیں اور جب سالیاں چلنے لگیں تو ان کو رخصت کرتے وقت نارنگی کامدار دوپٹہ اور قمیص اور اودا کمخواب کا غرارہ اور پکھراج اور ہیرے کے دونوں سیٹوں کے دو دو تین تین عدد پہنے ہوئے تھیں اور ابھی ابھی میرے ساتھ باریک سیفون کی روپہلی کامدانی نیلی ساڑھی اور نیلم والا سفید پلاٹینم کا ولایتی سیٹ پہنا ہے جو ابا میاں پارسال کلکتہ سے لائے تھے۔ جب شادی کا سامان خریدنے گئے تھے۔ گلشن مشاطہ اور گلابو مالن ساتھ ہیں اور اماں جان کو ہر وقت بس یہی ایک مشغلہ ہے کہ ساری مجلس کی دلہنوں کو بیٹھی بھانپتی ہیں کہ محفل میں کوئی ان کی سرتاج دلہن سے بڑھ نہ جائے اور خود سرتاج دلہن بے چاری کو تو خیر کچھ ایسی بہت وہ نہیں ہے بس گلشن اور گلابو بڑی بی کے اشاروں پر چل رہی ہیں اور چیل کے سے دیدوں سے ساری محفل کو پرکھتی رہتی ہیں اور بڑی بی کا اشارہ پاتے ہی دلہن کو اٹھا کر اندر لے جاتی ہیں۔ رنگ برنگے کپڑوں اور زیوروں میں سجا سجا کر، طرح طرح کے بال سنوار سنوار کر اور بھانت بھانت کے گجرے پہنا پہنا کر دولہن بناتی ہیں اور بڑی بی اندر جا کر اور سنگھار آرائش دیکھ کے اور پسند کر کر کے دہی کے ٹیکے لگا لگا کر اور نذریں اتار کر دولہن کو محفل میں لاتی ہیں اور بس بھیا حق بات تو یہ ہے کہ سرتاج دولہن کے نکلتے ہی ساری محفل ماند پڑ جاتی ہے اور سب کی سب سا سیں کٹ کٹ جاتی ہیں اور دولہنوں کے چہروں پر دھول سی اڑنے لگتی ہے۔ راج محل والی بہو اب تک سات جوڑے اتار چکی ہے۔ سات ڈیوڑھیوں والی دونوں دولہنیں بے تعداد جوڑے بدل چکی ہیں غرض کس کس کی کہوں

بھیا۔ آج تو بڑی نے ساری محفل کی ساسوں کو کونے بٹھا دیا ہے اور ان کی سرتاج دلہن نے ساری مجلس کی دولہنیں چکاچوند کر دی ہیں اور آج کے جلسے پر تو دونوں ساس بہوئیں چھا کر رہ گئی ہیں اور سب محفل میں ساسوں اور بہوؤں کی چھوٹی بڑی چل رہی ہے، آج بڑے زور سے، اور بس دلوں ہی دلوں میں کھچڑی سی پک رہی ہے۔ صبح سے گلشن سات رنگ کے بال بنا چکی ہے۔ صبح صبح جوڑا تھا اور وہ تو بال ماشاءاللہ اتنے لمبے ہیں کہ اماں جان نظر لگ جانے کے ڈر سے جوڑا بندھوا کے مجلسوں میں نکالتی ہیں مگر پھر تو صاحب گلشن نے بڑی بی کی ایک نہ مانی جب سات ڈیوڑھی والی دونوں دولہنیں انگریزی وضع کے بال بنا کر نکلیں اس نے بھی وہ وہ کرتب دکھائے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ صبح میں نے کہا نہیں جوڑا تھا، پھر چوٹی اور آڑھی مانگ، پھر پلٹیں دو مانگوں والی، اور نہ معلوم کیسے کیسے وہ تو بھانت بھانت کا کام جانتی ہے، انگریزی، ہندستانی سب طرح کا۔ اب اس وقت جو اس نے دلہن نکالی ہے تو بس ساری محفل پانی پانی ہو کر سر ڈھکنے لگی۔ دائیں بائیں دو چوٹیاں اور بیچ میں آگے سے پیچھے تک مانگ کھلی ہوئی ماشاءاللہ بال تو اتنے لمبے نظام آباد بھر میں کسی کے ہیں ہی نہیں بس دونوں چوٹیوں کو دولہن نے دو دو لپیٹ گردن میں دئے ہیں مگر پھر بھی چوٹیاں ہیں کہ فرش پر لہرا رہی ہیں اور نیلی ساڑھی اور نیلم کے سیٹ میں دولہن ایسی معلوم ہو رہی ہے کہ جیسے آسمان سے نیلم پری اتر آئی ہے۔ ۔ ۔ ۔"

بہن تقاضائے نسائیت میں اپنی عادت کے مطابق بیان کر رہی تھی اور شوکت چپ چاپ بیٹھا سُن رہا تھا اور نگاہوں کے سامنے جیسے اس کی گفتگو کے ساتھ ساتھ میجک لینٹرن کی سی رنگین اور رنگین تر، جدید اور جدید تر پلٹیں آتی چلی جا رہی تھیں اور اخیر جوڑے کی تفصیل پر ایک بنفشی، آسمانی سا منظر آنکھوں میں بسا سا رہ گیا۔ بس جیسے تو سح قزح مکمل ہو گئی۔ اس کا سفینہ تا حدِ نظر ہفت رنگین سمندر کی رومانی موجوں پر سُبک رفتاری کے ساتھ بہنے لگا۔ اس نے اپنی بہن کی گفتگو پر ایک اطمینان کا سانس لیا اور کچھ ایسے انداز سے اس کی جانب دیکھا کہ جیسے وہ "دیکھیں گے صاحب ہم بھی ذرا آج آپ کی سرتاج دلہن کو کہ کیسی ہیں"۔ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا اور پھر ایک گھونٹ سا لے کر اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر مزاحیہ انداز میں کہا "اوہو! ماشاءاللہ دو چوٹیاں ادھر اُدھر! اور بیچ میں مانگ!! ع حدِ فاصل ناگنوں میں کن کھجورا ہو گیا!"۔ بھئی اللہ بچائے!۔ یوں کہیے کہ گرگٹ کے سے رنگ بدل رہی ہیں آپ کی سرتاج

دلہن آج "۔

" دیکھو میاں تم ایسی باتیں مت کیا کرو۔ ذری اگر کوئی لفظ اماں جان کے کان میں پڑ گیا تو قیامت ہو جائے گی بس ــــ سب ناگن اور کن کھجورا نکال ہی تو دیں گی ـــ ہاں بھیا اس وقت کیوں بلایا تھا ـــ ذرا ذرا دیر میں ممانی جان پکارتی ہیں ـــ واں ـــ ہوں ـــ کیوں ؟ " شہاب النسا نے جیسے کچھ اکھڑتے ہوئے کہا اور ادھر ادھر دیکھا۔

" کچھ نہیں یونہی ذرا ـــ اکیلے میں ـــ وہ ـــ آں ـــ چار رکھی ہے میں نے کہا بلا کر شریک کر لوں، آپ کو بھی ذرا "۔

" ہوں " شہاب النسا چاء کی جانب متوجہ ہوئیں اور نہایت نفاست سے ایک پیالی بڑھائی۔ شوکت نے کرسی کھسکائی اور پیالی ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا " اور باجی ذرا ماموں میاں کا ناشتہ تو دیکھو، یعنی دو نوں ٹرے بھری ہوئی ہیں۔ بھنے ہوئے پتلے تلے انڈے، پراٹھے، کیلے، چینی "، توبہ! بھئی ہندستانی معدوں کے حاضر ہونے کی بھی داد دیتا ہوں ـــ اب خان صاحبان اور خانم صاحبانیں سب کے سب اس وقت ڈٹ کر یہ ناشتہ کریں گے اور رات کو نو بجے بریانی مزعفر قورمہ شیرمال پر ہاتھ صاف کریں گے، بھئی میں تو بھر پایا میں نے تو صبح بھی کوئی چیز نہیں چھوئی تھی، مجھے تو بس ایک پیالی خالی چاء دیدیجئے آپ "۔

" نہیں معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے ناشتے کو ماموں آتے جاتے خود دیکھتے ہیں، یہ دیکھو نا دوسری کشتی، اس میں فروٹ کریم، پیسٹری سینڈ ز و چیز اور یہ ڈھیر سے انگور اور سیب لگے ہوتے ہیں "۔

" اچھا فروٹ کریم! " شوکت ذرا سنبھلا اور اچک کر دوسری کشتی پر نظر کی، ٹھیک کہتی ہیں آپ ضرور انھوں نے صبح کی چاء کی کشتی واپسی میں خود دیکھی اور یہ دوپہر میں ویلیریو کے ہاں سے تمام سامان منگایا۔ کار بھیجی ہوگی لکھنو اور آپا دراصل یہ آپ کی بریانی مزعفر اور قورمہ شیرمال تو خیر میں آدھے پونے پیٹ کھا بھی لوں بھوک میں مگر بھئی یہ آپ لوگوں کا ہندوستانی ناشتہ مجھ سے نہیں اترتا۔ شاباش ہے صاحب پٹھانوں کے پیٹ کو، پتھر ہضم کر جاتے ہیں پتھر! اور باجی تم نے یہ بھی غور کیا کہ دونوں کشتیوں میں انگریزی اور ہندستانی سامان کتنا ہے!۔ پوری ایک گارڈن پارٹی کے قابل "۔

" جی ابھی تو اور پوچھے گا ملازم کہ سرکار کچھ اور؟ "

"جی تو مجھے تو بس ایک۔ فروٹ کریم اور ایک پیالی چار ہی دے دیجئے آپ، میں تو آج کھانا جلدی کھاؤں گا بس بعد مغرب کھا کر گھر جاؤں گا۔ اور چھوٹی حویلی کی صحن چی میں بستر جماؤں گا سکون کے ساتھ۔"

"ایسی بھی کیا نیند بھلا — وہاں کون ہے — اتنے بڑے لق دق مکان میں کیا کرو۔ گے جا کر تنہا۔ کوئی ملازم نوکرنی بھی تو نہیں سوا دربان اور چوکیداروں کے۔"

"وہ کوئی بات نہیں ہے، تم ذرا اپنی بھابی جان کو میرے ساتھ موٹر میں بٹھا دینا سمجھیں۔"

"ایں! ہاں! خیر سرتاج دلہن کو — مگر امی جان! — خیر میں کہدوں گی — ان سے۔"

"ہوں — نہیں آپ کہہ دیں ان سے کہ لمبے سفر کے مارے ہوئے ہیں وہاں سکون کے ساتھ آرام کریں گے۔"

"ہاں خیر مگر تم جانتے ہو کہ اماں جان کس قدر وہمی مزاج واقع ہوئی ہیں۔"

"مگر کوئی بات نہیں اگر کچھ پس وپیش کریں تو تم کہہ دینا کہ وہ اکیلے کیسے رہیں گے — مان جائیں گی۔"

"ہوں خیر — اگر پس وپیش کیا تو وہ میرے باپ کی بھی نہ مانیں گی — دیکھو!"

"نہیں میری سرکار باجی آپ خوب ہی کہیں پھر تو — میرے سر کی قسم آپ کو — جیسے ہو ساتھ کر دیں۔"

"میں کہتی تو ہوں، مگر اس لیے ذرا کہتی تھی کہ آج کل وہ سرتاج دلہن پر سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے اپنی آنکھیں لگائے ہوئے ہیں ذرا دیر نہ مانیں۔"

"نہیں نہیں میری سرکار باجی" ٹھوڑی چھو کر "میری بجیا — تو پھر آپ جائیں اب۔"

شہاب النسا نے جلدی جلدی ناشتہ ختم کیا اور نیچے پہنچیں — ماں اور بھاوج اپنے کمرے میں تھیں۔ مالن اور مشاطہ سنگھار کر کے باہر گئیں تھیں اور بڑی بی معائنہ فرما رہی تھیں۔

"کہاں تھیں — کیا بھیا کی طرف گئیں تھیں؟ دیکھو یہ جوڑا کیسا رہا دلہن کا۔ ایں؟"

"بہت اچھا۔ بہت اچھا۔ اللھم بارک علیہ — خدا نظر بد سے بچائے بڑا اچھا۔ ہاں بھیا کی طرف تھی ذرا — وہ تو آج شام کو محل سرا جانے کو کہتے تھے، کہہ رہے تھے کہ یہاں شور ہوتا

ہے۔ راستے کا تھکا تھکایا ہوں، چھوٹی حویلی میں جاکر سوؤں گا۔ یہاں نیند خراب ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے پھر۔ ذری ماموں سے بھی تذکرہ کردیں"۔ بڑی بی نے دلہن کے جھومر کی لڑیاں درست کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تو انھوں نے آج دوپہر ماموں میاں سے اجازت بھی لے لی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے بس۔"

"اور ہاں اماں سرتاج دلہن کو بھی ساتھ بھیج دوں۔"

"ایں! ؟ سرتاج دلہن کو۔ کہاں؟" بڑی بی نے چونک کر بیٹی کا منہ دیکھ کر کہا۔

"وہیں ذرا۔ بھیا کے ساتھ۔ آخر اتنی بڑی حویلی میں اکیلے کیسے پھر؟"

"اکیلے رہتے کیسے!۔ جیسے رہتے ہیں۔"

"نہیں میں نے کہا۔"

بڑی بی نے پھر بیٹی کا بشرہ اپنی جہاں دیدہ آنکھوں سے بھانپا متواتر پان چباتا ہوا۔ منھ ٹھہر گیا دو مرتبہ باچھوں پر سے بہتی ہوئی پیک پونچھی اور ذرا خشک انداز میں بولیں۔

"آخر ضرورت۔"

"نہیں میں اکیلے کی وجہ سے کہہ رہی ہوں۔"

"اکیلے کاہیکے ہیں۔ دروازے پر دربان ہے دو چوکیدار اوپر دو نیچے کیا سرتاج دلہن کی رکھوالی کرے گی ساتھ جاکر نا بی بی معاف رکھو۔"

"تو آخر اس میں حرج بھی کونسا ہے بڑا بھاری۔ بھیا کہہ بھی رہے تھے خود۔"

بس جیسے بڑی بی لال تال ہوگئیں دونوں باچھوں سے پیک بہہ کر کرتے کی کنٹھی تک پہنچ گئی "سڑوپ" کر کے بولیں "چل کٹنی مکارہ آئی وہاں... سے مجھے چلاتی کتنا پا کرتی" (یہ بہت سی گالیاں منہ سے نکل پڑیں۔ آیا بڑا وہ بن کے بیچ۔ منہ دھو آیا ہے تیرا بھیا، ایسے جیسے کتنے فرنگی جوتی پہ مارتی ہے میری سرتاج دلہن۔"

شہاب النساء بھیا سے پختہ وعدہ کر کے اور دلہن کو ساتھ بھیجنے کا بیڑا اٹھا کر اور اس مہم کا سہرا اپنے سر سمجھ کر آئی تھیں اور یہاں منہ کی کھانی پڑی تو اب دوسرا تھیار سنبھالا آنکھوں میں آنسو بھر کر۔

بسورتی آواز میں بولیں " نہیں میری اماں جان — اچھی اماں — تو اس میں کیا بات ہے اور پھر وہ جب کے گئے گئے تو اب آئے ہیں"۔

" تو اے ہے بی بی میں کیا کروں اب آئے ہیں تو — خیر سے مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے اب اور اللہ نہ کرے جو پڑے آگے چل کر — وہ صاحب بہادر جائیں اور ان کی میم صاحب — بندی کو اللہ نے کیا اس وقت ان سے کام اٹکا نہیں ہے"۔

" پھر وہ بے چارے کچھ کہہ بھی رہے ہیں — بلکہ میں کہتی تھی اکیلے کے مارے"۔

" چل چل آئی وہاں سے دلار کرتی باتیں — چل لبی ہو — تجھ سی لونڈیاں اور تیرے بھیا جانی سے لونڈے نہ معلوم کتنے میری انگلیوں میں پڑے ہیں"۔

" اوں ہوں اونہہ — اوں ہوں اونہہ — اچھی اماں — میری امی جان — تو پھر آپ کیوں ملول کرتی ہیں بھیا جانی کو — اتنے دنوں بعد تو وہ بے چارے " شہاب النساء نے بچیوں کی طرح ٹھنک کر کہا —

" نابُوا — مجھے سبق مت پڑھاؤ میں نے یہ چونڈا دھوپ میں سپید نہیں کیا ہے — میری ہزار برس کی گدی شونی ہے — میں لڑکے ، لڑکی کو ساتویں مہینے جمع نہ ہونے دوں گی ۔ اور بھلا مفت میں آگ پھونس — تم اپنے صاحب بہادر بھیا کو سمجھا دینا ۔ لندھن کی باتیں اور ہیں اور میری اور — وہ اپنی مہربانی اٹھا رکھیں — ماموں کے یہاں آئے ہیں میں تو بلانے گئی نہیں تھی — چپ چاپ آنکھیں بند کیے ذرا نچلے نچلے بالاخانے پر ہی پڑے رہیں اور رخصت کرا کر چنپت ہوں اسی راستے ، ادھر رُخ نہ کریں کسی کی دلہن انھیں ساتویں مہینے نہیں رکھی ہے ، سمجھیں بی بی ۔ ذری کرم ہی رکھو دونوں بہن بھائی ڈھچبہ پر"۔

شہاب النساء کچھ مرعوب اور کھسیانی سی ہو گئیں ، سرتاج دلہن کبھی احساسِ تفاخر میں سمندر کی موجوں کی طرح چڑھتی اور کبھی شرم سے پانی پانی ہو کر سکڑتی رہیں شہاب النساء چند لمحہ ملتجی نظروں سے ماں کی جانب دیکھ کر اور پھر چڑ ہندی سی ہو کر کڑے کمان کے تیر کی طرح کمرے سے بڑبڑاتی نکلیں ۔

" تو پھر میں اس بے چارے کے پاس بھی جا کر کیا کروں — کل سے پڑا ہے اکیلا ، نہ بات کا نہ چیت کا — مکھی سی مار رہا ہے ۔ واں ۔ اوپر"

بڑی بی نے بیٹی کا یہ انداز دیکھ کر طنزیہ گردن ہلائی اور انگلیاں چلائیں اور دلہن کی جانب دیکھ کر مخصوص انداز میں بولیں۔

"اے ہے زور تو دیکھو صاحب زادی صاحب زادے کا۔کچھ لوٹ پڑی ہے!۔ اے واہ! لڑکے بیٹو!! تمہارے زور!!!۔ واہ بہنا واہ یہ اچھی نگوڑی زبردستی ہے۔ لڑکے بٹیا کی۔ اکسی کا مال مارو! گھر لوٹو! ایسے تو! واہ ری واہ!"

کٹی ہوئی پتنگ کی طرح سیدھی ترچھی غصّہ و رنج میں بھری لال بھبو کا بنی شہاب النسا ماں کے الفاظ سنتی لاچارسی ہو کر شکست اور لاچاری کے جذبات میں بل سے کھاتی ایک سرّاٹے میں وسیع صحن پار کر گئی اور دور سامنے والی سہ دری میں اخیر حد پر جا کر رُکی جہاں حجامنیاں اور نوکرانیاں برتن درست کر رہی تھیں۔

۴

حُسنِ اتفاق

ماموں کے یہاں سے آئے ہوئے آج شوکت کو سوا دو مہینے ہو چکے تھے اور یہ نو ہفتے کی متمدّن جنت کی زندگی نہ معلوم ایسے کتنے شادی کے ہنگامے، ایسی کتنی ماں باپ بہن اور ماموں کے مشفقانہ انداز اور نہ معلوم کار سے اترتی ہوئی شائستہ کے ایسے کتنے حسین و رعنا خدوخال اور ناز و انداز شوکت کے ذہن سے حرفِ غلط کی طرح مٹانے کو کافی تھے۔ وہ تین چار دن کی مشرقی پر ورہنگامہ جاگیردارانہ سوسائٹی کے، مشرقی بے پناہ حسن و رعنائی کے ردِعمل میں اپنی جائے قیام پر پہنچکر اپنے نصب کردہ جدید تمدّن کے باغِ ارم میں گم ہو کر رہ گیا اور ایسا محو ہوا کہ اس نے کبھی پیچھے مڑکر بھی نہ دیکھا۔ دو تین گھنٹے دفتر میں کچھ نگرانی، کچھ دستخطوں کے سوا اس کا سارا وقت اپنا تھا۔ اس پر ہمہ وقت کچھ عجیب قسم کی ابدیت بردوش مسرت طاری رہی۔ بھلا ایسی فردوسی زندگی میں پیچھے مڑ کر تو درکنار کنکھیوں سے ادھر اُدھر دیکھنے کی بھی فرصت کس مسخرے کو تھی ایک صبح وہ اپنے بنگلہ کے دفتر میں بیٹھا ہوا کچھ سرکاری

کاغذات پر دستخط کر رہا تھا کہ یک دم چپراسی نے ایک کشتی میں تار کا مخصوص رنگین لفافہ پیش کیا۔ "ایں! مبارک باد کا تار؟ اس نے دل میں سوچا بھلا کہاں سے آج ... بے وقت!" اس نے خیال کرتے ہوئے لفافہ چاک کیا۔ چونکا۔ مُسکرایا۔ خوب! دولہ بھائی نے لڑکے کی پیدائش کی مبارک باد مجھے دی۔ ہے" وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔ پھر اماں جان تو وہیں تھیں بھلا۔ انھیں یہاں تک تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟۔ خیر" بڑبڑاتے ہوئے گاؤ آمد و خررفت والی نگاہ غلط انداز دوسری مرتبہ عبارت پر ڈالی۔ اور اس کے تصور میں شجرِ آدمیت کا اکھوا آگیا۔ گھنونا، گھنونا۔ سُنڈ مُنڈ۔ لال لال گوشت کا پٹرا۔ ایک بغیر بالوں اور بلا بھوؤں والا سر سے پاؤں تک یکساں۔ متحرک سونٹرا۔ بغیر خراد رکھا ہوا۔ ڈولا ڈولایا سا آدمی کا ماڈل۔ جیسے کوئی کٹھ بگڑا بڑھئی بے دلی سے کسی باندھوں کی کباڑ و چارپائی کا ایک نیا پایہ ڈول دے۔ لیجیے لڑکا ہوا!۔ جس کے لیے پہاڑ کے پتھر ڈھوئے گئے!۔ زندگیاں خراب کی گئیں!۔ چلو بڑی بی تو آج نہال ہوئیں۔ اور نوزائیدہ بچے کی شکل کے تصور سے جیسے اس کے پیٹ میں سے متلی کی ایک لہر سی اٹھی۔ اس نے تار ویسا ہی کھلے کا کھلا ہاتھ میں لیا اور ردّی کی ٹوکری کی طرف دیکھا پھر کچھ ٹھٹکا۔ اور سوچ کر وسیع میز پر ادھر اُدھر دیکھا اور سامنے رکھا ہوا لمبا چوڑا جاذب کا بورڈ اٹھایا اور اس کے نیچے دیسے کا ویسا ہی کھلا رکھ کر بورڈ جیسے کا تیسا لگا دیا اور کاغذات دیکھنے اور دستخط کرنے میں بدستور مشغول ہوگیا۔

جدید روشنی کا دلدادہ شوکت، ماضی، حال اور مستقبل کے پیمانوں سے مستغنیٰ اپنی متمدن سوسائٹی کی رنگینیوں میں اپنی مغربی بیوی کے ساتھ کھویا رہا اور تین سال میں ایک مرتبہ بھی کبھی بھولے سے اس کا خیال دقیانوسی، دیہاتی مشرق زدہ دنیا کی جانب نہ گیا۔

ایک لمبی سڑک کے معائنہ کے سلسلے میں جس کی جدید تعمیر انھیں تین سال میں مکمل ہوئی تھی اسے بڑا لمبا دورہ کرنا تھا اور منظوری دینا تھی۔ وہ کار پر روانہ ہوا اور سڑک اور پُلوں کا معائنہ کرتا ہفتہ بھر سفر کرنے کے بعد اس کی کار شمالی ہند میں پہنچ گئی۔

سہ پہر کا وقت تھا وہ ایک خاص مقام سے گذرا جہاں ایک اور پرانی سڑک آکر ملتی تھی چوراہے پر پہنچکر غیر شعوری طور پر اس کی نگاہ کھمبے پر پڑی اور وہ

To NizAm Abad

50 miles پڑھ کر چونک سا پڑا جیسے اس کھمبے کے ہتھے نے اسے اشارہ سا کیا۔ اس کے خون میں سر سے پاؤں تک ایک عجیب پُر سرور سنسناہٹ، دل میں میٹھی میٹھی خلش، دماغ پر ایک پُر کیف نشہ، اور ہونٹوں پر ایک دلآویز مسکراہٹ سی کھیل گئی ۔۔ کیا عجیب پُر ہیجان لفظ تھے "TO NIZAMABAD" "About 50 miles" جنھوں نے اسے وارفتہ سا بنا دیا، اس۔۔ کے تحت الشعور میں ایک نامعلوم سی خواہش اس کی روح میں ایک ناقابلِ تفصیل سا جذبہ بیدار ہو گیا۔

وہ ذرا سنبھلا اور جوں ہی موٹر۔ سے اس کی ایک نظر آوارہ ہو کر ماحول پر پڑی، دل میں ایک ہوک سی اٹھی، جس کا بار آنکھوں نے سر آنکھوں پر لیا اور جیسے دھویں۔ سے پُر نم ہو کر گلابی کٹورے چھلک سے پڑے بس۔۔ بے اختیار زبان۔ سے نکلا " ٹھہرو۔۔ ڈرائیور۔ ادھر چلو" اور ایک پتلی سڑک کی جانب انگلی اٹھی۔ جس پر جگہ جگہ گھاس جمی ہوئی اس کی منزل مقصود کی غیر متمدن ہونے کی غمازی کر رہی تھی ۔۔ "ٹھہرو" کے لفظ پر ڈرائیور کا ہاتھ فطری طور پر بریک پر گیا، پھر مڑ کر سڑک کی جانب دیکھا۔

" ایں کدھر؟ " ڈرائیور کے برابر بیٹھے ہوئے اوورسیر نے کہا ۔۔ " ڈسٹرکٹ بورڈ روڈ ہے ہم سے بے تعلق "۔

" ہاں مگر آج واں قیام کریں گے نظام آباد "۔

" مگر حضور وہ تو چھوٹا سا قصبہ ہے ۔۔ جاگیرداروں کی بستی ۔۔ ڈاک بنگلہ بھی نہیں "۔

" اور ہمارا اپنا ڈاک بنگلہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی روڈ پر دسویں میل میں ہے "۔ شوکت کے برابر بیٹھے ہوئے اینگلو انڈین ماتحت انجینئر نے کہا۔

شوکت مسکرایا ۔۔ ڈرائیور نے آہستہ سے اوورسیر کے کہنی ماری اور کچھ زیر لب کہا اور پھر بولا " حضور سمجھ گیا میں " اور کار بیک کرنے لگا۔

آناً فاناً میں شوکت کی کار اس شاہراہ پر دوڑنے لگی جہاں اس کی عنفوانِ شباب کی صبح نکلی تھی، جس کی آزاد اور بے لگام فضا نے انیس سال اپنی گرمی اور روشنی سے اس کے وجود کی پرورش کی تھی اُس کی وسعتوں میں اس کے ہنگامے، جس کی خلاؤں میں اس کے نغمے آج بھی ایک خاموش گونج، گونج رہے تھے جس کے چپہ چپہ اور ذرہ ذرہ پر اس کی مہریں دمکتی تھیں۔ وہ مخصوص آنکھوں میں کھبی ہوئی سیرگاہیں، وہ قدموں میں نپی ہوئی شکارگاہیں، وہ دل میں بسی ہوئی فضائیں اس کے موٹر کے ساتھ ساتھ

گذر رہی تھیں بے اختیار ادھر اُدھر دیکھ کر اس کا جی چاہتا کہ بس دیکھتا ہی رہوں جیسے ایک ہلکی شراب کا چھوٹا سا گھونٹ پیارا پیارا ہلکا ہلکا سرور رفتہ رفتہ اس پر ہر نظر کے ساتھ طاری کر رہا تھا جیسے آج ساری عمر کے رومان اس کے تحت الشعور میں آہستہ آہستہ بیدار ہو رہے ہیں ایک نامعلوم سی تلاش، ایک بے تفصیل خواہش اس کی آنکھوں اور دل میں پیدا ہو رہی ہے جیسے ایک سرور کے عالم میں اسے پتہ بھی نہ چلا کہ پچاس میل کا فاصلہ اس کی کار طے کر گئی۔ اس نے دور سے نیلے آسمان میں گھسے ہوئے مینارے دیکھے اور پھر اسے بڑی اونچی محراب دار چار دیواری فصیل دکھائی دی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب اُنسیت والتفات، اس کے تیوروں میں انوکھا خلوص اور زیادہ پیدا ہو گیا، اگرچہ گو اس کو اپنے موٹر کے پہیوں میں کچھ عجیب بیگانہ وار اجنبی سی گردش معلوم ہو رہی تھی قصبہ کے چھوٹے بازار میں سے گزرا، جہاں اس کے اب وجد کا سکّہ اس کی کار سے زیادہ تیزی سے چل رہا تھا۔ دکان دار اس کی کار کو دیکھ کر دکانوں سے اتر اتر کر، راہ گیر ٹھہر ٹھہر کر جھک رہے تھے اور آناً فاناً میں اس کی کار اپنے بلند پھاٹک پر جا کر ٹھہر گئی۔ ڈھیلی ڈھالی سبز و سرخ و سنہری وردی والے مُسن دربان نے آگے بیٹھے ہوئے ڈرائیور اور اوورسیر کو کچھ متعجب نگاہوں سے دیکھا۔ پھر دوڑ کر کار تک آیا۔ اور یک دم شوکت کو دیکھ کر جھک کر "میاں سلام" کہا اور جیسے فرطِ مسرّت سے اس کا جھری دار چہرہ چمک اٹھا۔ اور پھاٹک کھولنے کو دوڑا اور دوڑتے ہی دوڑتے چلایا۔

"ارے میاں! — چھوٹے میاں!! — چھوٹے میاں آگئے!!!"

"چھوٹے میاں، چھوٹے میاں" جیسے کار پھاٹک میں گھستے ہی تمام فضا گونج اٹھی اندر وسیع صحن میں ملازموں کا پورا غول ادھر سے اُدھر دوڑا۔

"میاں۔ میاں"۔ سامنے سے دفتر کی کوٹھری میں سے بوڑھا مختارِ عام ننگے پاؤں ایک ہاتھ سے ٹوپی پہنتا دوسرے سے گلے کا بٹن لگاتا چوکی پر پڑے ہوئے پھٹے پر سے اٹھ کر کار کی جانب لپکا۔ شوکت کا اینگلو انڈین ماتحت انجینئر، اوورسیر اور چپراسی تعجب سے اسے دیکھ رہے تھے "ہمارے صاحب بہادر، میاں بھی ہیں!" اور شوکت بے چارہ میاں، میاں سُن کر سوچ رہا تھا" اور بڑی حویلی میں ایک بی بی بھی ہیں — اور جو ہر میاں کا جزوِ لاینفک ہوتی ہیں"۔ شوکت اپنے ماتحت مہمانوں کو مختارِ عام کے حوالے کر کے پھرتی سے مردانے مکان کا

وسیع صحن پار کر گیا اور عقبی صحن میں ہوتا ہوا ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ جوں ہی دوسرا قدم ڈیوڑھی کے اندر ڈالا گھونگٹ کی آڑ سے ایک انا باہر آتی سامنے آگئی۔ بڑا خوب صورت اور تندرست سچ مچ چینی کا گڈا سا سرخ سپید گداز بچہ گود میں لیے کامدار سنہری ٹوپی اور رنگ برنگا چکن کا کرتا اور لٹھے کا آڑا پائجامہ پہنے سولہ آنے پٹھان ماڈل ۔۔ جیسے ہی پہلی نظر بچے کے چہرے پر پڑی، شوکت کے دل میں اس کے خدوخال پڑھ کر گویا ایک دبی چنگاری چمک اٹھی ۔۔ بچے نے بھی بس دیکھتے ہی کل کاری ماری اور انا کی گود سے سیدھا شوکت پر جھک گیا گویا وہ ان کا منتظر ہی تھا یا جیسے اسے علم ہی تھا کہ ڈیوڑھی کے گھونگٹ کی آڑ سے آ رہے ہیں۔ اور ایک دم انا کی گود سے شوکت کی گود میں دکھائی دیا اور پہنچتے ہی کچھ اپنی پشتو میں گل بل کر کے کرسٹل شیپ عینک پر ہاتھ صاف کیا۔ شوکت نے عینک سنبھالتے ہوئے انا سے پوچھا۔

”ایں، یہ کس کا بچہ ہے؟“

نئی انا تھی کچھ شرماسی گئی اور مسکرا کر رہ گئی۔

ڈیوڑھی کے اخیر اندر والی چوکھٹ کے قریب پہنچ کر پھر شوکت نے انا سے کہا۔

”ایں انا! یہ کس کا بچہ ہے ؟“

اور صحن میں سے آواز آئی۔ ”یہ میرا بچہ ہے“۔

”جبھی تو تمہاری شکل ہے“۔

اور سامنے شہاب النساء کھڑی مسکرا کر بھائی کا استقبال کر رہی تھیں۔ بہن بھائیوں کی نگاہیں چار ہوتے ہی طرفین سے قہقہہ بلند ہوا۔

حویلی کے اندر ایک بھاگڑ مچ گئی۔ بڑی بی اپنے چپر کھٹ سے بغیر ہی ڈوپٹے کے اٹھ کر چل دیں۔

شہاب النساء نے کہا۔ ”ہوتا کس کا بچہ۔ میرا بچہ“۔

”جبھی تمہاری شکل ہے“۔

پھر دونوں بہن بھائیوں نے قہقہہ لگایا اور بچے نے شوکت کے بال بگاڑ دیے۔

شوکت نے کہا۔ ”نہیں نہیں یہ نہ میری شکل ہے، نہ آپ کی یہ اپنی شکل ہے۔ ایں باجی!“

شہاب النسا نے مسکرا کر جواب دیا ”اچھا پہچانو۔ یاد کرو“۔

شوکت کا خیال تو کچھ کچھ اب سے تین سال پیشتر مبارک باد کے تار پڑھنے کے بعد والے گھناؤنے تصور کی جانب گیا " مگر یہ! یہ تو اچھا خاصا چینی کا کھلونا ہے اور بلا کا چنچل — اور باجی بھی ہر سال ایک آدھ بچے کے سر ہو رہتی ہیں" اس نے غور کیا۔ اور نیچے سے اوپر تک چھپکلی کی طرح چمٹے ہوئے بچے کے چہرے کو کندھے سے اٹھا کر سامنے کیا اور آنکھیں چار ہوتے ہی بچے نے ایک قہقہہ لگا کر شوکت کے دونوں رخسار اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں دبا کر اپنا رخسار اس کے ہونٹوں پر رکھا اور شوکت نے کہا۔

" اچھا باجی ہم بتائیں! — ہم بتائیں! — یہ بچہ! — نہ تمہارا ہے اور نہ ہمارا — یہ — یہ اپنی ماں کا ہے — ایں — ہے نا؟" اور دونوں بہن بھائیوں نے مسرت سے قہقہہ لگایا اور بچے نے بھی ساتھ میں قہقہہ میں قہقہہ ملایا۔ شوکت نے ہنستے ہوئے کہا" اور یہ تو دیکھو مانوس کس قدر ہیں جیسے منتظر ہی بیٹھے تھے ایسے تو میرے اوپر ٹوٹ پڑے واں ڈیوڑھی میں۔"

" جی ہاں جیسے پرانے ملاقاتی ہیں نہ معلوم کب کے کلاس فیلو" شہاب النسا نے کہا۔

" اجی دروازے میں میری گود میں پہنچتے ہی تو عینک پر ہاتھ صاف کیا وہ تو جیسے ہی بندر کا سا پنجہ حضرت نے چلایا میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور بس پکڑ ہی لیا بڑی مشکل سے بچائی۔"

" اہا ہا ذرا دیکھو تو۔ ذرا دیکھو تو۔"

بڑی بی دعائیں دیتی دور سے بلائیں لیتی ہنستی کھلتی آئیں اور بولیں۔" اے ہے لو۔ تو کیا تم دونوں نظر مارو گے میرے بچے کو، نہ بی بی تمہارا اور نہ میاں تمہارا، ہمارا بچہ ہے۔"

اور دادی کی آواز سنتے ہی بچے نے باپ کی گود سے بندر کی سی ایک جست لگائی اور دادی کی گود میں دکھائی دیا۔ اور ہنس کر اشارے کرنے لگا۔

" ہاں بھیا۔ ابا۔ تیرے ابا جان۔ میرے میاں۔ تیرے ابا جان۔"

اور بچہ اپنی پشتو میں نہ معلوم کیا کیا کہہ گیا اور شوکت سوائے " ابا جان" کے لفظ کے کچھ نہ سمجھ سکا مگر دادی پھوپھی سب کچھ سمجھ گئیں اور بڑی بی بولیں۔

" یہ عینک، اب یہ عینک دو میرے بچے کو۔"

" ارے اماں عینک! بھلا میری عینک!!"

"نہیں تمہیں دینی پڑے گی جب وہ مانگ رہا ہے۔ پھر کیوں نہیں گھسے گھر میں کوئی کھلونا لے کر اس کے لیے۔"

"ارے اماں میں راستے سے چلا آیا ہوں ادھر اتفاقیہ۔ اور اگر قصد کر کے چلتا تو بھی مجھے ان حضرت کا کھلونا بھلا کیا یاد آتا، اور نہ مجھے ان میاں کا خیال ہی تھا۔"

"ہاں جی تمہیں کیوں یاد آتا۔ اور تم سب کو یاد آؤ۔ اہں!!"

تمام محلسرا میں اندر سے باہر تک کی خلافِ امید آمد پر ایک ہنگامہ سا مچ گیا کوئی پرزہ اپنی جگہ پر نہ رہا، بڑے سرکار علاقہ پر تھے ان کے لیے فوراً سوار دوڑا۔

وسیع حویلی کے صحن، دالانوں در دالانوں اور صحنچیوں میں چاروں طرف میاں شوکت نظر کی کمندیں پھینک رہے تھے جیسے کسی چیز کی تلاش میں ہیں اور اگر ان کی والدہ موجود نہ ہوتیں تو شاید وہ اپنی بہن سے استفسار بھی کر چکے ہوتے۔ مگر انھوں نے چند لونڈیوں کے مشاغل اور گفتگو سے اندازہ کر لیا کہ ان کا مطلوب غسل خانہ میں ہے۔

اور کافی دیر انتظار کے بعد انھوں نے غسل خانے کا دروازہ کھلتے دیکھا، اور سرتاج دلہن نکھری نکھرائی برآمد ہوئیں۔ یہ مٹھارے اور وہ مسکراتی ہوئی سیدھی شیشہ خانہ میں چلی گئیں دائیں بائیں آگے پیچھے غسل کے بعد سپید کپڑوں میں شوکت نے اپنی دلہن کو اچھی طرح پرکھا اور اس قدر سادہ انداز میں دیکھ کر ع

"اب اور جان لیں گے انداز سادگی سے"

دل میں کہہ کر رہ گیا۔ اور اب سے تین سال پہلے کی زربفت اور کمخواب میں ملبوس شائستہ کا اس وقت نہانے کے بعد تولیہ کے لباس میں لپٹی ہوئی شائستہ سے موازنہ کیا تو بس اس کا فرادابتِ سیمیں کی جانب نظری پیمائش یہ اندازہ کر کے رہ گیا۔

ع تل بڑھے، ابرو بڑھے، کاکل بڑھے گیسو بڑھے

"اللہ نظر بد سے بچائے بڑی بی کی سرتاج دلہن کو خیر سے دن دونی رات چوگنی چل رہی ہیں۔" شوکت نے آہستہ سے بہن سے مخاطب ہو کر کہا اور اندر جاتی ہوئی شائستہ کی جانب آنکھ سے اشارہ کیا۔ اور پھر ماں کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ "کیا اب بھی کرفیو آرڈر لگے گا؟"

شہاب النساء نے ایک قہقہہ لگایا، شوکت نے ساتھ دیا پھر بولیں۔ "نہیں اب کچھ بھی نہیں، اب کیا

رکھا ہے بھلا۔"

شوکت نے پھر آہستہ سے کہا۔" معلوم ہوتا ہے خوش دامن صاحبہ نے دماغ کا بالکل ہی ستیاناس مار دیا۔۔۔ ایں باجی۔۔۔؟ اس وقت تو صاحب نظر نہیں ملائی ترچھی ترچھی صاف گئیں۔"

" وہ کچھ نہیں۔۔۔ سب ٹھیک۔۔۔ ہو جائے گا۔" شہاب النسا نے زیر لب کہا۔

شب عروسی کے بعد چوتھی والی دلہن کی خلوت شوکت کو بارہ گھنٹے کے بجائے تین سال بعد میسر ہوئی اور شب عروسی کا بچھڑا دولہا نہ معلوم کتنی صبحوں اور شاموں کا بھولا اپنی ایک رات کی دولہن کو پورے تین سال بعد ملا اور حجاب نو عروساں جہاں کا تہاں پایا اور ؏

اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند

کا مقولہ بالکل غلط پایا۔

شائستہ بے چاری مرد سے بات کرنا ہی نہ جانتی تھی۔۔۔ اس نے وہ سبق جو ہر صنفِ نازک کے کان میں شباب پھونکتا ہے، فراموش کر دیا تھا وہ ناز و انداز اور غمزے کہاں سے لاتی البتہ اس کی ساس نے ملازماؤں اور پیش دستوں پر حکومت کرنے میں اور جاگیردارانہ سیاستوں میں اسے خوب طاق کر دیا تھا، مگر اس کی زندگی کا یہ باب جو اسے آج صنفِ غالب کے سامنے پڑھنا تھا بالکل کورا تھا لیکن اللہ نے صنفِ غالب کی آنکھ میں وہ بلا کا جادو دیا تھا جو اپنی ایک ادنیٰ سی شعاع کے انعکاس سے مٹی کے تودوں میں چمک اور حرکت پیدا کرتا ہے اور پھر شائستہ تو خدا کے فضل سے نوجوان تھی، ہزار دو ہزار میں ایک تھی۔ مشرقی مکتب کی تعلیم یافتہ تھی، اس نے پہلی نگاہ کی شعاعوں کا تبادلہ ہوتے ہی اپنی فطری صلاحیتوں کے زور سے پورا پورا کسب روشنی کر لیا اور کہا۔" آیئے، اتفاقی دولھا میاں۔"

شوکت سمجھ گیا کہ یہ میری گفتگو غسل خانہ سے سن رہی تھی کچھ سٹ پٹایا جواب بن نہ پڑا کہا۔

"اوہو! اتفاقی دولھا میاں!" آپ! پھر آپ اتفاقی دولہن بیگم ہوئیں ایں؟؟

"جی بالکل۔۔۔ مگر حسنِ اتفاق سے۔"

"جی بس چاہتا کرے کوئی لے کر حسنِ اتفاق اور اتفاقِ حسن کو۔۔۔ ٹریلولین کلارک کے شوروم کی ریشم میں بنی ہوئی اسٹیچو۔۔۔ وہ کیا بری ہے بھلا۔"

"ہر انسان اسٹیج ہے جو سر رشتۂ تقدیر کی حرکت پر رقص کرتا ہے"۔ شائستہ نے کہا۔

"خیر مگر اس پر انسانیت کا تہمت تو نہیں ہے ــــ اور اگر انسان ہو کر بھی انسان انسانیت سے دور ہو اور پھر سر رشتۂ تقدیر کی بندش کی آڑ پکڑ لے تو"۔ شوکت نے کہا۔

"اور جی انسان، انسان ہو کر بھی انسانیت کے مرتبے کو نہ پہچان سکے، اپنے ہم جنس کے جذبات کی پرکھ نہ رکھتا ہو، حسنِ حقیقی کی چمک دیکھنے سے قاصر ہو، وہی تمدن سے نابلد ہو اور پھر متمدن انسان ہونے کا دعویٰ اور عریانی، فحاشی، حیا سوزی کو تمدن و تہذیب جیسا پاک نام دے اور اپنے خود ساختہ تفوق کے نشۂ پندار میں اپنے جیسے انسان کو ٹریولین اینڈ کلارک کے شوروم کی کٹھ پتلی سے بھی ذلیل تر خیال کرے تو فی الواقعی اس کے نزدیک وہ بیچارہ ہم جنس انسان نہیں رہے گا"۔

شوکت نے کچھ جھینپ کر کہا۔ "مگر بعض کٹھ پتلیاں تو سر پر چڑھ کر ناچتی ہیں لہٰذا کٹھ پتلیوں سے دوری ہی اچھی"۔

"دور کہاں! ارے صاحب ناچنے والی کٹھ پتلیاں تو سر ہی چڑھی دیکھیں اور ساکت بے چاریاں کونے پڑی"۔

"اپنے داؤں پر خود ہی پٹتے ہوئے شوکت نے سنبھل کر جواب دیا "بیگم صاحبہ اب واقعی ناچنے، گانے، دیکھنے دکھانے ہی کا نام تمدن ہے"۔

"یوں کہیے کہ عریانی، فحاشی، حیا سوزی کا نام تمدن ہے اور حقیقی انسانیت اس تمدن سے عاری ہونے پر آج بھی فخر کرتی ہے اور اصلی تہذیب اس تمدن پر اب بھی سر پیٹتی اور دھاڑیں مارتی ہے۔ آپ کے تمدن کے پاس چشمِ باطن کا فقدان ہے۔ آپ کے تمدن کی یہی آنکھ کوڑھ کے داغ ڈھانکے ہوئے رنگین کپڑے کو دیکھ کر اپنے ہی ضمیر کو دھوکا دیتی ہے"۔

"بیگم صاحبہ آج کل ظاہر کا دور ہے، نقل کا عہد ہے، تم جیسے روشن ضمیر صوفیوں کا زمانہ لد گیا۔ کان کی تاریکی میں سونا مٹی ہے اور سورج کی روشنی میں ملمع سونا ہے"۔

"سونا ہر جگہ سونا ہے اور ملمع ہمیشہ جھوٹا ہے"۔

"مگر آج کل تو ملمع سونے سے زیادہ آب و تاب رکھتا ہے"۔

"جی اتھلی نظر والے تنگ ظرف و کم عیار نقادوں کے نزدیک ہی تو، جن کو مستقبل بھانڈا پھوڑ کر

ہمیشہ مُنہ کی کھلاتا ہے اور جن کو دائمی چمک والے سونے کے جھٹکے سنوتا ہے۔"

"ارے بھاڑ میں جھونکو ماضی اور مستقبل کو اور چولھے میں ڈالو ازل و ابد کو۔ بیگم حال، امروز، نقد امروز۔ احسن جیسے درشت یار اور مارو گولی فردا پر۔ اور تمہارے یہاں کی ایک مثل ہے۔ بھاڑ میں جائے سونا جس سے ٹوٹیں کان"

"دولت کا منتہٰ؟ مادی اور معنوی لحاظ سے نظر میں بڑا فرق ہے سرکار صاحب بہادر ایک مشرقی خاتون کو ذہن ایڈ بھی جوڑی بسترا، لاکھوں روپیہ، ہزاروں خادم، پھول سے بچے ذرا بھی احساس برتری نہیں دلا سکتے اسے صرف شوہر کی محبت اور ایک بوسیدہ جھونپڑا بس ہے اور وہ ہزار دو ہزار رانیوں کی رانی اور ملکہ ہے۔ آپ نے جو ذمہ داریاں اپنے سر رکھ لی ہیں اگر آپ چاہتے تو ان کے ہوتے ہوئے بھی اس حقیر ہستی کے تھوڑے سے حقوق سے کما حقہٗ سبکدوش ہو سکتے تھے بشرطیکہ اس کو ایوان ریاست کا صرف ایک ستون سمجھ کر ورطۂ فراموشی میں نہ ڈال دیتے۔"

"بیگم تم واقف نہیں شاید۔ اور تم مجھے معاف کرو گی کہ واقعات سے تم کو اس گھر کے اندر آنے کے بعد پار سال میں بھی آگاہی نہیں ہوئی، ورنہ کیا تم اس کی اہل تھیں کہ تم میری بیوی بنتیں؟"

بس شائستہ جیسے بلبلا کر جا پڑی، وہ ایک ملکہ والی شان سے تن کر بیٹھ گئی۔ "جی درحقیقت میں آپ کی بیوی بننے کی اہل نہیں تھی واقعی میں آپ کے ساتھ ساتھ آپ کی پوری سوسائٹی آپ کے پورے دائرے، پوری بھری ہوئی تماشہ گاہوں، کھچا کھچ چلتی سڑکوں کے خط و نفس کے قابل جنس نہ تھی مگر ہر اس انسان کو جس کا دوسرے انسان سے سابقہ پڑے یہ سمجھنا چاہیئے کہ دوسرا بھی اسی کی طرح گوشت پوست کا بنا ہوا ہے اس کا شعور بھی حسیات اور داعیات کا حامل ہے۔ اس میں بھی گرمی ہے اس کا بھی خون اتنا ہی سرخ ہے، پھر جس بلب کی روشنی میں آپ کو بیٹھنا نہیں تھا اس کے بٹن کو ایک سکنڈ کے دسویں حصہ کے لیے چھونے کی کیا ضرورت تھی؟۔ جس ساز کے نغمے سے اپنے سامعہ کو محظوظ نہ کرنا تھا۔ اس پر مضراب چھوآنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟۔ جو پھول نہیں پہننا تھا اس کی خوشبو سونگھنا کیا ماری جاتی تھی۔ آپ کو جس راستہ نہ چلنا تھا اس کے کوس ہی کیوں گنے۔ نہیں مغرب زدہ نوجوانوں کا تو یہ ایمان ہے۔ میں آپ کو بی جمالو کے نام سے پکارتی ہوں جن کو بھس میں چنگاری ڈال کر علحدہ ہو جانے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔"

شوکت نے کہا۔ "بس آپ نے تو اس وقت غالب کا بھولا ہوا شعر یاد دلا دیا ؎

پُر ہوں شکوے کہ ہو راگ سے جیسے باجہ

اک ذرا چھیڑئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے"

شائستہ نے اس کے مُنہ سے بات لے کر برجستہ کہا۔"جی چھیڑا تو کیا چھیڑ آسان ہے کوئی!!۔ ذرا چھیڑئے تو کسی کو۔ چھیڑ نبھانے کے لیے کی جاتی ہے۔ بی جمالو۔ یہ نہیں۔ ڈال چنگاری الگ ہوگئیں۔"

شوکت نے اس کے مُنہ سے بات لے کر کہا "اوہو! بس بس! اور کچھ نہ بتایا ساس نے یہ تو سب پیٹ میں اتار دیں۔ اگر بی جمالو بے چاری چنگاری نہ ڈالتی مصیبت اور غریب نے ڈال دی تو قیامت! بیگم صاحبہ اگر خاموش ساز پر مضراب نہ چھوآتا۔ (اس کار خسار چھوکر) ایک سانس اس پھول کو نہ سونگھتا تو آج یہ اندر سے باہر تک گرمی، نغمہ، خوشبو اور زندگی کیسے تھرکتی ناچتی اڑتی نظر آتی۔ خیر بیگم، دلہن، خانم یا جو کچھ بھی ہو، ہم بالکل قصوروار، نااہل، نالائق، کندۂ ناتراش، بیکار وغیرہ اور وہ کیا کیا غرض سب ہی کچھ اور درحقیقت تم جیسی شریف، خوب صورت، نیک بی بی کے میاں تو درکنار کفش بردار بننے کے بھی اہل نہیں تھے مگر بقول تمہارے اب تو بن گئے یہ "حسنِ اتفاق ہے"۔ لہٰذا اب تم بھی ہماری بن جاؤ۔ اور لڑائی ختم آؤ صاحب ساجھا کرلیں۔" کہتے ہوئے شوکت اپنی کرسی سے اٹھ کر شائستہ کی مسہری پر جا بیٹھے۔ شائستہ کھسک کر مسہری کے دوسرے سرے پر جا بیٹھی۔

۵

آزادیوں کے رسیا، نئی آزاد خیالیوں کے جویا شوکت کی آزادی کی انتہا ہوگئی، اس کی خدمات ہندوستان سے باہر باطوم کے تیل کے چشموں پر مستعار کرلی گئیں اور وہ اپنی اس اتفاقیہ آمد سے ٹھیک چھ مہینے روس کی سرحد کو روانہ ہونے لگا۔ وہ پندرہ سال کا معاہدہ کر کے جارہا تھا اس نے کوشش بھی کی کہ وہ اتنی طویل مدت کے لیے ہندوستان چھوڑنے سے پیشتر ایک دو ہفتہ گھر کے لیے نکال سکے مگر جوائننگ ٹائم کے چھ کے چھ ہفتے اسے اپنی سوسائٹی کے رخصتی دعوتوں، پارٹیوں اور

جلسوں کے پروگراموں میں ایسے گذرے کہ ایک دو ہفتہ تو درکنار وہ ایک دو دن بھی نہ نکال سکا۔ اور پھر جس ماحول میں اس کا دم گھٹتا تھا اس کی جانب اس کے قدم بھی آسانی اور روانی کے ساتھ کیسے اٹھتے اس نے چلتے وقت اپنی روانگی کی اطلاع کا ایک تار دیا اور نئی روشنی کا دلدادہ، جدید تمدن کا دیوانہ، جدید ترین فضا میں پہنچ گیا، جہاں کی وسعتیں ہزاروں صدیاں ماضی کی اور سینکڑوں قرنیں مستقبل کی اپنے روشن حدود میں لپیٹے ہوئے تھیں۔ اس نے ان حدود میں ایک سوسائٹی پائی، جس کا دائرہ درحقیقت اس دائرے سے جس میں وہ ہندوستان کے اندر خود کو شیر خیال کرتا تھا کہیں زیادہ روشن اور اس کے وہم و گمان سے زیادہ وسیع تھا۔

دو تین ہی مہینے روسی سرحد کی فضا میں سانس لینے پایا تھا کہ اس نے اپنے بہنوئی کا دوسرا رنگین تار پایا، جس میں لڑکی کی پیدائش کی تاریخ تھی۔

"اک نہ شد دو شد! — بھلا دماغ خراب ہے! مجھے کیا دلچسپی بھلا؟! خوب! میونسپلٹی کے دفتر میں اطلاع کراتے نواب صاحب بہادر، یا یہاں تار اڑایا گیا۔ افسوس کہ جاہل غیر متمدن مخلوق پتہ ہی نہیں کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی"۔

اور اس نے دوبارہ تار طنزیہ پڑھا اور کراہیت کے ساتھ مٹھی میں دبا کر گولی بنائی اور ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

زمین کی حرکت سورج کے گرد ہوتی رہی اور بظاہر سورج امروز و فردا کا پیمانہ بنا زمین کے گرد گردش کرتا رہا اور پانچ مرتبہ تین سو پینسٹھ روز و شب کی تکرار کے بعد ایک دن وہ بھی نکلا جو ہر خوش قسمت بیٹے اور باپ کے درمیان نکلتا ہے اور جس کا استقبال ہر بیٹا فطرت انسانی کے مطابق ؎

خوشتر از آوازۂ مرگِ پدر آوازش

سے کیا کرتا ہے باپ کے مرنے کی اطلاع پر تقاضائے بشریت کے تحت شوکت کے دل سے بھی ایک دھواں سا اٹھا اور آنکھوں میں چشمے سے زور مارنے لگے اور ایسے نازک موقع پر اس کی متمدن شریکِ حیات غم گسار مغربی بیوی نے اسے نہایت سائنٹفک الفاظ میں تشفی دی اور شوکت کا غم اس کے الفاظ سے کچھ ایسا غلط کیا اور اس کے تڑپتے ہوئے دل کو ایسی تسلی اور سکون دیا کہ وہ آنے والے دوسرے خطرے کے خوف سے بھی پیشگی تسلی پا کر مستغنی ہو کر رہ گیا یعنی وہ اپنی ماں کی موت پر بھی آج ہی سے صبر کر کے

بیٹھ گیا۔ اور وہ کیا سمجھاتی اس فلسفہ کو تو وہ اچھی طرح پڑھ چکا تھا اور مخصوص کلب اور جلسوں کی صحبتوں میں اس موضوع پر بحثیں کر چکا تھا، اور سیدھی سی بات تھی جو اس کی رفیقۂ حیات نے کہی، وہ خود بھی تو ماں باپ کا درجہ نئی روشنی میں خوب سمجھے ہوتے تھا اور یہی اس کی جس وقت رفیقۂ حیات نے اس رنج و غم کے طوفان میں گھرے ہوئے شوکت سے بیان کیا تو اس کا دل ہلکا ہو گیا۔ سیدھی سی بات تھی۔ باپ اور ماں تقریباً سو فی صدی اپنے حفظِ نفس کی خاطر جمع ہوتے ہیں، جس کے نتیجہ میں ایک بچہ کی ذمہ داری نیچر ان کے سر باندھ دیتی ہے اور وہ دونوں جمہور کی اور مُلک کی دولت سے اس کی پرورش کرتے ہیں لہٰذا پیدائش اور پرورش کا کوئی احسان اولاد پر ماں باپ کا نہیں ہوتا مگر جب ابتدائے آفرینش سے انسان نے انسان کو غیر متناسب دماغی، جسمانی یا مالی تقسیم کی طاقتوں کے زور سے مطیع بنانا شروع کیا اور رسمِ خاجگی اور بندگی کی جو بنا ڈالی وہ ہر مولود پر اس کے والدین کے حقوق تھی ۔۔ ماں باپ کا درجہ قدیم شہنشاہی تمدّن کی سب سے بڑی عیاری اور دقیانوسی عوام کی سب سے روشن حماقت ہے اور نوعِ انسانی کو خوئے غلامی کا درسِ اوّلین ہے۔ جو ہزار سال پیشتر سے چند چالاک لوگوں نے رائج کر کے اور باپ کے درجہ کی فوقیت انسان کے دماغ میں قائم کر کے اپنی خود غرضی کی بنیادیں مضبوط کیں اور عوام کو اُلّو بنایا آج کی دنیا میں بھی ماں باپ کا احساسِ برتری اور فوقیت قدیم تاریک رومن دور کی یادگار ان کے نظام حکومت کا وفاق PATRI POTESTAS ہے جو انھوں نے اپنی خواجگی اور سیادت کو بقاءِ دوام دینے کے خیال سے نسلِ انسانی کی گھٹی اور خمیر میں ڈال دیا ہے۔ اب بیسویں صدی کے وسط کی گذرتی ہوئی دنیا میں ان سب حماقتوں کے بھانڈے پھوٹ چکے ہیں۔

مگر شوکت مشینی دور کے تقاضے کے مطابق اس مادّی عہد میں غیر مادّی خدا اور اس کے خوف کی حماقتوں کے یقین کی ندامت کے مرحلے سے بھی بہ آسانی گذر گیا اور گرم مُلک کے پٹھان جاگیر دار کا بیٹا خیر "عورت جمہور کا مال ہے۔" یہ بھی ہر کہ بر خود پسندی بدیگراں ہم مپسند کو بالائے طاق رکھ کر اس کے ایک رُخ پر عامل ہو سکتا تھا مگر اسے اس کا دوسرا رخ بعض اوقات بہت تکلیف دِہ معلوم ہوا وہ ایک مشرقی جاگیر دار گوشت پوست کی تعمیر ہوتے ہوئے خیر یہ تو برداشت کر سکتا تھا کہ وہ خود جمہور میں شمار کر لیا جائے مگر اس کی عورت بھی عورت میں گنی جائے یہ چیز گو لاکھ یوروپی تمدّن نے اس پر برف باری کی تھی لیکن پھر بھی وہ اتنا جامد تخ نہ ہونے پایا تھا کہ اپنی رفیقۂ حیات کو جمہور کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالنے سے زیادہ

دیکھنے پر اپنے جذبات میں گرمی نہ پیدا ہونے دینے پر قادر ہو سکے۔!

قہرِ درویش بر جانِ درویش ایک مستقل محاذ جنگ کی صورت اس نے اپنے معاہدے کے پندرہ سال جگمگاتے مشینی تمدن کی شاہکار اس بلند وارفع فخرِ جہاں سوسائٹی میں گذارے جس کی شریعت کی وسعتوں میں گدھ کی بیٹ سے لے کر کتے کے پیشاب تک ہر چیز شیرِ مادر ہے اور تلوار کی دھار کی طرح پڑتی ہوئی اس آزاد و بے لگام طوفانی ہوا میں ؎

زہر دیں اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

کے معیار پر سانس لیں جو طوفان اور آندھی کے وقت بلندی سے انتہائی پستی میں گر کر خوش گوار اور ٹھنڈی معلوم ہوتی ہے۔

وہ اپنے معاہدے اور قوانین کے مطابق مدتِ معینہ سے پیشتر اپنی نیم عسکری قسم کی ملازمت سے سبکدوش نہ ہو سکتا تھا۔ مگر جتنا وقت گذرتا گیا اسے اپنے ماحول سے نفرت، اسے اپنی سوسائٹی سے گریز بڑھتی رہی،

"شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن"

وہ آزادیوں اور بدلگامیوں کے سنگین حصار میں باصرہ شکار نئی روشنی کی رنگارنگ کسوٹیوں پر چڑھتا اترتا رہا یہاں تک کہ وہ آزادیوں سے بھر پانے کے بعد چھلک پڑنے کے لیے وسعت تلاش کرنے لگا اور جیوں ہی اس کی ملازمت کے پندرھویں سال کے اختتام کا وقت آیا تو یہ قیدِ آزادی کا قیدی اپنی اصل کی جانب رجوع ہوا۔ اس کے تحت الشعور میں جو آواز ایک ہیولے کی صورت پندرہ سال سے صوتی شکل اختیار کرنے کی ناکام کوشش میں گھٹ گھٹ کر رہ جاتی تھی آج اس کے کانوں میں بخوبی سنائی دینے لگی۔ "گریز! رجعت!" اور پھر اس نے صاف صاف سنا "آزادیوں کا قیدی پابندیوں کی قید چاہتا ہے" اور جب اس کی موجودہ میعادِ ملازمت کے اختتام میں ایک ہفتہ باقی رہ گیا تو جیسے اس کے سینے کے اندر کی تاریک فضا بڑے زور سے گونج اٹھی "میں حدود چاہتا ہوں! — میں باڑھ چاہتا ہوں!! — چار دیواری! مجھے بلند چار دیواری چاہیئے! اونچی دیواریں! میں قید چاہتا ہوں! — میں قیدی بنوں گا! میں قیدی بناؤنگا گرویدگی! قید! پابندی! حدود!" اور جیسے بڑے زور سے اس کے سینے کے ہڈیوں کے صندوق میں بیڑیاں جھنجھنا اٹھیں — اور بڑے زور سے آواز گونج اٹھی "زنجیریں! فولادی زنجیریں!! آہنی رسیاں، بیڑیاں! بیڑیاں! رسیاں! رسیاں!" ایک زبردست روشنی کا تند بُقہ سامنے آگیا جس نے اس کی آنکھوں

کے ساتویں پردے توڑ کر اسے اندھا کر دیا ، " تاریکی ! تاریکی !! " جیسے اس کی کٹورا سی چھلکتی آنکھیں چلا پڑیں —

آزادیوں کے زنداں کا مفرور ، آزادی کے حصار توڑ کر ، لق و دق وسعتوں کا محبوس عرش د ۔ے گریز کر کے ، روشنیوں اور خیرگیوں کی تندیوں کا اندھا ، تاب ناکیوں سے بھاگ کر مغربی آزادیوں وسعتوں اور روشنیوں کے ردِ عمل کی ٹھوکر میں بڑے زور سے مشرقی چار دیواریوں کی وسعتوں ، ہندوستانی تنگیوں کی کشائشوں اور ایشیائی تاریکیوں کے نوروں کی جانب فرار ہوا — جن میں اس کا ایک قیدی تھا ۔ حبس دوام پر نازاں ، اپنے محبس کی سربفلک دیواروں میں کائنات کی وسعتیں سموئے ، اپنے قید خانہ کی غلامیوں میں دوامی آزادیاں لپیٹے ، اپنے زنداں کی تاریکیوں میں وہی انوار سمیٹے — سچا قیدی ! ایماندار قیدی ، پاک قیدی ، قیدی ہی قیدی !

بغیر پیچھے مڑ کر دیکھنے والا مغرور شوکت ، فروزاں ، گریزاں ، بریاں ، پرّاں اپنی جنّت ارم سے منہ موڑ کر اپنے سینکڑوں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سرگرم پرواز طیارہ سے زیادہ سریع السیر ضمیر کے ساتھ اڑ کر پندرہ سال بعد سرزمین وطن پر اترا اور سیدھا اپنے قیدی کے ساتھ مقید ہونے کو اس کے زنداں کی طرف بھاگا ۔

سہ پہر کا وقت تھا — پندرہ سال اور گذرنے پر بھی اس کی اپنی آبائی محلسرا کا دروازہ ویسا ہی کھڑا تھا جیسے وہ دو صدی پرانا ہونے پر بھی بالکل نیا سا بنا چھوڑ گیا تھا — پھاٹک کا اونچا تاج ، بُرجیاں ، مینار ایکڑوں ، زمین پر پھیلا ہوا بلند و پست عمارتوں کا سلسلہ اپنے لمبے لمبے سائے شام کے غروب ہوتے ہوئے سورج کی زرد ڈھلی ہوئی ٹھنڈی دھوپ میں بالکل ویسا ہی چھوڑ رہا تھا جیسے اس ساونتی دور کی یادگار ساونتی تمدّن کی تعمیر کے قیام کے وقت سے چھوڑتا رہا تھا ۔ پھاٹک پر البتہ ڈھیلی ڈھالی شوخ وردی کے بوڑھے دربان کی بجائے بلند و بالا ، چُست اجنبی سنتری خاکی وردی میں ملبوس کھڑا تھا ، وہ بیباکانہ درانہ پھاٹک میں گھسنے لگا اور اجنبی سنتری کی آنکھوں میں عمر میں پہلی مرتبہ اپنے غائبانہ آقا کو دیکھ کر جیسے اس کا شفاف نمک چمک اٹھا اور اس نمک کی عینک میں ۔ سے اس نے پہلی نگاہ میں اپنے آقا کو بخوبی پہچان کر نیم فوجی انداز میں سلام کیا ۔ وہ چھوٹے بڑے دیوان خانوں کے صحنوں میں سے گذرا اور پھاٹک کے اندر جیسے ہی اس نے ایک نظر ماحول کو پرتالا تو جیسے جاندار و

بے جان ہر شے باآوازِ بلند خوش آمدید پکار رہی تھی ۔ ہر چیز سے اس کا اپنا تمک بولا پڑتا تھا۔ چپہ چپہ پر بلا کا اشتیاق !۔ قدم قدم پر غضب کی اُنسیت !۔ از فرش تا عرش شدت کا انتظار طول کے ہاتھوں موت سے زیادہ شدید انتظار برس رہا تھا۔ اس نے منزلِ مقصود کے ماحول والی اطمینان اور سکون چھوڑتی لمبی سانس لی اور ادھر ادھر دیکھا۔ دفتر کی کوٹھریوں میں نئی نئی صورتیں، دیوان خانوں اور نشست گاہوں میں جدید فرنیچر پائیں باغ اور گملوں میں جدید و جدید تر پھول پتے گیرجوں میں اپ ٹو ڈیٹ ماڈل کی کاریں اندر سے باہر تک جاندار و بے جان ہر شے پر نمو اور جدت کا عالم، بوڑھا مختارِ عام نوکروں کے پورے ایک غول کی قیادت کرتا اپنے بے راہی پردیسی بھٹکے ہوئے آقا کو دیکھ کر آداب بجا لایا۔ تعجب اور خوشی سے اس کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی ۔ آنکھ میں آنسو، دونوں ہاتھ جڑے ہوئے از سر تا پا مجسّم شکوہ رونگٹے رونگٹے سے پکارتا ہوا۔

"سرکار بھلا یہاں کیا نہیں ہے ؟!"

اس نے ایک مانوس جست ملازموں کے اس بھونچال سا برپا کرتے گروہ کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ڈیوڑھی میں لگائی ۔ اور سامنے دالان میں بلند محراب کے نیچے ایک ہستی کھڑی دیکھی۔ دلہن بیگم، بی بی جملہ مدارج سے بلند تر کچھ حور والی سطح پر وہ صحن کے وسط میں جیسے سکتہ میں کھڑا رہ گیا ۔ مہجور و منتظر نگاہوں کا تبادلہ ہو رہا تھا، دو پتھر کے بُت آمنے سامنے کھڑے تھے، آج کان پکڑ کر رونمائی کرائی ہوئی معصوم خوابیدہ دوشیزہ سے زیادہ بھولی بھالی آج چوتھی کی رات والی دلہن سے زیادہ شوخ، طناز، آج موٹر سے اترتی ہوئی سرتاج دلہن سے زیادہ حسین و رعنا آج حسنِ اتفاق سے مشرقی تمدن کی وکالت کرتی بیگم سے زیادہ قابل و شاندار جھریّ دار چہرے اور بے آب دانتوں والی شائستہ گلہری کی پونچھ سے بالوں اور بے کیف آنکھوں والی شائستہ، کچھ ملکوتی پاکیزگی، قدوسی نورانیت، نرد کی الوہیت، اپنے تمام وجود میں لیے کھڑی تھی، استقامت کا مجسّمہ، اطمینان کی تصویر، صبر و رضا کی تشکیل، انتظار کی دیوی۔ وارفتگی کے عالم میں اس کے بے پناہ حسن سے مرعوب شوکت جہاں کا تہاں جامد و ساکن کھڑا اٹھا اور اس کی عنبریں زلفوں، اس کے گلگوں رخساروں، اس کے موتی سے دانتوں اور اس کی نرگسی آنکھوں کی شراب اور کیف سے مخمور، ماحول اور وقت کے احساسات سے باہر اک خود فراموشی کے عالم میں۔

یک دم دونوں کی آنکھوں نے حرکت کی اور ماحول کے بدلتے ہی اپنی اپنی خود فراموشی کا طلسم

ٹوٹا ایک رنگین سایہ دونوں کے درمیان میں متحرک نظر آیا اور ساتھ ہی موسم بہار کی صبح والی شیامہ کی آواز صحن میں بلند ہوئی۔

"امّی !!"

"ابا۔ تمہارے ابا جان ۔رخشندہ"!

اور جیسے کچھ جھجکتی اور آپا سنبھالتی رخشندہ لٹے پاؤں اندر کو پلٹتے ہوئے ٹھہری ۔ٹھہری ۔اور شوکت کے سامنے گویا کان پکڑ کر دکھائی ہوئی شائستہ کھڑی کروبیاں والے تیوروں سے متعجب شرمائی، گھبرائی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"ہیں ہیں، کیوں رخشندہ! تمہارے ابا جان" شائستہ نے کہا۔

لڑکی نے دوسری نگاہ شوکت پر ڈالی، کچھ جھینپی، اک اجنبی التفات سے دیکھ کر تیوروں میں شعوری طور پر انسیت پیدا کرنی چاہی پھر ایک ہاتھ کی انگلیاں دانتوں میں دبائے اور چڑی چڑی سی نگاہوں سے باپ کی جانب دیکھتی ماں کی طرف کو بڑھی اور ماں کی چوڑیوں بھری کلائی پکڑ کر کھڑی ہوگئی ۔ یک دم برابر کے کمرے سے ایک نوجوان کچھ چھلانگ سی لگاتا سامنے آگیا۔ بس جیسے انگلینڈ جاتے وقت والا شوکت ۔ ایک نگاہِ غلط انداز سے شوکت کو گھورتا آہستہ آہستہ شائستہ کی جانب بڑھا اور اس کی دوسری چوڑیوں بھری کلائی پکڑ کر کھڑا ہوگیا۔ نہ معلوم کس وقت شوکت پانچ قدم کا فاصلہ طے کر گیا اور ایک ہاتھ میں بیٹی کی دوسرے میں بیٹے کی کلائی پکڑلی۔ پرنور حلقہ بن گیا۔ مہجور منتظر آنکھوں سے منفعل و دور آنکھیں قریب آگئیں اور ایک تبادلہ میں صبر و رضا، حلم، وفا اور اور ندامت، عفو، محبت سب کچھ پڑھ لیا۔

باپ بیٹا، ماں بیٹی !۔ ایک پرانوار حلقہ! جو اپنے محاصرے میں کائنات کو لیے ہوئے تھا۔ جو وقت کی گردش اور زمانے کے طوفاں کی دست درازیوں سے باہر تھا۔ جس کے مرکز پر زمین کا محور ٹکا ہوا تھا۔ محراب کے نیچے چمک رہا تھا۔

آسمان سے بارشیں ہو رہی تھیں ۔ نورانی بارشیں، فردوسی بارشیں، قوسی بارشیں۔

وہی ۔ ازلی ۔ ابدی

۱۹۵۰ء

ریوڑیوں کا کھیت

اور اب لوگ اُنھیں دیکھ کر کچھ خواہ مخواہ زیادہ حیرت کرنے لگے تھے ورنہ بڑے میاں داخلی اعتبار سے تو ایسے کچھ زیادہ نہ بدلے تھے البتہ صوری اعتبار سے وہ بوڑھے کی حدود سے بھی تجاوز کرتے نظر آتے تھے اور دیکھنے والے کو پہلی نظر میں ان کی شکل دیکھ کر غسل خانہ کی نالی والا اپیلا مینڈک یاد آجاتا تھا جو موسم برسات میں پانی سے باہر آکر اپنے شاگردوں کی پوری قطار کو سامنے کئے سبق پڑھایا کرتا تھا۔ غرض بڑے میاں بچہ ہی پیدا ہوئے۔ بچہ ہی جوان اور بچہ ہی بوڑھے اور ان کے تینوں دور اپنے نشیب و فراز طفلانہ دنیا کے اندر ہی طے کرتے رہے۔

سٹھنے کا اطلاق تو بڑے میاں پر یوں نہیں ہو سکتا تھا کہ اگر اب سٹھ گئے تو کب نہیں سٹھے تھے؟ بچپن کا اطلاق یوں نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ بوڑھے سے زیادہ ضعیف کی تعریف نظر آتے تھے، غرض ہر دور میں اُنھیں یار لوگ "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو!" کہہ کر معاف کرتے رہے اور بڑے میاں بچپن میں بھی اگلے وقتوں کے تھے، جوانی میں بھی اگلے وقتوں کے تھے اور اب تو کچھ شبہ ہی نہ تھا سفید لمبی داڑھی کا سرٹیفکیٹ جھریوں کی تہوں کی سند ــــ

جاگیر کا کام تو ہمیشہ ان کی عقل و فہم کی رسائی سے باہر تھا تمام عمر کارندوں کو مارتے کھاتے گذری اور بڑی بی بی بھرا بھر سہاگ اچھی خاصی بیوہ بنی تجھ مجھ کے ہاتھوں اپنی آمدنی کی بھیک سی لیتی رہیں مگر قدرت زندگی کے جن شعبوں میں اپنی ستم ظریفی دکھاتی ہے ان

میں ایک تولید و تناسل کا بھی شعبہ ہے۔

اول تو بڑے میاں کے اولاد ہونا ہی کیا کم تھا اور پھر بیٹا! اور بیٹا بھی ماجد میاں جیسا! بڑے میاں کو قدرت نے ذہنی و فکری صلاحیتوں سے جتنا محروم کیا تھا اتنی اور خود ماجد میاں کے اپنے حصّہ کی مع سود در سود ماجد میاں کو ادا کر دیں تھیں۔ ماجد میاں پڑھے لکھے تو یوں ہی واجبی تھے جیسے بالعموم ہزاروں روپیہ ماہوار آمدنی والے جاگیر دار بچّے ہوا کرتے ہیں مگر دماغ میں عقل اور انتظامی صلاحیتیں ٹھیک پانچ آدمیوں جیسی تھیں، زمیندارانہ سیاست، کاشت کاری مقدمہ بازی میں آٹھوں گانٹھ کمیت! پیسہ پیسہ پر نظر رکھنے والا اور بقولِ کسے دانہ دانہ پر مُہر لگانے والا۔

چیرمین، آنریری مجسٹریٹ غرض وہ تمام چیز جو ایک بیدار مغز جاگیر دار بچّہ ہوا کرتا ہے۔ باپ کی اخیر عمر تھی، اپنے وقت پر وہ خود بھی ان کے ہاتھ کا کھیلا ہوا تھا اور اب جبکہ خیر سے بڑے میاں اپنی طفلانہ عمر کی پچھتّرویں بہار لوٹ رہے تھے اس کے دو تین بیٹے اور دو تین لڑکیاں بڑے میاں کے ہمجولیوں میں تھے۔

ماجد میاں نے انتظام ریاست اپنے ہاتھ میں لیتے ہی اندر سے لے کر باہر تک ہر شعبہ کو قاعدہ میں ڈھالا تھا۔ چنانچہ باپ کے رجحان اور مشاغل کے مطابق ان کے لیے بھی انتظام کیا تھا۔ اُسے خوب علم تھا کہ بڑے میاں پانچ سال کی عمر سے پچھتّر سال کی عمر تک قصبہ کے پرانے پشتینی حلوائی کی دکان کی ریوڑیاں کھاتے رہے ہیں۔ اور نہ صرف کھاتے رہے ہیں بلکہ کھاتے اور کھلاتے رہے ہیں۔ لہٰذا کارندے کو ہدایت تھی کہ بستہ اور قلمدان کھولتے ہی سب سے پہلا کام جو کرے وہ ایک روپیہ بڑے میاں کے خاص ملازم فقیرا کے ہاتھ میں ان کی جیب خرچ اور ریوڑیوں کا رکھ دینا، ہونا چاہیئے۔ گھر اور پڑوس میں ہر فرد کو بڑے میاں کے اس روپیہ کا حساب ازبر تھا۔ اُنھیں بی بی کے دور میں ایک روپیہ یومیہ بی بی سے اور بیٹے کے وقت میں بیٹے سے اور باپ کے زمانہ میں باپ سے ملتا چلا آرہا تھا۔ اور وہ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ وہ ہم جولی جو آج کل تھے ان کے باپ اور دادا توریثی انداز میں بڑے میاں کے ہم جولی رہ چکے تھے اور روایات کے مطابق روپیہ اور ریوڑیوں میں شریک رہتے تھے

سب جانتے تھے کہ آٹھ آنے یومیہ ریوڑیوں کے تین آنے کبابوں کے اور دو آنہ چاٹ کے باقی تین آنہ میں دو پیسہ منّے کے دو پیسہ ننھے کے اور ایک آنے میں کامنی، رضیہ، ساجدہ اور رقیہ بنتی ہیں اور دو پیسہ پڑوس کے لڑکے رفن کے اور دو پیسہ نصین کے نواسے ٹلوا کے۔ اور باقی سب ریوڑیوں، کھیلوں اور چاٹ میں برابر کے شریک۔

صبح تڑکے سے آنکھیں ملتے چنیبڑ لگے اور کچھ موتھ ڈھلے چمکتے بھانت بھانت کے بچے محلسراء، شاگرد پیشہ اور پڑوس سے نکل نکل کر سہ دری کی جانب دوڑتے دکھائی دیتے اور دیکھتے ہی دیکھتے بڑے میاں کے گرد اُن کی پوری ذرّیات جمع ہو جاتی۔ بڑے میاں بڑی خندہ پیشانی سے ہنس ہنس کر اور جن بچّوں سے زیادہ راضی ہوئے اُن کا کلکاریاں مار مار کر خیر مقدم کرتے یہاں تک کہ سورج نکلتے نکلتے سہ دری میں چوکیوں کے فرش پر بڑے میاں کے ارد گرد ان کے ہم جولیوں کی پوری مجلس شوریٰ جمع ہو جاتی اور بڑے میاں کے معتمد خاص ملازم فقیرے کا بڑی بے صبری کے ساتھ انتظار ہوتا جو روپیہ لے کر آٹھ آنہ کی ریوڑیاں اور آٹھ آنہ پیسے لینے حلوائی کی دکان پر گئے ہوتے اور بچے انتظار میں ہمہ تن توجہ ہوتے اور کوئی ننھا منا بول پڑتا، "اور اب بسنتا کا باپ تولتا ہوگا ریوڑیاں میٹھی میٹھی . . . . ہوں اور اب پیسے گنتا ہوگا۔"

"اور اب فقیرے دونا رومال میں باندھتے ہوں گے اور ہونٹوں پر زبان پھیرتا اور اب فقیرے آتے ہوں گے۔ بسنتا کے باپ سے میٹھی میٹھی ریوڑیاں لے کر۔"

اور اِدھر اس قدر اشتیاق سے انتظار ہوتا اور اُدھر فقیرے ملازم کو دور سے آتا دیکھ کر قصبہ کا حلوائی بسنتا کا باپ بھرمل حلوائی چھ آنہ کی لال شکر کی ریوڑیاں تولنے لگتا اور فقیرے نیچے ہی دکان کے تختہ پر اپنے کندھے سے اُتار کر انگوچھا پھیلا دیتا اور روپیہ پھینک کر ایک ہاتھ میں دس آنہ پیسے دوسرے ہاتھ میں ریوڑیوں کی پوٹلی لے کر چل دیتا۔ چالیس تانبے کے جارج شاہی پیسوں میں سے آٹھ اپنی انٹی میں لگا لیتا اور بیس مٹھی میں دبا لیتا اور بڑے میاں کے سامنے ریوڑیوں کی پوٹلی اور پیسے رکھ دیتا۔ پہلے تو بڑے میاں اور ان کا ایڈی کانگ رفن ٹکا ٹکا کر کے سولہ جگہ رکھ کر بتیسوں پیسے شمار کرتے کیونکہ انھیں کوڑیوں کے گنڈوں والے کھیل

کی وجہ سے بیس تک گنتی ہمیشہ سے یاد تھی۔ اب بڑے میاں چاٹ، اور کبابوں کے پیسے تو اپنی جیب میں رکھ لیتے بقیہ روزمرہ کے حساب کے مطابق بچّوں میں تقسیم کر دیتے اور سوا پیسے پانے والے بچوں کے، بقیہ سب کی نظریں ریوڑیوں کی پوٹلی پر جمی ہوتیں اور بڑے میاں ریوڑیوں کے انگوچھے کی گرہ خود کھولتے اور اندر سے مٹھاس اور لذت کا احساس پیدا کرنے والا دونا نظر آتا اور دونے میں میٹھی میٹھی ریوڑیاں، میٹھی میٹھی چمک دار موتیوں لگی۔ اور سب سے پہلے بڑے میاں دو ریوڑیاں اُٹھا کر اپنے مُنہ میں رکھ لیتے اور شور مچ جاتا۔

" بابا ہمیں! — بابا ہمیں — " اور بابا ہمیں تو ایک بھی نہیں ملی ریوڑی — اوں، اوں بابا ہمارا حصّہ دو۔"

اور آبِ حیات اور امرت دھارا کے اشتہار کی تصویریں جان سی پڑی سامنے ہوتی اور بڑے میاں اپنے موںھ کے اندر کی ریوڑیاں پپولتے جاتے اور ہر ایک کے حصہ کی دو دو بانٹتے جاتے اور جب بڑے میاں سب سے آخر والے ساتھی کو ریوڑیوں کی جوڑی دے چکتے تو ان کے اپنے موںھ کی دونوں ریوڑیاں گھُل کر تالو سے حلق تک میٹھی سی لکیر میں تبدیل ہو چکتیں مگر ان کے اکثر ہم جولیوں کے موںھ میں ہنوز موجود ہوتیں لہٰذا چپکے سے بڑے میاں دو ریوڑیاں پوٹلی میں سے چُراتے اور غپ سے موںہہ میں رکھ کر ہونٹ ہاتھ سے پونچھتے کہ مبادا کوئی چوری کا نشان باقی نہ رہ جائے۔ مگران کا چھوٹا پوتا منّے جھٹ سے ان کا جبڑا پکڑ لیتا اور کہتا۔

" اوں اوں بابا! بابا نے دو ریوڑیاں کیوں کھائیں۔"

اور اس طرح اس کے جواب طلب کرنے پر بڑے میاں جیسے چور سے بنے لاجواب ہو جاتے اور پڑوسی لڑکے رفن کی جانب دیکھ کر مدد طلب کرتے اور منّے بدستور جبڑا پکڑے ہوتا۔ گویا اس طرح بڑے میاں کے جبڑے کو چلنے سے روکتے ہوئے مال مسروقہ کی حفاظت کرتا ہوتا جو مشترکہ چیز تھی اور بڑے میاں بیچارے خائن، چور، غاصب سے ہوتے اور رفن کی جانب دیکھ کر مدد طلب کرتے۔ اور رفن فوراً بول پڑتا۔

" کیا ہے جی منّے چھوڑ دو بابا کا مُنھ! بابا کی تو سب ریوڑیاں ہیں جب ہی تو بابا نے دو دفعہ کھائیں۔ بابا چاہیں تو مٹھی بھر کر سب کھالیں ابھی کسی کو ایک بھی نہ دیں۔"

اور منّے سب کھانے کی دھونس۔ سے مرعوب ہوئے بغیر صرف رفن کی سنیارٹی کے لحاظ میں جبڑہ چھوڑ دیتا اور گھبرا گھبرا کر اپنے دادا کی جانب دیکھتا رہتا۔ یہاں تک کہ بڑے میاں ریوڑیاں گھلا کر اخیر مرتبہ تھوک نگل چکتے اور چٹخارہ بھر چکتے اور چھوٹا منّے بھی بھول چکتا کہ بیت المال میں غبن ہوا ہے۔

اور پھر آنکھ مچولی اور دھول دھپّا ::::۔ اور بڑے میاں ریوڑیوں اور کبابوں اور چاٹ کی وجہ سے آنکھ مچولی اور دھول دھپے میں چور بننے سے مستثنیٰ خیال کئے جاتے اور بڑے میاں کی باری پر رفن چور بن جاتا۔ اور پھر کھیلتے کھیلتے جب ذرا دیر ہو جاتی اور منہ کے اندر شکر میں کیمیادی تبدیلی ہو کر ترشابا بن جاتا تو اور بچّے تو "چپ، چپ چپ" کر کے اور ہونٹ چاٹ چاٹ کر رہ جاتے لیکن رفن یا ساجدہ بول اٹھتی۔

"اچھا بتاؤ ریوڑی میں شکر کیسے گھستی ہے"۔

اور اس معمّہ قسم کے سوال پر سب بچّے اور بڑے میاں چونک پڑتے اور سوچ میں پڑ جاتے۔ ریوڑیوں کی پوٹلی نہایت سنجیدگی۔ سے کھولی جاتی سب بچّے کھانے کے لیے نہیں صرف دیکھنے کے لیے ایک ایک ریوڑی ہاتھ میں لے لیتے اور اس کی عجیب ساخت پر غور کرتے۔ بھلا چمک دار دانوں کا جال سا بن کر شکر کی اتنی بڑی ڈلی اس کے اندر کدھر سے گھڑدی ہے !!۔

ہر ایک بچّہ ریوڑی کو دیکھتا اور اس کے میٹھے خیال سے متاثر ہو کر پھر بابا کی جانب ہاتھ بڑھاتا اور "خبردار بابا" کہہ کر اپنی ریوڑی دونے میں رکھ دیتا اور منّے چرا کر اپنے منھ میں رکھ لیتا اور بڑے میاں نہ دیکھ پاتے وہ اپنا حق پوری پوٹلی پر بڑے میاں سے زیادہ خیال کرتا۔

اور بڑے میاں دو ریوڑیاں اٹھا کر اپنے منھ میں رکھ لیتے اور رکھنے کے ساتھ ہی لاؤ ملاؤ کا شور برپا ہو جاتا اور آخر پر منّے کی آنکھ بچاتے ہوئے بڑے میاں اپنے منھ میں دو ریوڑیاں رکھ لیتے مگر ظالم گلہری جیسی آنکھوں والا منّے دیکھ ہی لیتا اور اچھل کر نیولے کی طرح جبڑہ پکڑ لیتا اور پھر رفن بڑے میاں کی گلو خلاصی کراتا۔

اور یہاں تک کہ قریب دس بجے ریڈیوں کا یہ نامعلوم پچاسواں ساٹھواں کونسا دور ہو چکتا اور سب بچّوں کے ذائقہ پر کثیف شکر اچھی طرح مسلط ہو چکتی تو کبابوں والا آتا۔ دور پھاٹک سے کبابوں والے کو آتا دیکھ کر پہلے تو بچّوں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی اور وہ سب کے سب مع بڑے میاں کے تالیاں بجا اٹھتے اور اپنی باریک کچی سریلی آواز میں مل کر ایک کورس گاتے اور بڑے میاں کی آواز پتلی باجہ میں کے بینڈ میں باریک اور موٹی آوازوں کے درمیان سب سے بڑے بھونپو باجے کی آواز کی طرح سب سے علیحدہ نمایاں ہوتی۔

سب بچے سریلی آوازوں میں گا اٹھتے۔

"کبابوں والا آگیا! کبابوں والا آگیا۔ کبابوں والا آگیا۔"

اور جوں جوں کبابوں والا زیرِ لب مسکراتا قریب تر ہوتا جاتا۔ ان کی آوازوں میں بلندی اور زیادہ ہم آہنگی۔ اور جوش میں مزید فراوانی پیدا ہو جاتی۔

بڑے میاں چھ جگہ لگا کر تین آنے کے پیسے گنتے اور کبابوں والا انجیر کے پتّے پر باسی قیمہ کی بارہ سیخیں رکھ دیتا اور دونا بڑے میاں کی جانب بڑھا دیتا اور اتنی دیر میں کوئی بچّہ بول پڑتا۔

"اچھا بتاؤ پہلے کس نے دیکھا کبابوں والا؟"

"ہم بتائیں۔ اچھا ہم بتائیں! کس نے دیکھا۔" منّے برجستہ بول پڑتا "تو ہم نے دیکھا کبابوں والا وہاں پر کواڑ کے پھاٹک میں۔"

"اوں ہوں بہت دیکھا ہم نے۔ میں نے دیکھ لیا تھا پہلے ہی باہر پھاٹک کے سامنے وال پر۔" رقیہ جواب دیتی۔

"جھوٹی تمام خدائی کی، پھر تم نے بتایا کیوں نہیں تھا۔ پہلے۔" منّے کہتا۔

"تو پھر اس نے کہا۔ ہم نے پہلے دیکھ تو لیا تھا۔"

اور رفن فیصلہ کرتا۔ "اور بات تو پہلے دیکھنے کی تھی۔"

"ہاں دیکھو تو بھیا رفن بتانے نہ بتانے سے کیا ہوتا ہے۔"

اور بڑے میاں موقع پاتے ہی کباب کا ایک ٹکڑا توڑ کر اپنے منھ میں رکھ لیتے۔ صبح سے شکر چکھتے ہوئے ذائقے سے بیتاب ہو جاتے اور فوراً بڑے میاں ایک ایک چھلا توڑ کر

سب کو دیتے اور چھوٹی چھوٹی سُرخ سُرخ بلّی کی سی پتلی زبانوں اور تالوؤں کے درمیان چٹ پٹا قیمہ گھلنے لگتا اور تیسرے چوتھے دور کے بعد ہر چہرہ سرخ ہو جاتا اور بڑے میاں کی رال ٹپکنے لگتی۔

"سی، سی، سی، چپ، چپ، چپ۔ بڑی مرچ تھی۔" رفن کہتا۔

اور سب اس کی مانند کرتے۔ سی، سہ، سی، چپ، چپ چپ، "اوئی ہوئی بڑی مرچ ہے۔"

اور بڑے میاں جلدی جلدی ٹپکتی ہوئی رال سنبھالتے ہوئے ریوڑیوں کی پوٹلی کھولتے اور تیزی کے ساتھ پہلے دو ریوڑیاں اپنے مُنھ میں رکھ کر نہایت پھرتی سے دو دو تقسیم کر دیتے اور پھر جلدی دوسرا اور تیسرا دور چلتا۔

نمک، مرچ اور شکر تل کے بگھار سے تبدیلِ ذائقہ کی لذت اٹھاتے اور پھر کبابوں کی ضرب پڑتی اور اس پہ ریوڑیوں کا مرہم لگتا۔ یہاں تک کہ کباب ختم ہو جاتے اور ریوڑیاں ادھیا جاتیں اور صبح سے دوپہر ہو جاتی۔ فقیرا دو رچوکی پر حقہ اٹھائے۔ یہ تماشہ دیکھتے دیکھتے اکتا کر پہلو بدل اٹھتے اور دوپہر کے قریب فقیرا کو بھوک لگتی۔ اور بھوک بڑھتے بڑھتے انھیں ایسا معلوم ہونے لگتا کہ بڑی آنت چھوٹی آنت کو کھانے لگی۔ اور یہ بچّے تو صبح سے مُنھ چلاتے ہوتے۔ یہاں تک کہ اندر سے بار بار بچّوں کی طلبی ہوتی اور دوپہر کے کھانے کے لیے بچّے رخصت ہو جاتے اور بڑے میاں کا خوان آجاتا۔ اور فقیرا کی ناک میں قورمہ، روغن جوش، قلیہ، ترکاری، گوشت، کباب اور باسمتی کے چاول کی ملی جلی خوشبو سنسناہٹ سی پیدا کر دیتی اور پھر ناک سے بڑھ کر اس کے حلق میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں۔ پیٹ میں گھوڑ دوڑ سی مچ جاتی اور وہ خادم سے خوان لیتے ہونٹ چاٹتے ہوئے کلّوں سے ابلتی ہوئی رطوبت نگل نگل کر اپنی اس داخلی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بڑھتے ہوتے جو بھوک کی حرکت اور کھانوں کی خوشبو کے ٹکراؤ سے پیدا ہو کر ان کے اندر رستخیز سی برپا کر دیتی۔

خوان لے کر بڑے میاں تک پہنچتے اور اب فقیرا کی ڈیوٹی صبر آزما ہوتی۔ بڑے میاں کے مُنھ میں نوالے دیتے جاتے اور دو ہی چار نوالے دینے کے بعد فقیرا کا معدہ قلا بازیاں کھانے

لگتا، زبان بلبلا اُٹھتی اور کھانا تو مقدار میں اتنا ہوتا کہ ایک بڑے میاں چھوڑ چار بڑے میاں کے پیٹوں سے بھی اوپر تھا اور ایک فقیرا اور ایک بڑے میاں دو آقا ملازم کیا چار جوڑی ملازم کا پیٹ بھر دیتا اور بچ رہتا۔ بالعموم اپنی تیز بھوک میں فقیرا اس کارِ منصبی کی آزمائش پر پورے نہ اُترتے اور بڑے میاں کے مُنہ میں نوالہ دے کر ان کی نگاہ خوان سے ہٹانے کے لیے یک دم تعجب کی آواز میں ایک جانب اشارہ کرتے اور جب بڑے میاں کی نگاہ ادھر ہو جاتی تو جلدی سے ایک بڑا سا نوالہ آپ اپنے مُنہ میں رکھ لیتے اور عین اسی وقت اندر متے اپنی دادی کے ہاتھ سے۔ ننھے اپنی اماں کے ہاتھ سے رضیہ اور مخلانی اماں کے ہاتھ سے بالکل ویسے ہی نوالے کھاتے ہوتے جیسے بڑے میاں فقیرا کے ہاتھ سے۔

اور کھانے کے بعد سب کے سب جمع ہو جاتے اور پھر ریوڑیوں کا دور چلتا اور اتنے میں فقیرا خوان صاف کر چکتے اور اندر سے آئی ہوئی اپنی ڈھلیا بھر چنے کی روٹی، اور مٹر کی دال بیقے کے ہاتھ جورو بچّوں کے لیے گھر بھجوا چکے ہوتے اور بدستور حقہ تلے چوکی پر دیوار کا تکیہ لگائے بیٹھے ہوتے اور آنتیں بجائے قُل ھُوَ اللّٰہ کے سورۂ اَلحَمد کا ورد کرتی ہوتیں۔

اس پارٹی کے اندر بڑے میاں اور متّے میں ہمیشہ کھٹکتی رہتی، متّے بڑے میاں کا تیسری پشت کا سب سے چھوٹا وارث تھا مگر پارٹی میں بڑے میاں کے مقابلہ میں سپورٹ ملتی لیکن جب ان دونوں کا کوئی مقدمہ پارٹی کا قانون گو رفن طے نہ کر پاتا اور نوبت عدالت العالیہ تک پہنچتی تو باوجود تمام پارٹی کی وکالت اور گواہی کی ڈگری متّے ہی کے حق میں ہوتی۔ متّے اپنی دادی کا لاڈلا تھا جنھیں بڑے میاں بڑے میاں نظر آتے تھے۔ اور اپنی ہمت افزائی کے زور پر ریوڑیاں اور کباب کھا کر اور تو سب بچّے مرہونِ منت ہوتے مگر یہ بدمعاش متّے کھاتا اور غرّاتا اور بڑے میاں بی بی کے مارے پیچ و تاب کھا کر رہ جاتے۔

اور پھر سہ پہر کے وقت، چاٹ والا آتا کبابوں کی تندی پر ریوڑیوں کی مٹھاس پر غلبہ پا کی ہوتی اور ذائقہ کو پھر کسی چٹ پٹی کھٹ مندری چیز کی خواہش ہوتی۔ بڑے میاں بیٹھے رہتے خوانچہ ان کے قریب رکھ دیا جاتا اور بچّے چاروں طرف کھڑے ہو جاتے۔ بڑے میاں دو پیسے دیتے اور وہ برگد کے پتّے پر چاٹ بنا کر رکھ دیتا۔ بڑے میاں چاٹ کا بنا ہوا پتّہ اپنے ہاتھ میں لینے اور

ننھی منّی گلہریوں کی آنکھوں کی شعاعیں اس پر مرکوز ہوجاتیں۔ سب سے پہلے دو قتلے اٹھا کر
اپنے منھ میں رکھتے اور سب نگاہیں ہتھیلی سے ہونٹوں تک تعاقب کرتیں اور منّے ہمک پڑتا
اور ترش چاٹ کے مزہ کا احساس ننھے ننھے کلّوں سے پھواریں سی چھوٹنے لگتیں اور بڑے
میاں جلدی جلدی دو دو قتلے منّے سے شروع کر کے رفن تک بانٹنے جاتے، اور باقی ماندہ چاٹ
کا پتہ پیشتر اس کے کہ بچے اپنے منھ کے اندر ہی ختم کر پائیں جلدی سے بڑے میاں سڑوپ لیتے جس
وقت بڑے میاں پتے پر لگے ہوئے دہی کو چاٹتے منّے کی حالت ناگفتہ بہ ہوجاتی اور وہ بندر
کی سی جست لگا کر پتہ پکڑ لیتا اور غصّے کے مارے لال تال ہوجاتا مگر لتنے میں بڑے میاں اپنی
پتلی لمبی زبان سے پتہ صاف کر چکتے اور ایک ہاتھ سے بار بار داڑھی پونچھتے۔

بڑے میاں کی پارٹی میں صرف منّے وہ فرد تھا جس پر بڑے میاں کا مخلانی بی سے
شکایت کر دینے والا ہتھیار کارگر نہ ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہ بالعموم جب بگڑتا تو بڑے میاں کا منھ
چڑا کر اندر بھاگ جاتا اور اپنی دادی کی گود میں پناہ لیتا اور بڑی بی سے بڑے میاں اتنا
ڈرتے تھے کہ اندر جا کر اس ضمن میں رُو در رُو شکایت بھی نہ کر سکتے تھے اور اس منّے بدمعاش
کے حملے پر خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے۔

شام کو بچی ہوئی ریوڑیوں پر میلاد شریف پڑھوایا جاتا اور تقریبوں میں بڑے میاں
کی آواز ڈھول سا بجاتی سُنائی دیتی اور پھر رفن نہایت خضوع کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر نیاز دیتا
اور حصّہ رسدی ریوڑیاں برابر تقسیم ہوجاتیں اور جب منّے اپنی ریوڑیاں لے کر اور یہ دیکھ کر
کہ اب ریوڑیاں ختم ہوگئیں سب کو وہیں چھوڑ کر گھر میں چلا جاتا تو سب بچے کھل کر بات کرتے
تھے۔ اس کی بدمعاشیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑے میاں کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے
رفن کہتا۔

"ارے بابا وہ تو بوڑا ہے"۔

"بدمعاش کہیں کا اس دن میں... نے ساجدہ بچاری کو مفت میں جھنجھوڑ
دیا۔"

"ہوں اور، اور میری سب چوڑیاں ٹھنڈی کر دیں"۔ ساجدہ اپنی کلائیاں

بڑھا کر بولی۔

"اجی ساجھامت رکھو۔ نکال باہر کرد۔ کوئی بول اٹھتا اور اس اُمید موہوم پر بڑے میاں کا دل ٹھہر جاتا کہ پھر ننھے بول پڑتا۔

"وہ ذرا۔آں۔دا۔ دادی اماں کے زور پر اکڑتا ہے کمین" اور بڑے میاں کا بدستور مرعوب کن کیفیت طاری ہو جاتی۔

یہ تمام کھیل بڑے میاں کے خدمت گار فقیرا تمام دن بیٹھ کر ایک معاشی مشغلہ کی صورت دیکھتے اور خون کے سے گھونٹ پی پی کر اپنی تقدیر کو ٹھونکتے فقیرا خدمت گار تھے اور فقیرا کے باپ بھی خدمت گار تھے اور دادا بھی اسی ڈیوڑھی پر مر گئے تھے۔ مگر شاید اتنی خشک جگہ پر ان میں سے کوئی نہ رہا ہوگا۔ جتنی فقیرا کو نصیب ہوئی تھی۔

عام طور پر جاگیرداروں کے خدمت گذاروں کی مدت ملازمت ان کی جاگیر کی تاریخ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ ہر جاگیردار کی ڈیوڑھی پر ہر چیز کی طرح پشتینی ملازموں کا پورا ایک غول نظر آتا ہے۔ ان کی ذاتِ شریف میں سید، شیخ، مغل، پٹھان کی تمیز نہیں ہوتی اور یہ حضرات قوم کے خدمت گار ہی ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی پارٹی پالٹیکس بھی کچھ اپنی روایاتی قسم کی ایک ڈگر پر ہی چلتی ہے۔ جو فری مین جیسی ہوتی ہے ایک ڈیوڑھی کے ملازمین میں بالعموم دو پارٹیاں ہوتی ہیں حالاں کہ دونوں پارٹیوں کے وضع قطع اور چال ڈھال میں اس قدر یکسانیت ہوتی ہے جیسے پنجابی ہندو اور پنجابی مسلمانوں میں اگرچہ وہ ایک دوسرے کو زک پہنچانے اور نکلوانے کے ہر دم درپے رہتے ہیں۔ لہٰذا اگرچہ پنجابی ایک قوم کہلا سکتی ہے تو یہ بھی ہر صورت۔۔۔ سے قوم کہلانے جانے کے مستحق ہیں۔

اس قوم کا ہر فرد تیرہ آنہ میں روپیہ بھنا کر آقا کو نہایت بامحاورہ اُردو میں سوا اُنیس آنہ کا حساب سُناتا ہے اور ہر ہندوستانی گھر کا جزو لاینفک اور رؤسا کا تو اعضائے رئیسہ بن کر رہتا ہے اور خاص دان سے لے کر افیم کی ڈبیہ تک اور ساگودانہ کے پیالے سے بریانی کی قاب تک ہر جگہ روپیہ میں بارہ آنہ کے شریک ہوتے ہیں۔ اُنھیں بڑے صاحبزادے کی شادی خانہ آبادی کی خوشی سے کچھ کم مسرت بڑے سرکار کی سویم کی فاتحہ پڑھ کر نہیں ہوتی اور اللہ کریں ہنس ہنس کر

اور ناچ ناچ۔ گا گا کر نقلیں کرتے ہیں اور آخر الذکر میں رو رو کر اور دھاڑیں مار مار کر دادِ غم دے کر ہنگامہ آرائی کرتے ہیں اور گھر کی رونق میں کمی واقع نہیں ہونے دیتے۔

طور ہو، منصور ہو یا صور ہو
اک نہ اک ان کو تماشا چاہیے

اور ان مواقع پر جب یہ قوم بچاری کھانے کے بجائے بریانی، متنجن، قورمہ، شیرمال وغیرہ وغیرہ سونگھتے سونگھتے شکمی بدہضمی کے بجائے جنسی ہیضہ کا شکار ہوتی ہے تو جس طرح ایسی پر ہنگامہ تقریبوں کے درمیان تھیٹر کی سی اور بہت ہی نقلیں ہوتی جاتی ہیں ایک اصل پلاٹ سے زیادہ شوخ حکایت درمیان میں یہ آپڑتی ہے کہ یکایک طویل و عریض مکان کی کسی اوپری منزل اور دور دراز نظر قسم کے حصّہ میں گرفتاری کا شور اٹھتا ہے ورنہ کچھ غیر تعین شدہ ایک طرفہ دست درازی کا قصّہ ہوتا ہے یا بنا دیا جاتا ہے یا خود بن جاتا ہے۔ اب گرفتاری کھنّو شیخ کی پارٹی نے کرادی اور رفتار خاں کی پارٹی کا مُرغا کٹا دیا۔ کوئی ادھیڑ عمر کی خادمہ زمانہ سرد و گرم چکھے ہوئے پیٹ بھر کھٹا میٹھا کھائے ہوئے بالعموم فریقِ ثانی ہوتی ہے یا پھر کوئی نئی چھوکری نوجوان مثلِ پیرانِ پختہ کار جو بڑے سرکار سے لگا بڑے صاحب زادہ تک اور بڑے صاحبزادہ سے چھوٹے صاحبزادہ تک اور کھنّو شیخ سے رفتار خاں استاد تک سب کی نظروں اور تیوروں کی آماجگاہ ہوتی اور بقول کسے اندر سے باہر تک چھائی ہوئی ڈرامہ کی ہیروین ہوتی ہے۔ اب کیا ہے مرغا اگر رفتار خاں کی پارٹی کا ہے تو شیخ کھنّو کی چڑھ بنی ہوئی ہوتی ہے باہر سرکار کے سامنے مجرم پیش ہے۔ اندر بیگم صاحب کے حضور میں مجرم پیش ہے باہر کھنّو شیخ وکیل سرکار بنے اپنی نطق کی تمام طاقتیں خرچ کر کے معاملہ کو رنگین تر بنا رہے ہیں۔ اندر ان کی سرغنہ مغلانی یا اتاراب دونوں میں سے کوئی بھی جس کی پارٹی میں ہوں) پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کا پارٹ کھیل رہی ہیں۔ باہر خاص اہتمام کے ساتھ شیخ کھنّو نے سرکار کے سامنے حقہ بھر وا کر رکھ دیا ہے اور بار بار چلم کی آگ خود دھونکتے جاتے ہیں۔ اور اندر مغلانی نے پاندان کھٹکھٹانا شروع کر دیا ہے، باہر میاں تلخ ہونٹوں اور ہنستی آنکھوں سے مجرم کی والدہ اور نانی اماں کی لغزشوں پر روشنی ڈال رہے ہیں اندر بیگم صاحب محلسرا کے کنوئیں کے

پانی اور مطبخ کے نمک میں سمیت ہونے کا شکوہ کر رہی ہیں۔ باہر شیخ کھنو جب ذرا میاں کی حدت میں اک ذرا سا برودت کا احساس کرتے ہیں تو ایک پٹرول کا سا چھینٹا جملہ مار دیتے ہیں اندر جوں ہی ذرا بیگم صاحبہ ٹھنڈی ہوتی ہیں مغلانی اماں ایک دو پھونکیں مار دیتی ہیں باہر حقہ کے دھوئیں پر دھوئیں اڑ رہے ہیں اندر پان کی پیکوں کے فوارے جاری ہیں اور ایک مقدمہ کی سماعت بیک وقت دو جگہ ہو رہی ہے۔

اندر مغلانی سے لگا مہترانی تک آج سب ستی ستیا بنی ہوئی ہیں۔ اور باہر تو شیخ کھنو کی پوری پارٹی آج قرآن کا جامہ پہنے ہوئے ہے اور رفتار خاں کی پوری پارٹی آج اسی ڈرنے کی حد میں ہے، اندر بچاری مجرمہ پر لعنتوں اور تشنوں کا ایک کورس سا گایا جا رہا ہے، باہر میاں کی آوازے ہے یا کبھی شیخ کھنو کی اور مجرم کا جھکا ہوا نادم چہرہ آج باہر شیخ جی وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھالے ہوئے ہیں اندر میر مشاعرہ مغلانی اماں ہیں۔ اور مغلانی اماں بادھوائی فیصلے صادر کر رہی ہیں۔ مغلانی اماں جو ہمیشہ ہر گھر میں ادھیڑ سے کچھ اوپر قدرے بھاری بھر کم، خوب گوری چٹی، روپہلی کمانی کی اور موٹے شیشوں کی عینک لگائے ہوتی ہیں اپنی پچھلی تاریخی روایات کے زربفت اور کمخواب کے ٹکڑوں کی پوری ایک گٹھری کا تکیہ لگائے کسی بگڑے ہوئے رئیس کی بیوہ ہوتی ہیں اور بیگم صاحبہ سے اکتساب حکومت کر کے بہوؤں، بیٹوں اور پوتیوں تک سب پر یکساں حکم بجایا کرتی ہیں، اس مقدمہ میں اگر نوجوان چھوکری ہے تو سر مونڈنے کا اور ادھیڑ خادمہ ہے تو چوٹی کاٹ دینے کا بلا تعمیل حکم صادر کر کے مقدمہ فیصل کر دیتی ہیں۔

قصباتی زمینداروں کے ہاں چار روپیہ ماہوار تنخواہ اور ڈلیا پر روٹی قبل از جنگ اور سات روپیہ ماہوار اور ڈلیا پر روٹی فی زمانہ یہ قوم تنخواہ پاتی ہے۔ اب ذرا اس تنخواہ کی برکت کو دیکھیے اس میں ملازم صاحب کے پانچ سات بچے ایک جورو ایک بوڑھی ماں ایک بیوہ بہن آدھی درجن بکریاں، درجن بھر مرغیاں، سب ہی پلتے ہیں اور تنخواہ ہے کہ کھائے نہیں کھا ملتی۔ اور جس طرح بکریاں پتے چباتی ہیں اس طرح ملازم کی جورو اور اماں اور بہن پان کھاتی ہیں اور جس ٹھاٹ سے مرغیاں دانہ چگتی ہیں اس طرح یہ پرانی چھالیہ ٹونگتی ہیں اس

تنخواہ میں ملازم صاحب کے یہاں بڑی قصباتی تول کے ڈھائی سیر آٹے کی روٹی اور سوا سیر گوشت
کے قلیہ کا خوان اترتا ہے اور انہی قوم کے بدنصیب فرد فقیرا بھی تھے جو ماجد میاں نے بڑے
میاں کی خدمت پر اپنے جدید انتظام میں متعین کیے تھے۔ فقیرا صبح تڑکے خوب مل مل کر
بڑے میاں کا منھ دُھلاتے اور منھ دھوتے وقت کی قدیم علم سینہ والی کچّی کوّے اور دودھ
ملائی والی لوری دیتے۔ پاخانہ کے دروازہ پر پہنچ کر کمر بند کھولتے اور واپسی پر باندھتے اس لیے
کہ استنجی کرنا تو بڑے میاں کو آتا تھا۔ مگر کمر بند کا تاریخی اور روایتی پھندا ساری عمر سمجھنے اور سمجھانے
کے باوجود ان کی سمجھ میں اماں بڑی بی بی اور فقیرا تک کوئی بھی نہ ڈال سکا تھا۔ لہٰذا بیت الخلاء
سے واپسی تک فقیرا دروازہ پر انتظار کرتے اور کمر بند باندھ کر بڑے میاں کو بیت الخلا سے
سہ دری تک لاتے۔ اتنی دیر میں ملازم ناشتہ کا خوان لے کر آجاتا اور فقیرا اپنے ہاتھ سے
بڑے میاں کو دودھ اور بسکٹ کے چمچے بھر بھر کر کھلاتے۔

یوں تو بڑی بی بی نے اپنی شادی کے بعد سے آج تک ہمیشہ کوشش کی کہ وہ شوہر کو
سنبھالیں مگر ہمیشہ ناکامیاب رہیں تو پھر کم از کم یہ کوشش کی کہ اور کچھ نہیں تو وہ شوہر کے پاؤں
میں بیڑی ڈال کر رکھیں، اور کچھ نہیں تو ذرا خدمت ہی اپنے ہاتھ سے کریں مگر سیماب پا قسم
کے بڑے میاں کا یہ دور پانچ سال کی عمر سے لے کر چھہتّر تک ایک رفتار سے ایک راستہ پر
گذرا اور اب عام طور پر اپنے ہم جولیوں کے داداؤں کے ساتھ کھیل کر ان کے ساتھ اسی شان سے
کھیل رہے تھے اور بعض بعض نئے نئے کھلاڑی اس قسم کے بھی جن کے پرداداؤں کو بڑے
میاں کی ہم جلیسی کا فخر حاصل رہا تھا اور فقیرا ملازم کے باپ دادا دونوں بیچارے
وضع دار بھی رہے ہوں گے اور ماجد میاں کے دور سے پہلے اتنی قاعدہ قانون کی پابندی
بھی نہ ہوئی ہوگی اور وہ علاوہ سہ دری اور بڑے میاں کے ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں بھی مار سکتے
ہوں گے اور چار پیسہ پیدا کر لیتے ہوں گے، جبھی تو بڑے میاں کی خدمت گاری کی ڈیوٹی
میں ڈاک خانہ جیسی سوکھی تنخواہ پر عمریں کاٹ گئے اور فقیرا تو بڑی ڈیوڑھی کے دربان سے
لے کر اندر مہریوں اور لونڈیوں سب کی تقدیروں پر رشک کھا کھا کر اپنی تقدیر ٹھونکا کرتے
اور بڑے میاں کی جان کو دعائیں دیتے جو اس کے باپ اور دادا دونوں کو کھا کر زندہ

بیٹھے تین پشت سے اس کا خون چوس رہے تھے اور صبح تڑکے والے ریوڑیوں کی بچت کے آٹھ پیسے جواب شاید تیسری پشت میں انھیں شیرِ مادر سے بھی زیادہ "شیر دادی" ہو گئے تھے۔ جن کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ فقیرا کی تقدیر کا پیمانہ چھلکا دیتے اور وہ دن بھر ددر چوکی پر بیٹھے بچوں کی بہاریں دیکھا کرتے ایک عجیب بیگانگیت کے انداز میں تین پشت سے گزر رہی تھی۔ صبح کی دوانی کے بعد دوسری صبح تک آمدنی کا در بند ہو جاتا۔ اور وہ ایک ایک ہم عصر کی آمدنی کا حساب یہاں بیٹھے ہی بیٹھے آنکھوں ہی آنکھوں میں لگاتا۔ اور اس کی آنکھوں میں خون اتر تا رہتا اپنی اس منحوس جگہ کی ڈیوٹی پر وہ دیکھتا کہ ماجد میاں کا خدمت گار رفتار خاں صبح سے شام تک سرکار کی دم بنا پھرتا ہے اور شام کو روپیہ ڈیڑھ روپیہ کے پیسے لے کر گھر میں گھستا ہے۔ دن بھر سرکار کی ڈبیہ میں سے پان چباتا ہے۔ اور خاص سرکار کے سامنے کی پلیٹ چاٹ کر پیٹ بھرتا ہے اور ڈبیہ پر روٹی گھر کو لے جاتا ہے۔ اور جس دن سرکار کے اجلاس کا دن ہوتا ہے اس دن تین چار روپیہ کے سر ہوتا رہتا ہے۔ ہری بانات کی وردی اور سیر سوا سیر سنہری لیس اور یہ بڑا پگ لادے اینڈتا پھرتا ہے اور ایک رفتار خاں پر ہی کیا۔ بھلا اصطبل سے لے کر دیوان خانہ تک اور ڈیوڑھی سے زنان خانہ تک وہ کون سا ہے جو دھیلی بارہ آنہ کے روزکا روز سر نہ ہو رہتا ہے اور فقیرا بیچارے کو تو صبح والی دوانی اور شام کی میلاد والی مٹھی بھر ریوڑیوں کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آتا تھا ہاں البتہ ڈلیا فقیرا کی بھی بچ جاتی تھی اور وہ بڑے میاں کے پس خوردہ سے اپنا پیٹ بھر لینے کے گنہگار ضرور تھے اور وہ بھی خوان لانے والی مہری سے آنکھ بچا کر اور چرا کر پیٹ کے صندوق میں بڑی مشکل سے اتار ملتا تھا اور فقیرا دل ہی دل میں بڑے میاں کو کوستے۔ جب وہ یہ دیکھتے کہ ہم ان لونڈوں سے بھی گئے گزرے ہیں جو ڈیوڑھی کے بیل چنے اور کپڑے والوں اور زنان خانہ کے درمیان سودا کرانے میں ڈیوڑھی سے دالان تک۔ ہر سودے میں دو چار آنہ پیٹ لیتے ہیں پھر یہ شیطانی ذرّیات جس سے اس کا پالا تھا۔ مجال کیا جو بڑے میاں کے جیب خرچ کے ریوڑیوں والے روپے میں سے بجز دوانی کے اور ایک پیسہ ادھر سے اُدھر ہو تو جائے۔ اور اس مسئلہ پر تو فقیرا کے دادا اور باپ نصف صدی سے زیادہ غور کرتے رہے

تھے اور کوئی سبیل آمدنی کی پیدا نہ کر سکتے تھے۔ یوں فقیرا کا دماغ چکرا اٹھتا۔ اس نئے نظام میں بھی وہ ہر ایک ہم عصر کی آمدنی دیکھ کر کڑھتا۔

مشہور بات ہے کہ بے زری کی ضرورتیں ایجاد زر کی ماں ہیں۔ ایک روز فقیرا جب بڑے میاں کو کھانا کھلا کر اور سوتا پڑے کا پیشاب کرا کر لٹا چکے اور حسب معمول روزانہ والی چڑے چڑیا کی کہانی سنکر چڑے کے افسوس ناک انجام پر بڑے میاں ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن چکے تو اُس نے بجائے طوطا مینا کی کہانی کے یہ تقریر شروع کی۔

دیکھیے تو میاں آپ روزانہ ریوڑیاں مول منگاتے ہیں، اس سے تو بہتر ہے کہ کھیت میں بوا دیں، بڑے میاں پشتہا پشت سے زمیندار تھے کم از کم یہ تو جانتے ہی تھے کھیتوں میں سے ڈھیر کے ڈھیر گیہوں، چنے، اُرد، دھان کے آیا کرتے اور فقیرا کے ریوڑیوں کے کاشت کی تجویز پیش کرنے سے ان کی نگاہوں کے سامنے گیہوں، چنے کے ڈھیروں کی طرح اپنی مرغوب مٹھائی ریوڑیوں کے ڈھیر کے ڈھیر آ گئے۔ اور ان کا خیال یک دم گودام کی بخاریوں کے وسیع صحن میں دوڑنے لگا ریوڑیوں کے چھوٹے بڑے ٹیلوں کے درمیان سفید چمکدار ریوڑیاں قدآدم ڈھیر اور ڈھیروں کے ارد گرد میدان میں موتیوں کی طرح بچھی ہوئیں ریوڑیاں ہی ریوڑیاں!! یہاں سے وہاں تک اور ان کا شعور ریوڑیوں کی تنگ پوٹلی سے آزاد ہو کر بخاریوں کی گہرائیوں اور گودام کے میدان کی وسعتوں میں پھیل گیا اور فرطِ مسرت سے وہ بچوں کی طرح کلکاریاں مارنے لگے۔ اور بجائے ہونٹوں کے براہِ راست حلق سے نکلتی ہوئی آوازیں چہکنے سے لگے۔ اور لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور کلکاریاں مارتی چہکتی سی آوازمیں بولے،

"ہاں فقیرے کھیت! ریوڑیوں کا کھیت!! اور پھر دونوں بازو پھیلا کر بولے۔ اتنی بہت سی ریوڑیاں۔ ریوڑیاں ہی ریوڑیاں وہاں پر گودام ہیں تو بھر کر دو کھیت ریوڑیوں کا بھیا فقیرے۔"

بڑے میاں نے ریوڑیوں کی کاشت کو ایسی ہی معمولی چیز خیال کرتے ہوئے کہا کہ جیسا کہ ان کے یہاں ہمیشہ سے گیہوں چنے اور باجرے کی کاشت ہوا کرتی تھی۔

"تو کیا ایسے ہو جائے گا۔ کہہ دینے سے ریوڑیوں کا کھیت!؟" اس کے لیے تو دام چاہئیں اور آپ روز آنہ بیس پیسے ایک ایک دو دو کر کے مفت میں بچوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ انھیں پیسوں سے ریوڑیوں کا کھیت کھڑا ہو سکتا ہے۔ بس۔"

"اور نہیں دیں گے تو منے رو جائے گا اور بی بی سے کہدے گا۔" بڑے میاں نے کہا۔

"تو آپ بی بی سے کہدیں کہ ہمارے پیسے ہیں منے کون ہوتا ہے۔ ہم نہیں دیتے کسی کو بھی۔"

"ہوں اور پھر منے سے کہدیں گے کہ ریوڑیوں کا کھیت کھڑا ہو رہا ہے۔ بہت سی ریوڑیاں آجائیں گی تو سب مل کر مٹھیاں بھر بھر کھائیں گے۔"

"نہیں میاں کہیں ایسا غضب نہ کر دینا کسی کو بھی یہ نہ بتاؤ کہ ریوڑیاں کا کھیت ہو رہا ہے نہیں تو یہ سب شیطان کھیت پر دھاوا مار دیں گے اور کچا ہی کھا جائیں گے کھسوٹ کر۔"

"ہوں ٹھیک کہتے ہو۔ ہم بچوں سے کہدیں گے کہ اب ریوڑیاں مہنگی ہو گئی ہیں اور اب پوٹلی بہت پیسوں کی آتی ہے اور پیسے نہیں بچتے۔ صرف کباب اور چاٹ کو بچتے ہیں۔" بس

"بس اب کڑے پڑ جائیے۔ مت دیجیے کسی کو ایک پیسہ بس ہو چکا۔"

"ٹھیک کہتے ہو بھیّا فقیرے ہمیں اپنا ریوڑیوں کا کھیت بونا ہے۔ ہاں تو کب بوؤ گے۔"

"میاں اب یہ برسات ختم ہو رہی ہے میں کھیت چنوا کر تیار کر لوں گا اور سردی شروع ہوتے ہی بو دوں گا۔"

"اہا ہا اور پھر بو دو گے اور پھر ریوڑیاں ہو جائیں گی کیوں بھیا فقیرے!؟" بڑے میاں نے خوش آیند امور اور تصور میں ایک کلکاری ماری اور فرطِ مسرت میں جھوم جھوم کر تالیاں بجانے لگے۔

اور دوسرے ہی روز سے فقیرا نے بچوں والے پیسے لے کر جمع کر کے کھیت ریوڑی کے لیے رکھنا شروع کر دیے اور رات کو ایک منتظم اور ایمان دار فیلڈ مین کی طرح جو مالک کی کاشت

کا انتظام نہایت محنت اور تندہی سے کرتا ہو۔ پاؤں دباتے وقت میاں کو سُنایا کرتا اور اس ذکر میں بڑے میاں کو چڑیا چڑے۔ طوطا، مینا اور بادشاہ زادی کی کہانی سے بھی زیادہ لُطف آتا ہے۔

اور ڈھائی مہینے کے اندر یہ آمدنی بھی فقیرا کو شیر مادر ہوگئی۔ اور جب انھوں نے دیکھا کہ ریوڑیوں کے کھیت کی روزمرّہ کی تدریجی تیاریاں سُن سُن کر بڑے میاں کی آتشِ شوق روز افزوں ہے۔ انھیں یہ دس بارہ پیسہ کی آمدنی ہیچ معلوم ہونے لگی۔ لہٰذا انھوں نے بڑے میاں سے کہا۔

"میاں کھیت بو دیا جائے گا۔"

"اچھا" بڑے میاں رینہ خطمی ہو گئے اور دوسرے ہی لمحہ تردد میں پڑ گئے جوں ہی فقیرا نے کہا۔

"اور بیج پڑے گا۔"

"ہوں بیج! بیج پڑے گا تو کیا گیہوں کا بیج پڑے گا ریوڑیوں کے کھیت میں۔"

"ایں میاں ریوڑیوں کے کھیت میں گیہوں کا بیج!؟ ریوڑیوں کے کھیت میں ریوڑیوں کا بیج پڑے گا۔ پانچ روپیہ کی ریوڑیاں بازار سے مول لاکر بیج پڑے گا اور پھر پانی خرچہ آگے پیچھے ہوتا رہے گا۔ ایں وہ پانچ روپیہ کا انتظام ہونا ضروری ہے۔"

اور پانچ روپیہ کا یکمشت سوال بڑے میاں کو پانچ ہزار من کا بوجھ محسوس ہوا اور شاید عمر میں پہلی مرتبہ بڑے میاں حقیقی معنوں میں فکر سے دوچار ہوئے وہ تو ایک روپیہ اور سولہ ٹکے کی حد سے باہر نہ ہو سکے تھے وہ تو غالبًا یہ سمجھے تھے کہ روپیہ ایک ہوا کرتا ہے جو منشی جی دیا کرتے ہیں اور پیسے سولہ ٹکے ہوا کرتے ہیں جو فقیرا کو بسنتا کا باپ دیا کرتا ہے وہ منشی جی کے دیئے ہوئے روپیہ اور بسنتا کے باپ کی دی ہوئی ریوڑیوں کا تعلق سمجھ لیتے تھے مگر ریوڑیوں کے ساتھ سولہ ٹکے ملنے کی شانِ نزول ان کو سمجھ سے باہر تھی۔

ابھی بڑے میاں پانچ روپیہ کی بھرپور اجرت کا احساس دماغ سے کسی ترکیب کی جانب منتقل نہ کرنے پائے تھے کہ فقیرا نے بڑے میاں کے سانس کی تیزی اور گومگو کی غماز

خامشی کے انداز سے میاں کی داخلی کیفیت کا احساس کر کے بات کو ہلکا کر کے کہا۔

"اور میاں پانچ روپیہ، ہم ملائیں پانچ روپیہ آپ دولہن سے مانگ لیں چپکے سے وہ آپ کو دے دیں گی۔ اور اگر آپ تاکید کر دیں گے تو کسی سے کہیں گی بھی نہیں"۔

"ہاں فقیرا دولہن! دولہن تو بڑی اچھی ہے! دولہن دیدیں گی"۔

"لیکن اگر آپ نے دولہن سے کہہ دیا کہ ریوڑیوں کا کھیت بونے کے لیے چاہئیں تو ہرگز آپ کو نہ دیں گی۔ اور ہاں آپ ایسے وقت جائیں کہ بڑی بی بی نہ دیکھتی ہوں"۔

بڑے میاں نے خائف بچے کے انداز میں لفظ "بڑی بی بی" کا استقبال کیا ان کی آنکھوں میں رعب و خوف کی کیفیت ناچنے لگی ان کی آواز پست ہو گئی انھوں نے دائیں بائیں خائف ہو کر دیکھا اور پھر سرگوشی میں بولے۔

"ہاں بھیا فقیرا! بڑی بی بی نہ سُن لیں"۔

"اور میاں دیکھیے آپ دولہن سے بھی منع کر دیں کہ وہ بڑی بی بی سے ذکر نہ کر دیں اور نہ کسی بچّے سے"۔

"ہاں فقیرا اور اسے، اسے منّے کو! کہیں منے کو نہ معلوم ہو جائے کہ تم نے ریوڑیو کا کھیت بویا ہے، نہیں تو بدمعاش سب کھا جائے گا کچا کھیت"۔

"اے میاں کسی کو بھی پتہ نہیں دیا جائے گا نہ منّے کو نہ نھنے کو نہ ساجدہ، رقیہ کو اور نہ رفن کو اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی پتہ چل گیا تو ہو چکا کھیت یہ شیطانی پلٹن سب برابر کر دے گی"۔

"صبح تڑکے جب بڑی بی گودام سے جنس نکلوا رہی تھیں۔ فقیرا نے بھی اس وقت بھانپ کر بڑے میاں کو دولہن کے پاس جانے کا اشارہ کیا۔

بڑے میاں چپکے چپکے دبے پاؤں چلے اور ادھر اُدھر دیکھتے ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے۔

دولہن نماز کی چوکی پر بیٹھی ہوئی کلام پاک تلاوت کر رہی تھیں۔ اپنے بچے کے ساتھی اور پیر نابالغ قسم کے سُسر کو خلاف معمول اتنے صبح زنان خانہ میں آتا دیکھ کر متعجب سی

ہو گئیں اور تھوڑا سا گھونگھٹ نکال کر بدستور کلام پاک پڑھتی رہیں اور دُلہن اور بھی زیادہ متعجب ہوئیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ بڑے میاں ان کے قریب مجسم التجا اور صورت سوال بن کر آکھڑے ہوئے انھوں نے کلام پاک کی گردان کی اور چوکی سے اتر کر خیر مقدم کیا اور پیشتر اس کے کہ بڑے میاں اپنے مفہوم کو الفاظ کا جامہ پہنائیں۔ دولہن اپنے پندار میں گویا ان کا مطلب سمجھ گئیں اور کہا۔

"آپ اماں جان کو دیکھ رہے ہیں بابا؟ وہ۔ وہ وہاں ہیں اُدھر گودام کی جانب جنس نکلواتی ملیں گی۔"

لیکن بڑے میاں اور بھی زیادہ دولہن کے قریب کو آگئے اور بڑی بی بی کے نام پر کچھ خائف سے ہو کر بچّوں کی طرح کے مخصوص انداز میں موکھ پھیلایا اور پھر پھیلا ہوا موکھ اپنی مٹھی سے بند کر لیا اور پھر سرگوشی میں کہا۔

" دولہن بی بی ہمیں۔ تم — تم سے کام ہے — اور دیکھو دولہن تم بی بی سے کہنا مت اچھا! اور نہ منّے سے نہ ننھے سے نہ رضیہ سے نہ ساجدہ سے کسی سے بھی نہیں — اچھا دیکھو۔"

"آپ ارشاد فرمائیں۔ میں بی بی سے کیوں کہنے لگی۔"

"نہیں بی بی سے بھی نہیں اور منّے سے بھی نہیں۔"

بڑے میاں نے خائف ہو کر کہا اور دولہن نے ان کے منھ سے بات لے کر کہا۔

"آپ فرمائیں تو میں کسی سے بھی نہیں کہوں گی۔"

"ہاں میری اچھی دولہن! کسی سے بھی نہیں۔" اور پھر ادھر اُدھر دیکھ کر اور خوب اطمینان کر کے کہ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اپنی پانچ ہزار روپیہ ماہوار کی آمدنی میں سے پانچ روپیہ عمر میں پہلی مرتبہ طلب کیے اور اس عاجزی کے ساتھ جیسے کوئی بچہ اپنی بساط سے زیادہ مطالبہ کرتا ہے۔ ان کے مانگنے کا یہ انداز دیکھ کر دلہن کا دل بہت متاثر ہو گیا ایک مرتبہ کچھ تاسف اور رحم کے انداز میں کہا۔

"کیا کیجیے گا ایں!"

اور پھر بغیر جواب لیے ہوئے اندر چلی گئیں اور پانچ روپیہ لاکر خسر کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور بڑے میاں نے مٹھی خوب مضبوط کر کے بھینچ لی۔ اور پھر خوف سے ادھر اُدھر دیکھا اور آہستہ سے ایک کلکاری ماری اور تیز تیز قدم ڈالتے ڈیوڑھی کی جانب لپکے اور دولہن بچاری کو عمر میں پہلی مرتبہ خُسر سے بات کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا جب تک وہ ڈیوڑھی میں دالان در دالان اور صحن پار کر کے دوڑے اور لپکنے کی درمیانی چال چلنے سے نہ گئے وہ برابر تماشہ دیکھتی رہی اور بجائے محظوظ ہونے کے کچھ متاسف سی ہوگئی۔

اور یہاں تک کہ وہ دن بھی آگیا کہ بڑے میاں کا یہ سوال کہ ہاں بھیا فقیرا تو پھر کب لے چلوگے ہمیں ریوڑیوں کا کھیت دکھانے !؟ ایک معمہ بن گیا اور جوں جوں وقت گزرتا گیا ناقابلِ حل بنتا گیا۔

پہلی مرتبہ پانچ روپیہ منگانے کے بعد فقیرا نے خیال کیا تھا کہ بڑے میاں ریوڑیوں کی کاشت کو بھول جائیں گے اور بھول بھی جاتے مگر فقیرا نے تین مہینے کی اندر برابر آبپاشی کے خرچ کے لیے (کیوں کہ ریوڑیوں کے کھیت کی آبپاشی بتاشوں کے شربت سے ہوتی ہے) دو مرتبہ پانچ پانچ روپیہ کی رقم منگائی اور ایک مرتبہ پانچ روپیہ نرائی گڑائی کے لیے منگائے۔

غرض تین مہینے میں پندرہ روپیہ اور کھا گئے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ بڑے میاں کی آتشِ شوق پر پھونکیں لگتی رہیں اور اپنی ریوڑی کی کاشت کو دیکھنے کا شوق تیز تر ہوتا گیا۔ شروع شروع میں بڑے میاں نے جب کھیت دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔

فقیرا یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ میاں ذرا جم کر سیدھا ہوئے۔ کھیت تو دکھانے لے جاؤں گا۔ یہاں تک اس وعدہ فردا پر بڑے میاں کی آتشِ شوق تیز ہوگئی کہ سوتے وقت کی لوری ملنے کے بعد اور میاں کو سلا کر انھیں اس مسئلہ پر اپنے بستر پہ آنکھیں بند کر کے غور کرنا پڑا۔ اور دو تین راتوں سوچنے کے بعد ایک صورت ذہن میں آئی اور صبح تڑکے فقیرا بڑے میاں کو رفع حاجت سے فارغ کرا کر اور مُنہ ہاتھ دھلا کر سیدھے پائیں باغ پہنچے اور دو تین کیاریوں میں نہایت سلیقہ کے ساتھ چٹکی سے مٹر کے دانے بوئے اور ہفتہ عشرہ بڑے میاں کو اور

ٹالے رہے اور جب مٹر کے دانے چار انگلی کے پودے بن گئے تو ایک روز صبح کے وقت بڑے میاں کو ریوڑیوں کے کھیت پر لا کر کھڑا کر دیا۔

بڑے میاں نے ریوڑیوں کا کھیت کیا دیکھا کشت زعفران دیکھ لی۔ خوب اچھلے خوب کودے کلکاریاں مار مار کر تالیاں بجائیں اور کھیت کے گرد کئی چکر لگا کر رقص کیا۔ اور ریوڑیوں کے نرم نرم شاداب اکھوؤں کو ایسی پیار کی نظر سے دیکھا جیسے وہ نوزائیدہ پوتا پوتی کو پیدائش سے عین بعد فوراً زچہ خانہ میں گھس کر دیکھا کرتے۔ تھے اور جس طرح اس کے نرم نرم چمک دار بالوں پر انھیں پیار آتا تھا اور وہ جھک جایا کر۔ تے تھے۔ اسی طرح نرم نرم مٹر کے پتوں پر دو زانوں ہو کر اور سر بالکل قریب۔ لے جا کر دیکھنے لگے اور ڈنٹھل پکڑ پکڑ کر اور کلکاریاں مارتی آواز میں بولے۔

"اور فقیرا! دیکھو یہاں پر! یہاں پر لگیں گی ریوڑیاں۔ اچھی اچھی! میٹھی میٹھی"! اور پھر خوشی کے مارے آہستہ آہستہ ہنسنے لگے اور ہنستے ہوئے بولے۔ "اور ہم توڑ توڑ کر کھائیں گے۔ کیوں فقیرا؟ اور رفن بھی۔ اور ساجدہ اور رضیہ بھی اور ننھے بھی اور ہاں فقیرا تم! اور تم بھی۔"

"اور بابا منّے نہیں؟" فقیرا بولے۔

اور بڑے میاں قدرے بدمزہ ہو گئے اپنے مخالف منّے کے نام سے جیسے ریوڑی کی جگہ پانچ گرین والی گولی بڑے میاں کی زبان اور تالو کے درمیان رکھ دی۔

"اور وہ تو سب کی سب مانگے گا۔ بدمعاش بی بی سے کہہ لوں گا۔"

"نہیں میاں کہاں تک کھائے گا۔ بڑی ریوڑیاں ہوں گی ۔۔ ڈھیر سی۔" فقیرا نے کہا۔

اور بڑے میاں جانتے تھے کہ کھیت میں تو ڈھیر کے ڈھیر، ارد کے ڈھیر باجرے کے ڈھیر اور اب! اب ریوڑیوں کے ڈھیر ہوں گے۔ کہاں تک کھائے گا منّے بدمعاش۔ کچھ لکھمل حلوائی کی دکان کی تو نہ ہوں گی ریوڑیاں جو دو دو کھائی جایا کریں، وہ تو مٹھیاں بھر بھر کھائی جائیں گی۔" اور بڑے میاں ہونٹ چاٹنے لگے۔

اسی لیل و نہار میں جاگتی آنکھوں کا شیریں خواب دیکھتے میں دو بار کے اوسط سے بڑے میاں اپنی ریوڑیوں کی کشت زار سے آنکھوں کو تراوٹ بخشتے۔ ڈیڑھ مہینے گزر گیا۔ اور کیاریاں مٹر کی نرم نرم بیل سے بالکل ڈھک گئیں اور ایک روز جب ہفتہ بھر بعد علی الصبح بڑے میاں فقیرا کے ساتھ کھیت پر پہنچے تو دور سے دیکھ کر بڑے زور سے چلّا پڑے۔

"ارے بھیا فقیرا! ریوڑیاں لگ گئیں۔ کھیت میں!!"

اور پوری کیاری سفید سفید پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی جو ریوڑیاں معلوم ہو رہے تھے۔

"نہیں میاں ابھی ریوڑیاں نہیں ابھی تو ریوڑیوں کے پھول کھلے ہیں"۔ فقیرا نے کہا۔

اور بڑے میاں کچھ کچھ پھول پھل کا رشتہ جانتے تھے بولے۔

"اور پھر! ریوڑیاں لگ جائیں گی؟"

ریوڑیاں لگنے کے شیریں اشتیاق میں بڑے میاں کھیت کے گرد ناچنے سے لگے۔ انھوں نے خیال کیا کہ جب گیہوں اور چنے کے ڈھیر کی طرح گودام کے صحن میں ریوڑیوں کا بڑا ڈھیر ہوگا اور سب۔ اس ڈھیر کے گرد کھڑے ریوڑیاں کھاتے ہوں گے۔

انھیں شہر پر منّے کا خیال آتا سب ڈھیر مانگے گا۔ بڑے میاں نے ایسی پر اشتیاق اور میٹھی نظروں سے دیکھا کہ ان کے منھ میں شکر سی گھلی دکھائی دینے لگی مگر فقیرا نے جیسے چرائتہ کے خاندہ کا گھونٹ سا پیا۔

اور بڑے میاں نے بغیر ہاتھ لگائے اس بچّہ کی طرح جو اپنے محبوب کھلونے کو بغیر ہاتھ لگائے دور سے دیکھتا ہے اور اسے چھونا اس کی محبوبیت کے منافی سمجھتا ہے چاروں مینڈ پر گھوم گھوم کر اور جھک جھک کر دیکھنا شروع کیا۔ اور پھر کھلکھلا کر یک دم میاں جی اٹھے اور یک دم حیرت و اشتیاق کی ایک چیخ کی قسم کی آواز ان کے مُنھ سے نکلی۔

"ارے بھیّا فقیرا! فقیرا!! یہ ریوڑیوں کے کھیت میں مٹر کی پھلی لگتی

ہے کیا !!! ؟"

اور بڑے میاں فن زراعت سے اتنے واقف تھے کہ مٹر کی پھلی کو پہچانتے تھے اور پھر مختلف زادیوں سے سفید سفید پھولوں کی پھوار کے نیچے ہرے ہرے ڈنٹھل میں ایک کچی نوزائیدہ مٹر کی پھلی لٹکتی فقیرا کو دکھائی اور فقیرا گہری سوچ میں پڑ گئے اور دوسری نگاہ میں اس نے چند پھلیاں اور دیکھیں اور بڑے میاں نے پھر کہا۔

" فقیرا! کیا ریوڑیوں کے کھیت میں مٹر کی پھلیاں لگتی ہیں"۔

اور اس سوال کے جواب میں فقیرا نے مٹھار کر آہستہ سے کہا۔ ہاں میاں مٹر کی پھلیاں لگتی ہیں، ریوڑیوں کے کھیت میں" اور یہ کہہ کر میاں کی اُنگلی پکڑے آہستہ آہستہ چل پڑا۔

اور جب رات کو فقیرا بڑے میاں کو سلا کر خود گرم گرم لحاف میں پاؤں پھیلا کر اپنے بستر میں لیٹے تو سوچتے سوچتے انھوں نے لحاف میں مُنھ ڈھانک لیا اور ریوڑیوں کی ہری بھری کیاری کراس درۂ دانیال کے نقشہ کی طرح ان کے سامنے آگئی۔ اور اسے اپنی اس بساط کا مستقبل اس تاریکی سے کہیں زیادہ تاریک تر دکھائی دیا۔ بھلا وہ کرے گا کیا! ؟ آیندہ اس بوڑھے بچے سے یہ راز کیوں کر چھپے گا۔ اور بس ہفتہ بھر کے اندر ہی اندر یہ ریوڑیوں کا کھیت مٹر کی ہری ہری پھلیوں سے بھر جائے گا۔ اور جس آقا سے آج تک ڈر نہ معلوم ہوا تھا وہ اس سے شدومد کے ساتھ جواب طلب کر رہا تھا کہ" ریوڑیوں کے کھیت میں مٹر کی پھلیاں کیوں لگیں ؟" اور ریوڑیوں کا کھیت اسے کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ سفید سفید دانت دکھا کر اور جب یہ سفید سفید پھول بھوری بھوری مٹر کی پھلیوں میں بدل جائیں گے!! تو بھیڑیئے کی سی کچلیاں اس پر کھونسیا اُٹھتیں۔

اور اب بڑے میاں کا اشتیاق اور فقیرا کا انتظار اخیر منزل کی اخیرترین حد تک پہنچ چکا تھا اور وہ بجز اس کے کہ آنے والے خطرے سے جب تک بچے رہیں اور پردہ ڈالے رہیں اور کسی قطعی نتیجہ پر پہنچ سکیں اور ہفتہ بھر تک بڑے میاں کے اشتیاق کو پوری قوت سے دباتے رہے۔ اور دھینگا مشتی سی کر کے بڑے میاں کو ریوڑیوں کے کھیت پر نہ پہنچنے دیا پھر بھی وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ اس آنے والے ناگزیر خطرہ سے

کیوں کر دو چار ہوا؟ جو بندہ یا بندہ!۔

اور ہفتہ بھر سوچتے سوچتے ایک رات گرم گرم لحاف میں لیٹے لیٹے فقیرا نے اپنا مددگار تلاش کر لیا۔ مرض رہے نہ مریض ۔ مگر مریض کو ختم کرنے کے نتائج کی شدت اس کے دماغ میں اتنی اہم نہ آئی تھی جتنی ثابت ہوئی اور جو مٹر کے دانے عالمِ خیال میں بندوق کی گولیوں کی طرح سنسناتے اپنے کانوں کے گرد سنائی دیتے تھے وہ رفتہ رفتہ گرم گرم اندھیری میں حل ہو گئے۔ گویا مسئلہ حل ہو گیا اور فقیرا کی نگاہ میں اس کا ممد و معاون بھیں بھیں کرتا چکی کا پاٹ لٹکائے اس مسئلہ کا حل کرنے والا سفید نرم نرم دوست گھومنے لگا۔

ماجد میاں کا دنبہ! جو وہ سال کے سال عید الضحیٰ پر خریدا کرتے تھے اور ایک سال تک صرف دانا کھلا کر اس کے اندر چربی اور گوشت کی تخلیق کرتے رہتے تھے اور ایک سال پال کر عید الضحیٰ پر اپنے نام کی قربانی پر ذبح کر دیتے تھے۔ سب بچّے ماجد میاں کے اس دنبہ کو بھیں کے نام سے پکارا کرتے تھے اس کی آواز کی مناسبت اور کچھ بچوں کے پکارنے کی وجہ سے اور سب لوگ بھی بھیں کہتے تھے۔

علی الصبح بڑے میاں کو بستر پر سوتا چھوڑ کر فقیرا سیدھے مویشی خانہ کی جانب گئے اور وہاں سے دنبہ ہانک کر پائیں باغ کی جانب لے گئے اور ریوڑیوں کے کھیت پر چھوڑ دیا۔ دانہ اور چرند یوں بھی سبز چارے پر جان دیتا ہے پھر شاداب مٹر کا نرم چارہ! آن کی آن میں بڈھے کی کشتِ اُمید صاف کر دی، یہ خیال کر کے کہ ریوڑیوں کے کھیت کے ساتھ بڑے میاں کا ریوڑی کی کاشت کا اشتیاق بھی ختم ہو چکا تھا۔ وہ نہایت اطمینان کے ساتھ آہستہ آہستہ سہ دری کی جانب چلے اور جس وقت پھاٹک پر پہنچے تو انھوں نے غور کیا کہ بڑے میاں جاگ گئے ہیں اور بجائے لیٹے ہونے کے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئے ہیں اور دونوں ہتھیلیوں سے آنکھیں مل رہے ہیں اور "متّی" (پیشاب) کرانے کے لیے فقیرا کے منتظر ہیں۔ فقیرا نے صحن ہی میں سے منہ بسورنا شروع کر دیا، اور برآمدہ میں پہنچ کر آہستہ آہستہ رونا شروع کر دیا فقیرا کو روتے دیکھ کر بڑے میاں نے برجستہ رونا شروع کر دیا اور فقیرا نے بھرائی آواز میں کہا۔

"میاں غضب ہو گیا!"

غضب ہو جانے پر بڑے میاں کی چیخ نکل گئی۔

"کیا غضب ہو گیا!"

اور فقیرا نے دوڑ کر بڑے میاں کے ہونٹ اپنی مٹھی میں دبا لئے۔ اور کہا۔

"ہیں میاں ہیں! رونا مت! چپکے رہیے آپ! وہ تو پھر ہو جائے گا پھر، ہیں میرے میاں کا ریوڑیوں کا کھیت!! — وہ تو پھر ہو جائے گا ہوں" —

اور وہ بڑے میاں کو تھپکنے لگا، تھپکتے تھپکتے لوری پر آگیا مگر بڑے میاں بدستور سسکیاں بھرتے رہے اور جب ذرا سکون ہوا تو فقیرا سے کہا۔

"وہ ریوڑیوں کا کھیت چھوٹے میاں کی بھیں سب کھا گئی!"

"اور ہوں۔ میرے میاں کا کھیت پھر ہو جائے گا۔"

"ہائے سب کھا گئی۔ میرا کھیت! — ہائے!!"

اور معصوم بڈھے کی آنکھوں کے آگے اس کی ہری بھری کھیتی کی بربادی کا منظر آگیا۔ اور بڑے میاں چارپائی پر لوٹتے لوٹتے ایک ترنگ میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

فقیرا نے ہر چند روکا، بہتیرا "ہیں! ہیں!!" کر کے پکڑنا چاہا، ہونٹوں کو بھینچنا چاہا، چمکارا، مگر وہ چل ہی پڑے اور جب سرکے تو فقیرا نے پیچھے سے ایک تھپکی دی۔ نہیں نہیں میاں نہیں کھایا ہے، ریوڑیوں کا کھیت نہیں۔ ہے۔"

لیکن دیوانہ را ہوئے بس است! وہ چیختے روتے دھاڑیں مارتے اندر صحن خانہ میں دکھائی دیئے۔ اور اندر بچے چاروں طرف سے آنکھیں ملتے بستروں سے اُٹھ اُٹھ کر ان کے گرد جمع ہو گئے۔ باہر سے رفن دوڑا اور بولا بس منّے کی بدمعاشی ہوگی۔"

"مگر منّے! منّے تو ابھی اٹھا بھی نہیں ہے بچارہ۔" کوئی بچہ بول پڑا۔

"تو رضیہ نے منھ چڑا دیا ہوگا۔"

"ارے، رے، رے — اوں — آں — واہ، واہ — میں تو ابھی سو رہی تھی —"

بی رضیہ میمیا پڑیں۔

مگر بڑی بی بی کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ مہینہ میں دو تین مرتبہ اس قسم کے معاملات بڑے میاں سے کرپہنچ کرتے تھے۔ البتہ بڑی بی بی کا ماتھا اس وقت کی نالش پر ٹھنکا کیوں کہ بچے تو ابھی بستروں سے اٹھ کر سیدھے بھی نہ ہوئے تھے اور منّے ان کا خاص حریف تھا وہ تو انھیں کے بستر پر سوتا تھا اور سب بچے بھی بڑے میاں کو تعجب سے دیکھ رہے تھے۔

رفن بھی گو مگو میں تھا کہ معاملہ کیا ہے آخر!

بڑی بی قریب آگئیں اور سب گھر کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس ہائے وائے کے درمیان بڑے میاں نے بجائے منّے، رضیہ ننھے کے ماجد میاں کا نام لیا اور یہ نالش آج پورے اٹھارہ سال بعد گزری تھی۔

ماجد میاں اور بڑے میاں کے درمیان لڑائیاں ہوئیں تھیں جو منّے اور رضیہ نے توریت میں پائیں تھیں اور سب مستورات حتیٰ کہ دلہن تک بڑے میاں کے اس نئے ملزم کا نام سن کر حالات کرنے کے لیے ہمہ تن گوش ہوگئیں۔

"ایں ماجد میاں! ماجد میاں نے کیا کیا؟ خیر تو ہے؟ منّے سے ماجد میاں پہ جا چڑھے!" بڑی بی بی نے طنز یہ کہا۔

اور بڑے میاں نے دہاڑ ماری — "ہاں ماجد میاں کی۔ ماجد میاں کی!!— ماجد میاں کی بھیں نے میرا سارا ریوڑیوں کا کھیت کھالیا۔ اس کی بھیں حلال ہو— اس کی بھیں کا جنازہ جائے — آں۔آں۔آں۔ ہو ہو" اور زمین پر لوٹنے لگے۔

ریوڑیوں کے کھیت کے نام پر مستورات مستفسرانہ انداز میں چونک چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں اور بچوں میں ریوڑیوں کے کھیت جیسی شیریں کاشت کی بربادی کا حال سن کر ایک عجیب ناکام اشتیاق کی لہر دوڑ گئی۔ اور بڑے بڑے اونچے بیل گاڑیوں میں ریوڑیاں بھری نگاہوں میں گھوم گئیں۔ جیسے غلّہ کی گاڑیاں دیہات سے بھر بھر کر گودام کو آیا کرتی تھیں آہاہا! اسی طرح ریوڑیوں کی گاڑیاں — !! آہاہا!!!

ریوڑیوں کی سنجاریاں ۔۔۔! مزدور ۔ چمار ۔ چماریاں ۔ گاڑیوں میں سے ڈلیاں بھر بھر کر ریوڑیوں کی سنجاریوں میں ڈالتے ہوئے ۔ ننھی ننھی ۔ منّے منّے چمکدار سفید موتی لگی ریوڑیاں ! دھوپ میں چمکتی ہوئی سفید ریوڑیوں کا یہ بڑا ڈھیر سوکھتا ہوا ۔ اور غلّہ گودام کے میدان میں انھوں نے اسے معصوم تصور میں غلّہ کی طرح ریوڑیوں کے ڈھیر کا خیال کیا تو ریوڑیوں کے کھیت کی بربادی پر ان کے چھوٹے چھوٹے کلیجوں پر سانپ سا لوٹ گیا ۔ ریوڑیوں کی پوٹلی بھلا پوٹلی میں کتنی سی ہوتی ہیں ، بکھر مل ذرا سی دیتا ہے اور دو دو حصّہ میں پڑتی ہیں اور زبان اور تالو سے کھائی جاتی ہیں اور انھوں نے خیال کیا کہ اگر ریوڑیوں کا کھیت بھیں نہ کھا جاتی تو ریوڑیوں کی مٹھیاں بھر بھر چباتے اور پھر ریوڑیوں کے ڈھیر پر چڑھ کر لوٹیں لگاتے اور زمیندار و کاشت کار پیشہ ماں باپ کے بچے اپنی فکر و استعداد کے مطابق ریوڑیوں کے کھیت کی فصل کا اندازہ لگا رہے تھے اور کھیتوں سے تو سال بھر ہر چیز آیا کرتی ہے ۔" انھوں نے خیال کیا اگر یہ منحوس دنبہ سب کھیت نہ کھا جاتا تو ریوڑیاں بھی گاڑیاں بھر بھر گودام میں آتیں ۔

اور بڑے میاں چلّا چلّا کر رٹ لگانے پڑے تھے کہ " ہائے میرا ریوڑیوں کا سب کھیت اس مکے ماجد میاں کی بھیں چر گئی "

دولہن مسکرا کر ایک جانب چلی گئیں اور گھر میں ہر فرد بشر متعجب رہ گیا اور بڑی بی بی کے استفسار پر میاں نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا ۔

" پہلے میں نے دس گنڈے پیسے روز دیئے اور پھر پانچ روپیہ دولہن سے لے چپکے چپکے ۔۔۔ تو ریوڑیوں کے کھیت کا بیج آیا ۔ اونہوں ہوں ۔ اوں ۔ اوں سبوں اور زز پھر چپکے سے پانچ روپیہ دولہن سے اور مانگ کر لے گیا تو پھر کھیت کو پانی لگا ۔۔ اور فقیرا نے ریوڑیوں کا ہرا بھرا کھیت بنایا ۔ وہاں ، وہاں ، باغ میں ۔۔ اور میں نے (انگلیوں سے موٹائی بتاتے ہوئے) اتنے بہت سے پیسے دیئے اور پانچ روپیہ دولہن نے دیئے تو ریوڑیوں کے کھیت میں وہاں باغ میں اور سسکیاں لیتے دھاڑ ماری اور کہا ۔

" اور پھر پھر سب کھا گئی اس کی ماجد میاں کی بھیں میرا ریوڑیوں کا کھیت ہرا بھرا ۔۔ "

دلہن تو شروع ہی میں سمجھ گئی۔ مغلانی بی اور بڑی بی بی کو سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ دولہن نے دو لفظوں میں بڑے میاں کا مفہوم صاف کر دیا۔

"میں جانتی تھی کہ فقیرا انھیں ایک مدت سے ٹھگ رہا ہے۔ مگر میں مجبور تھی بزرگ کی عظمت اور ان کا طرز اس چیز کے منافی تھا کہ میں راز فاش کر کے ان کی دل شکنی کروں۔"

اور بڑی بی بی نے کہا۔" ہاں میاں یہ بتاؤ کہ فقیرا نے آپ سے روپیہ منگا کر ریوڑیوں کا کھیت بویا تھا۔"

"ہاں۔" بڑے میاں نے کہا اور شہادت کے لیے دولہن کی جانب دیکھا۔ "پہلے روز میں نے روز پیسے دیئے پھر سب سے چھپ کے فقیرا کو چپکے چپکے روز دیتا رہا۔ اور پھر دولہن سے بیج کے لیے پانچ روپے لیے اور پھر پانی دینے کے لیے پانچ روپے بتاشے لانے کو فقیرا کو دیئے۔ اور بڑی بی نے دلہن کی جانب قدرے خشک اور مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھا دولہن نے کہا۔

"جی ہیں نے عرض کیا نہیں۔ میں نے روپے دیئے وہ کیسے ہی ہوں میرے لیے واجب التعظیم ہیں انھوں نے ساری عمر میں مجھ سے استدعا کرتے ہوئے انداز میں یہی دو کلمے کہے تھے۔ ساتھ ہی اُسے پردہ راز میں رکھنے کی بھی ہدایت کی تھی پھر میں کیسے نہ دیتی اور کیوں کر آپ سب پر ظاہر کر سکتی تھی۔"

اور پھر بڑے میاں نے اپنے ریوڑیوں کے کھیت کو یاد کر کے پورے پورے زور سے دہاڑ ماری ۔" ہائے میرا کھیت، میرا ریوڑیوں کا کھیت! اس ماجد میاں کی بھیں نے سب کھالیا۔"

بڑی بی کے تیور زہریلے ہو گئے اور انھوں نے ماجد میاں کو طلب کیا۔

ماجد میاں گھر میں داخل ہوئے۔ اور بڑے میاں نے بیٹے کی جانب اشارہ کر کے بڑے زور سے دھاڑ مارتے ہوئے کہا۔

"ارے۔ رے۔ رے!! اس کی بھیں نے سب کھا یا ہے۔ میرا ریوڑیوں کا کھیت کھایا ہے۔"

اور منّے دوڑ کر باپ کی ٹانگوں سے جا کر ٹکراتا سا بھڑ گیا۔ " ہوں ابّا جان آپ کی بھیس نے ہمارا ہاں بابا کا ریوڑیوں کا کھیت کیسے کھایا بولو— بولو— بولو۔ بتاؤ۔"

اور ماجد میاں بچّے کو ٹانگوں سے علیحدہ کر کے ماں سے متوجہ ہوئے کہ رقیہ بول پڑی۔

" اوں — آں — اونہوں!! ابا جان — آپ کی بھیس آئی بڑی وہ بن کر۔ کیوں کھا لیا ہمارے بابا کا سب ریوڑیوں کا ہرا بھرا کھیت؟ — بتائیے۔ آپ — اللہ کرے آپ کی بھیس مرے گلا کٹے۔"

"کیا — کیا ہوا امّی جان —" ماجد میاں نے ماحول سے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ مگر اپنی ماں کے تیور دیکھ کر وہ کچھ تھرا سا اٹھا۔

آج آثار بلا کے شدید تھے۔ انھوں نے بس نفرت و حقارت کے ملے جلے انداز میں کہا۔" ارے ماجد! تجھے ڈوبنے کو کہیں چلو بھر پانی مٹ گیا۔ تو اپنی نگوڑی گرہستی اور دنیا داری میں ایسا مصروف ہے کہ کبھی ادھر رُخ نہیں کرتا۔ تجھے معلوم ہے تو برادری اور کنبہ پرور ی میں کسی کے برابر کا نہیں رہا آج تیری ناک اتنی کٹ گئی ہے۔ تیری ڈیوڑی کے کتے تیرے باپ کو تُوتُو بناتے ہیں۔"

رضیہ بد۔ تور ترچھی ترچھی سی ہوئی تھی اور منّے جوں کا توں ٹانگوں پر ٹھر ٹھر کر جواب طلب کر رہا تھا۔ " تو ابا جان نے کیوں پالی تھیں بھیس؟ گلا کاٹ کر حلال کیوں نہیں کی تھیں بھیس؟ — پھر ہمارا بابا والا ریوڑیوں کا کھیت کیوں کھا جاتی آپ کی بھیس؟"

اور بڑی بی بی میاں کو تسکین دے کر ایک ہوشیار وکیل کی طرح لیڈنگ قسم کے سوالات کر کر کے بڑے میاں کا کل بیان بیٹے کے سامنے کرا کر ریوڑیوں کے کھیت کے متعلق پوست کنندہ حالات ظاہر کرا دیے۔ اور فسانہ کے اختتام پر بڑے میاں نے دہاڑ ماری اور بولے۔

" ہاں پھر تیری بھیس نے سب کھا لیا۔ میرا ہرا بھرا کھیت۔"

اور سب بچّے حسرت کے ساتھ منہ بسورنے لگے اور سخت شاکی نظروں سے

ماجد میاں کی جانب دیکھنے لگے۔ ریوڑیاں بچوں کے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی چیز تھیں اور اس کی کاشت ان کی اپنی ملکیت تھی جس کی تباہی خاص انھیں کا نقصان تھا اور گھر بھر میں کسی اور کا نہیں۔

بچے اپنی اپنی جگہ پر بل سا کھا رہے تھے اور ماجد میاں اپنی جگہ پر پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے۔ انھوں نے آہستہ سے ایک غوں سی نکالی اور زیر لب کہا۔ ہوں فقیرا حرامی بچے کو رنمک کی یہ ہمّت! آج مزہ چکھا دوں گا سور کے بچّے کو۔" اور بڑے میاں اور سب بچوں کو کچھ کچھ پتہ لگا کہ ریوڑیوں کے کھیت کی رکھوالی فقیرا نے نہیں کی اس لیے بھیں چر گئی اور فقیرا کی غفلت سے یہ ریوڑیوں کی کھیتی برباد ہو گئی۔ اور ماجد میاں اینڈتے بل کھاتے باہر چلے اور بڑے میاں اپنی ذرّیات کے درمیان ساتھ ساتھ چلے۔

سب بچے بڑے میاں کو ایک خاص ہمدردی اور ایک دلی کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے کسی عزیز بچّے کا فٹ بال یا گیند بلا کسی قسم کا نیچا ہی کھلونا ٹوٹ جائے جو ملکیت تو اس کی ہو مگر کھیلتے اس سے سب مل کر ہوں۔ اور اب ان کی سمجھ میں کچھ اس قسم کی چیز آگئی تھی کہ فقیرا بدمعاش نے بابا کا سب ریوڑیوں کا کھیت بھیں کو چرا دیا تھا اور بچوں کے سامنے ماجد میاں کے فارم کی چوریوں کے سلسلہ میں سزائیں آئے دن کی بات تھیں۔

اور باہر پہنچ کر ماجد میاں نے خشونت آمیز بھرائی بھرائی سی آواز میں کہا۔

"کوئی ہے — ! مولا خاں کو بلاؤ۔"

اور اب سے ہزار سال پیشتر پرانی حکومت کی یادگار مولا خاں سامنے آئے۔ ایک روایتی قسم کی چیز! نیلا تہمد باندھے اور میل خوری ہی بنڈی پہنے، چہرے پر جبر و حکومت کے شرارے سے چھٹتے ہوئے اور چال میں تکبّر کا نشہ۔ محمّد تغلق کے زمانے سے آپ کی روایاتی تاریخ ملتی تھی جب آپ کے جد امجد جلّادی کی خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ اب بیسویں صدی کے وسط میں جب ساونتی دور کا انحطاط ہو گیا تھا مولا خاں بھی گھٹ کر صرف جمعدار ہو گئے تھے اور ان کی ڈیوٹی تقرر و سزا و قصاص کے شعبہ میں ماجد میاں

اور ان کے کارندوں کے احکام کی لفظ بہ لفظ تعمیل تھی یہاں تک کہ جب کسی سرکش کاشتکار کو سزا دیتے ہوئے ماجد میاں یا ان کا مختار عام اپنی عاملی حرکت کی منتہائے بلندیوں پر پہنچ کر منھ میں پیشاب کرنے کا حکم دیتے تو خواہ اسٹاک میں ہو یا نہ ہو۔ مگر وہ چلّو بھر آمد کر کے جوتی میں بھر لیتے اور ایک ہاتھ میں مجرم کی گردن ہوتی۔ دوسرے میں وہ جوتی اور ماجد میاں کے حکم کی غٹا غٹ تعمیل۔

"ذرا فقیرا نمک حرام کو لاؤ پکڑ کر۔" ماجد میاں نے کہا۔

اور سہ دری کی جانب سے مولا خاں جمعدار نے کانپتے تھرتھراتے فقیرا کو گھسیٹتے ہوئے پیش کیا۔

پٹھان کا پوت، گھڑی میں اولیا گھڑی میں بھوت! — ماجد میاں بھوت چھوڑ پورے آسیب بن گئے۔ کھسیانے چبتے والے انداز سے کہا "باندھ تو ذرا نیم سے اس سور کے بچے کو اور لاؤ میرا پولو کا ہنٹر"۔

ایک ملازم دوڑ کر اصطبل سے ہنٹر اٹھا کر لایا ادھر مولا خاں نے مخصوص زمینداروں کے مجرموں والے انداز میں نیم کے تنے سے سینہ اور پیٹ جھکا کر سر سے لے کر پاؤں تک مونجھ کی رسی سے کس دیا۔ اور سب کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب ماجد میاں نے بجائے حکم دینے کے ہنٹر بہ نفس نفیس خود ہاتھ میں لیا۔ جاگیر دار بچوں کو زبان دراز دست کوتاہ کی تعلیم دی جاتی ہے مگر آج اپنی روایات کے بالکل خلاف ماجد میاں کا دست دراز تھا اور زبان خاموش اور ایک ہی تنتراتے میں گھوڑوں کو کہربائی انداز میں بھڑکانے والا ہنٹر ماجد میاں کے ہاتھ سے بار بار شڑاشڑ۔ تڑاق۔ تڑاق۔ شرق۔ تڑاشڑ۔ تڑپ تڑپ کے فقیرا کی مضبوط چبوترہ پیٹھ پر پڑ رہا تھا۔ اور فقیرا کی پیٹھ کی کھال ہنٹر ٹُرّی میں لپٹ رہی تھی۔ یہاں تک کہ ہنٹر کی ٹرّی ہوا میں گرہ کی طرح اڑنے لگی اور فقیر کی کھال اور پھر گوشت اور اعصاب کی دھجیاں دھواں سا بن کر اڑنے لگیں اور بارہ گرہ ولایتی پائپ بھاپ گوشت پوست کے تصادم سے ہنٹر ہوا میں زائل ہو گئی، اور ماجد میاں کے ہاتھ میں صرف ڈیڑھ بالشت کا دستہ رہ گیا۔

فقیرا بری طرح چلا رہے تھے۔ ہر ضرب پر ماجد میاں کا غصّہ تیز تر ہو رہا تھا۔ ملازم دم بخود تھے۔ اور بڑے میاں بچوں کے غول میں کھڑے سب بچوں کے ساتھ تالیاں بجا رہے تھے۔ کیا بد معاش نے سب ریوڑیوں کا کھیت کھلا دیا بھیں کو رکھوالی نہیں کی۔

اور رضیہ بولی۔ "اور ابھی کیا ہے بھیں بھی گلا کٹ کر حلال ہو گی"۔

"ہاں تو مزہ آئے گا بھیں کو ریوڑیوں کے کھیت کھانے کا" سب بچوں نے تالیاں بجا کر کہا اور بڑے میاں کلکاری مار اٹھے۔

۱۹۵۲ء

شکار گاہ سے

کیمپ دراب نگر - ضلع بدایوں

۱۵ر دسمبر ۱۹۵۲ء

پیارے، سلام محبت!

تمہارا پہلا مکتوب ملا تھا جس کا جواب دے کر میں شکار کو چلا آیا تھا اور دوسرا مجھے آج اخبار کے ساتھ یہاں بھیجا گیا ہے۔ تم نے اپنے پہلے خط میں رسالہ کے لیے کہانی مانگی ہے اور اس میں شدید یاد دہانی ہے۔ خیر کہانی تو سبھی مانگتے ہیں' اس امید میں کہ میں دیہاتی معاشرت پر کسان، زمیندار' ساہوکار کے مثلث، مساوی الساقین کے تکو نے میدان میں اپنے توسنِ قلم کو اناپ شناپ دوڑا کر کہیں پر ہنستا، کہیں پر روتا تڑپتا پھڑکتا، عجیب و سادہ و رنگین قسم کا متوازن افسانہ لکھ کر بھیج دوں گا۔ یا سرمایہ دار کی ہجو اور مزدور کا مرثیہ دونوں ایک جگہ جمع کر کے ایک عجیب قسم کا چوں چوں کا مربہ جیسا کھٹا میٹھا، میٹھا کڑوا بیک وقت سبھی کچھ لکھ کر بھیج دوں گا جس طرح مدتوں سے ہر کچی روشنائی سے نام نامی چھپا دیکھنے کا خواہشمند افسانہ نگار گھٹنوں چلتے ہی سرپٹ دوڑنے کی منزل پر پہنچنے کے لیے قلم سے بندر کی سی اضطراری حرکات کا مرتکب ہوتا ہے اور "انا الافسانہ نگار" کی بے ہنگام بانگ بلند کرتا ہے۔ یا اُدھر

کچھ دنوں قورمہ پلاؤ توس مکھن سے حلق تک پیٹ بھر کر ساڑھے سات سو میل پر بیٹھے ہی بیٹھے افسانہ نگاری کی دُوربین کے مشاہدہ سے بنگال کے بھوکوں کے پچکے پیٹ اور کھوکھلے سینے دیکھ کر اور کہانی گڑھت، کے ٹیلیفون پر تلنگانہ کے جانبازوں کے انقلابی نعرے سُن کر داستان گوئی کے ستار پر ایک سری کمنسری کہانی الاپ دوں۔ یا پھر جب راس کماری سے نندا دیوی تک سارا براعظم جل رہا تھا تو بھیا سہیل تم نے سُنا ہوگا کہ کسی کا گھر جلے اور کوئی تاپے! اس بھٹی میں سے گرم گرم لوہا نکال کر اور کاغذ قلم کی بنائی ہتھوڑی پر جلدی جلدی پیٹ کر ایک برابر وزن کے دو باٹ گھڑوں، اور میزانِ عدل کی ڈنڈی پکڑ کر افسانہ نگاری کے تخت پر شہنشاہِ عالم الغیب بن کر بیٹھ جاؤں اور ہندو ظالموں اور مسلمان ظالموں کے درمیان اور ہندو مظلوموں کے مابین توازن قایم رکھتے ہوئے دونوں پلے بجا بجا کر ہر راگ کی تان پر ہندو مسلم اتحاد کی ٹانگ توڑتا رہوں اور اس طرح " TOPIC OF THE DAY " پر کہانیاں لکھ لکھ کر مدیرِ محترم کی بزرگانہ فرمایش اپنی طفلانہ کوششوں سے پوری کرتا رہوں۔ لیکن سہیل! مشینی دور میں باتیں بھی کچھ "سورج کی چال کے بجائے بجلی کی رفتار سے" نئی اور پُرانی ہوتی ہیں۔ کیا بتاؤں ایک کہانی شروع نہیں ہو پاتی اور پرانی ہو جاتی ہے اور ادھر کچھ دنوں سے زمانہ کی ٹکسال بھاپ، اور تیل اور بجلی کے بجائے ایٹم کے ذریعہ نئے نئے سکے ڈھالتی ہے اور " TOPIC OF THE DAY " صبح، دوپہر اور شام کے بھی ایٹمی ٹکڑے کر کے ہر نگاہ میں گرگٹ کے سے رنگ بدلتا ہے اور اب جبکہ ملک میں قتل لوٹ اور بھوک، صبح شام دوپہر کی طرح روزِ روشن کا جز دبن گئیں تو مدیرانِ گرامی کچھ اس قسم کا مطالبہ فرماتے ہیں کہ اپنا توسنِ قلم ایک اضطراری جست میں ہمالیہ کے اس پار پھندا دوں، اور ماسٹر صاحب سے ساتویں کلاس میں پڑھی ہوئی اور نقشے پر چیونٹے کی سی ٹانگوں کی طرح دیکھی ہوئی کوریا کی اس سرزمین پر کاغذی گھوڑے دوڑاؤں جس کی سطحِ مرتفع کو سُنتے ہیں کہ امریکن بردہ فروشوں نے اپنی آہنی ورزش کا اکھاڑہ بنا کر خاروں میں تبدیل کر دیا ہے، یا پھر فارموسا کی خلا بسیط میں منڈلاتے ہوئے چینی عقابوں اور امریکی گدھوں کی "دو دو چونچیں" دکھلاؤں اور اور کچھ نہیں تو چشموں کے تیل کی لاش اور سویز کے پانی کے جنازے پر ایران و مصر کی بازی گاہوں میں غرفش کرتے انگریزی کتوں اور امریکی بھیڑیوں کی SHAM FIGHT کے تماشہ

کا ڈرامہ لکھوں۔ غرض نہ سہی عینی مشاہدہ سے سُن سُن کر ہی افسانہ کا پلاؤ پکانے کے لیے یخنی چاول گھی وغیرہ سب جنسیں کرۂ ارض کا تماشہ دیکھ دیکھ کر کہیں نہ کہیں سے IMPORT کر دوں اور نمک مرچ پاس سے ملا ملا کر مدیرِ گرامی کے جریدہ کا "ھل من مزید" پکارتا چولھا گرم رکھوں اور سو گھر، اروں، ہزار ٹٹیاں پھاندوں ایڈیٹر صاحب کو ناشری اور اپنی ادبی بقائے حیات کے لیے خوراک بہم پہنچانے میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا رہوں۔

لیکن میاں سہیل تم بھی خوب جانتے ہو کہ تم تہذیب اس دور میں نکال رہے ہو جب نئی سے نئی چیز پُرانی ہو چکی ہے لہٰذا ایک پُرانے چابک دست قسم کے ایڈیٹر کی طرح بے چینی سے کام لیتے ہوئے موضوع کی فرمایش کر دی جو اتنا پُرانا ہے کہ جدید ترین معلوم ہوتا ہے اور اُردو کے لیے تو درحقیقت نیا ہی ہے اور نباض قسم کے ایڈیٹر اور گھاگھ قسم کے صحافی ہونے کے علاوہ اُلٹے سیدھے شکاری بھی معلوم ہوتے ہو یار! ورنہ شکاری کی نفسیات کے اتنے اچھے محرم نہ ہو سکتے تھے۔ اس وقت خوب جانتے ہو کہ جانچ تول کر نشانہ لگایا ہے بھرپور بھرا پڑے گا۔ سمجھتے ہو کہ امونیشن نایاب ہے، شوقین سے شوقین شکاری چھوٹا ہوا کارتوس بنا پڑا ہے۔ اور میں بھی بھرا بھر سیزن ہاتھ پر ہاتھ دھرے گھر بیٹھا رہوں گا ؎

وصل نہ سہی حسرت ہی سہی

شکار نہیں تو شکار پر کہانی ہی سہی! میری تحریک پر اور کچھ نہیں تو بگڑے شاعر کی طرح مرثیہ ہی لکھنے بیٹھ جائے گا۔ لہٰذا شکار کی فرمایش دے ماری، لیکن تمہارا خط بجائے اس کے کہ میرے دماغ میں افسانہ نگاری کی تحریک کرتا، دیوانہ را ہوئے بس است میرے خوابیدہ اعصاب میں کہربائی رو کی طرح گدگدی دوڑاتا چلا گیا اور میرے اندر جو شکاری کی سیلی ہوئی بارود دبی پڑی تھی اس پر چنگاری بن کر جا پڑا۔ اور تم نے یہ سمجھ کر کہ ایک فن کار جو کچھ مادی دُنیا میں نہیں پا سکتا وہ خیالی دنیا میں پا لیتا ہے۔

حالات کا اندازہ کر کے ادیب کی نفسیات سے کام لینے کے لیے شکاری افسانہ کی فرمایش کی تھی، یہ خیال کر کے کہ کہانی کی کہانی ہو جائے گی اور شکار کا شکار! بندوق سے نہ سہی قلم سے، میدان و جنگل میں نہ سہی گھر کے اندر کاغذ پر ہی ...... مگر یار تم نے فرمایش

کرتے وقت مجھ کو زرا شکاری ہی سمجھا اور یہ بھول گئے کہ میں ترقی پسند اور ترقی پسند بھی افسانہ نگار !
بغیر عہدۂ قضا کے پروانہ کے قطب شمالی سے قطب جنوبی تک ہر شہر کا قاضی بنا اندیشہ میں
گھلتا ہوا۔ اور شکار میں کہانی بجائے پارکر ۵۱ قلم کے خواہ ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ ہائی ولاسٹی
رائفل لے کر لکھی جائے۔ پھر بھی اندیشہ معلوم ہوتا ہے کہ رجعت پسند ہی رہے گی۔ کیوں کہ دہانہ
توپ سے وعظ کرنا تو کچھ قیصر جرمن کے ہی حصّہ میں آیا تھا اور اسٹالنِ اعظم تو پیامِ امن باندھ باندھ
کر کبوتر اڑاتے تھے۔ شکریے نہیں! اور شکاری کہانی لکھنے کی اختراع ہے انیسویں عیسوی کے
وسط کی جب انگریز اپنی قدیم شورلک اسپرٹ کے ہاتھوں جو رالارض کا شکار ہو کر مشرقی
مدنیت اور معاشرت پر سائنس کی ابتدائی صلاحیتوں اور بورژوا ذہنیت کی انتہائی
بلندیوں کے زور سے شراب دو آتشہ بن کر چڑھا تو نہ صرف اس نے انسانوں ہی کے اعصاب
اور دماغوں پر ہاتھ صاف کیا بلکہ ایشیا اور افریقہ کے جنگلی چوپایوں اور پرندوں پر بھی قابو
پا گیا اور قدیم طریقۂ شکار کو جو کول اور دراوڑے لے کر مغل دور تک تھوڑی بہت ترمیم تنسیخ
کے ساتھ رائج رہا تھا یکسر بدل دیا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے وسط میں شکار جیسے فروعی موضوعات
پر انگریز شکاریوں نے اپنے افریقہ اور برما کے جنگلوں کے شکاری مہمات پیش کیے جو اس
دور میں ہندوستان کے اندر بڑی دل چسپی کے ساتھ انگریزی دان طبقہ نے پڑھے ورنہ پرانے
زمانہ میں کوئی شہزادہ گھوڑے پر سوار ہرن کا تعاقب کرتا بیابان جنگل میں ساتھیوں سے بھٹک
کر سرِ شام کسی دہقان کی جھونپڑی پر بھوکا پیاسا پہنچا کرتا اور وہاں سے بالعموم اس دہقان کی پری
چہرہ، حور لقا لڑکی کو خطِ غلامی لکھ کر پلٹا کرتا اور اس طرح قصہ کی ہیروئن شکار کے طفیل اماں حوا
کی طرح کہانی کے ہیرو کی بائیں پسلی سے پیدا کرا کر داستان آگے بڑھائی جاتی اور پھر ساونتی کہانی
شروع ہوتی۔

اب ترقی پسندی کے حدود میں تو شکاری کہانی کسی صورت پھنستی نہیں کیوں کہ عام
طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ شکار کا شوق ٹھیٹ فیوڈل دور کی یادگار ہے اور ہمیشہ سے اونچے
طبقے میں اوقات کشی کا تفریحی مشغلہ رہا ہے اور میں خواہ سمجھتا نہ ہوں اور ممکن ہے کہ بدنصیبی سے
سمجھا بھی نہ جاتا ہوں مگر سوچتا پرولتاری طبقہ کے طریقۂ فکر سے ہوں لہٰذا پہلے تو شوقِ شکار

کا جذبہ ہوتا اور پھر یہ چیز عملی طور پر محبوب مشغلہ یہی کیا کم بغاوت ہے اپنے پلیٹ فارم سے، اور بورژوا اور ساونتی رجعت پسندی ہے اور تم ارتکاب کے بعد ڈھٹائی سے اقبالِ جرم کی دیدہ دلیری کی ترغیب دیتے ہو، ویسے ہی میری مجلسی زندگی، اور تربیتی ماحول مجھ پر رجعت پسندی کا چارج لگانے کے لیے کیا کم ہے اور شکار جیسے بورژوا موضوع پر کہانی لکھوا کر تم اس ریشمیں تانے بانے کو تار تار بکھروانا چاہتے ہو جو میں نے اپنی ادبی نشست کے چاروں طرف تان کر ترقی پسندی کا حصار قایم کیا ہے اور جس کے اندر بیٹھ کر میں ترقی پسند افسانہ نگاری کرتا ہوں۔ لہٰذا بھائی ایسا احمق تو نہ تھا کہ تمہاری فرمایش پر اندھا دُھند قلم کاغذ لے کر شکاری کہانی گھڑنے بیٹھ جاتا، البتہ تمہارا شکاری کہانی لکھنے کی فرمایش والا خط سوئے ہوئے شوقِ شکار کی تحریک کا موجب ہو گیا اور قلم دوات سنبھالنے کے بجائے تمام برسات کی گریس کے لحافوں میں لپٹی ہوئی بندوقیں پونچھ پانچھ کر جنگل کو چل دیا۔

میری اس حرکت پر شاید اور میرے سب ادبی دوست کچھ حیرت کریں مگر سہیل تم اُلٹے سیدھے شکاری ہو اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر انصاف کرو نومبر دسمبر کا سیزن! ایک ایسے شکاری سے شکاری کہانی لکھنے کی فرمایش جس کی عمر کے پینتالیس سالوں میں سے پانچ کم پینتالیس کبھی کبھی شکار نہ کھیلنے میں گذرے ہوں اور اب تین سال سے کبھی کبھی شکار کھیلنا نصیب ہوا ہو کیا اس کے بربطِ شوق کے سب خوابیدہ تاروں پر مضراب نہ ہوتی؟

بس جھنجھنا اُٹھا تمہارا خط پڑھ کر سہیل! اور وہ جو کچھ تم بیچارے نے صرف لکھ کر بھیج دینے کے لیے لکھا تھا کرنے کے لیے مارنے مرنے پر تُل گیا! میاں میں کہا کرتا ہوں کہ جب میرا عالم نزع ہو اور مجھ پر سکرۃ الموت طاری ہو اور مجھے ہوش میں لا کر بات کرنے کی ضرورت پیش آئے تو نہ تو کیمفر اور آکسیجن دینے کی ضرورت ہے اور نہ جواہر مہرہ خطائی اور نوشدارو لوہی حلق سے اُتارنے کی، بلکہ میرے کان کے قریب مُنہ لا کر "شکار چلو" کہہ دینا مجھے ایک مرتبہ کو سچ مچ بستر مرگ پر اُٹھا کر بٹھا دے گا۔

سہیل! آدمی آدمی سے پہلے شکاری ہوا۔ کیوں کہ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ وہ جب بھی شکاری تھا جب SOCIAL نہیں ہوا تھا اور یہ تو تم جانتے ہی ہو گے وہ فطرتاً

جبلتاً شکاری واقع ہوا ہے اور آج تک یہی جذبہ کبھی کبھی اسے رجعت علی الاصل کے تحت سوسائٹی سے گریز و فرار کرا کر جنگل میں لے جاتا ہے۔ شکار کے شوق میں یک گونہ دلچسپی مسخ سے مسخ شدہ طبقہ کے انسان کے اندر پائی جاتی ہے اور یہ اس کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ خالصتاً شکاری ہے اور شکاری اصلِ آدمیت سے بہت زیادہ قریب ہے اور دونوں میں ابتدائے آفرینش کا رشتہ ہے۔

مشہور ضرب المثل شکاری شکار کھیلیں اور ...... ساتھ ساتھ پھریں تم نے عملی طور پر شکار کھیلتے وقت اپنے چاروں طرف بیسیوں ...... میں کار فرما دیکھی ہوگی جو بغیر کسی مزدوری یا لالچ کے حتیٰ کہ بلا تحریک کیے اپنا کام تج کر للّٰہی تماش بینوں کی صورت میں شکاریوں کے ساتھ ساتھ پھرتے ہیں یہ کیوں، یہ یوں کہ یہ مشغلہ فطرتِ انسانی کو شاید سب سے زیادہ اپیل کرتا ہے کیوں کہ اس کے اندر اس کی اپنی اصلی دلّھی ارتقاء کی تاریخ پوشیدہ ہے اور شکاری اصلاح میں ان غریب ساتھ ساتھ پھرنے والوں کو ...... کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے حتیٰ کہ ان ...... نے شکارپور کے نام سے ہندو پاکستان دونوں ممالک میں اپنی اپنی بستیاں بسالیں۔

اور سہیل میری طبیعت ان شکاروں سے ہمیشہ گریزاں رہی ہے جس میں سوسائٹی کا لمبا چوڑا دائرہ ہوتا ہے اور جس میں انگریزی دور کا مجسٹریٹ ضلع لاٹ صاحب بہادر کی آمد پر ضلع کے ہر چھوٹے بڑے لائسنس دار اسلحہ کو ساتھ ساتھ پھرنے والوں میں بھرتی کرنے کے لیے نیم سرکاری حکم نامہ قسم کے دعوتی رقعے ارسال کیا کرتا تھا اور اس طرح لاٹ صاحب کے کیمپ کے کل اخراجات ایک یا دو بڑے ...... کے سر کر کے انھیں پیچھے پیچھے پھرایا کرتا تھا اور شکار کے اختتام پر لاٹ صاحب ان ...... سے مصافحہ کرنے کا تمغہ عطا کر کے اور نیم انگریزی نیم اُردو زبان میں شکریہ کے رسمی الفاظ ادا کر کے چل دیتے جس کا سرور رگ و پے میں ...... میزبان کے اندر اگلے سیزن تک دوڑتا رہتا اور جس کی فردوسی نغمہ کی سی آواز سامعہ میں سال بھر تک گونجتی رہتی۔

مگر بھیا یہ اس دور کی باتیں کرنے پڑ گیا ہیں جب بڑے لاٹ، صاحب اور چھوٹے

لاٹ صاحب کی چھری کی دھار پیاز اور شلغم کی سرخی دیکھ کر نہیں مڑا کرتی تھی اور نہ انسانی خون کے جریان اور حیوانی خون کی روک کے لیے بڑے لاٹ صاحب اور چھوٹے لاٹ صاحب سنگین اور قلم چلایا کرتے تھے

ہاں تو تم سمجھ گئے ہو گے سہیل بھیا! جب نیل گائے بند نہیں تھا اور آدمی کھلا نہیں تھا۔ "بند" اور "کھلے" کی شکاری اصطلاحات کو تم اچھی طرح سمجھتے ہو گے یعنی جو شکار ممنوع ہوتا ہے۔ وہ بند کہلاتا تھا اور جس کی اجازت ہوتی ہے وہ "کھلا" کہلاتا ہے یہ قانون جنگلات کی اصطلاحات ہیں۔ اور شاید تمہیں یہ بھی یاد ہو کہ چھوٹے لاٹ صاحب نے ابھی پچھلے چار پانچ سال میں صرف اس کے نام کی عظمت کے سبب نیل گائے قانوناً بند کر دیا تھا اور شاید آدمی کھول دیا تھا لیکن اب اس سال SHORTAGE OF FOOD کے مسئلہ میں علاوہ پیٹو رئیسوں اور سیہ رو تاجروں کے نیل گائے کی شکل بھی بھیڑیے کی سی نظر آنے لگی تو پہلے تو جلد ہی اس کا جدید نام "نیل گھوڑا" تصنیف کیا اور پھر اس سال اس کا تقدسِ نامی بالائے طاق رکھ کر اس کے استیصال کے لیے باقاعدہ مہم جاری کرنے کا اعلان فرما دیا اور اس کو قانونی شکل دے کر اس کے شکار کے لیے ہتھیار تقسیم کر دیے ...... اور اس کو ضلع پلاننگ کے محکمہ کے سپرد کر دیا اور اب آدمیوں کو پتہ لگا کہ پچھلے پانچ سال کے اندر اگر آدمی نیل گائے کی طرح اپنے نام میں اپنی مشابہت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لفظ بندر لگا لیتا اور اپنا نام "بندر مانس" رکھ لیتا تو شاید اس کا شکار بھی بندر کے نام کی عظمت کے سبب بند رہنا قانونی امر ہو جاتا...

ہاں سہیل! ذکر تھا شکار کا اور یک دم جنگل سے مجلسِ آئین ساز کی بات میں جا پڑا اور مجلسِ آئین ساز کے اندر سے جنگل میں جا کھڑا ہوا۔ تم بھی کہو گے کہ کتنا بے مغز ہوں میں بھی، مثبت منفی قسم کا آدمی! بات کرتے وقت جنگل اور مجلسِ آئین ساز اور مجلسِ آئین ساز سے جنگل میں کتنی جلدی بھٹک جاتی ہے اس کی! . . . .

ہاں! تو میرا مطلب یہ ہے کہ "شکار" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل لفظ "شہکار" تھا۔ تاریخ اب بھی پتہ دیتی ہے کہ جب پٹھان اور مغل شہنشاہ فتوحات سے سیر ہو جاتے اور "سلطان شکاری" کرتے کرتے شکار ہی ختم ہو جاتا تو اپنی فوج کے سوئے ہوئے ہاتھ پاؤں

کھلوانے کے لیے آبادیاں چھوڑ کر جنگلوں پر جا پڑتے، ہاتھیوں سے جا ٹکراتے، شیروں سے بھڑ جاتے، چرندوں کی ٹانگیں توڑتے، پرندوں کے پَر کترتے اور تم سمجھ گئے ہو گے۔ سہیل! آبادیوں میں جب شکار کا میدان سمیٹ لیتے تو جنگلوں میں بھونچال برپا کر دیتے۔ غرض لہو گرم رکھنے کا بہانہ تلاش کرتے پھرتے۔ اور تم نے شاید پڑھا ہو، تاریخ مغل دور کے ایسے معلّم چیتوں کا بھی تذکرہ کرتی ہے جو زر کار جھولیں پہنے، رو پہلے پٹکے باندھے بہلیوں میں بیٹھ کر اکبر و جہانگیر کے شکاریں ساتھ جاتے تھے اور شہکارانہ شان سے تیس تیس فیٹ کی بگولہ ساں زقندیں میں ٹینس کی گیند اور فٹ بال کی طرح ٹپے کھاتے اُچھلتے کودتے ہرن چکاروں پر بجلی سے جا گرتے اور تم نے سادنتی دور کے بادشاہوں اور راجپوت سرداروں کی تصویروں میں انگوٹھے پر شہباز شاہیں بھی بیٹھے دیکھے ہوں گے۔

شہباز و شاہیں انیلگوں آسمانوں کی بے کراں وسعتوں اور تا حدِ نگاہ بلندیوں کے UN. CHALLANGED فضائی جرنیل! جو سر اور گردن سے لال قند کے غلاف اُترتے ہی سورج جیسی تند تابناکی سے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مالک کے انگوٹھے سے شاہانہ پرواز کرتے اور ایک ہی اڑان میں اپنی لا محدود جولانگاہ پر چھا جاتے اور اپنے چو طرفہ بگولہ ساں حملوں کی پیہم شدت سے زمین سے لے کر آسمان تک اور آسمان سے زمین تک ہر چھوٹا بڑا پرندہ اپنے چنگل میں سمجھتے۔

اور سہیل! یقیناً تم نے سوداؔ کا وہ نوحہ پڑھا ہو گا جو انھوں نے "میرزا فیضو کی چُج" کی موت پر لکھا ہے اور جس کا مشہور شعر ہے ؎

میرزا فیضو کی چُج مر گئی

خوش خانے جگ کے ویران کر گئی

چُج سب سے قلیل الجثہ شکاری پرندہ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی مادہ سے بھی بہت چھوٹا۔ نہایت تیز پر اور بلا کا خونخوار، اپنے سے اُٹھ گنے قد و قامت کے شکار پر موت کا طمانچہ بن کر ٹوٹتا ہے اور یہ میرا تجربہ ہے کہ اس کا پکڑا کبھی چھوٹتا نہیں اور سوداؔ کے نوحہ کی روشنی میں جب میں نے میرزا فیضو کے جذبات کا اندازہ کیا تو یہ سمجھا کہ چُج اپنی شکل و صورت اور خوب صورتی پرواز اور

شدتِ خونخواری کے ساتھ اپنے ننھے منے وجود میں اپنے شکاری مالک کو بڑا پیارا لگتا ہوگا اور میرزا فیضو کے جذباتِ غم کے تحت سوداؔ کا یہ نوحہ معرضِ وجود میں آیا۔

مگر یہ تو سامنتی دور کی باتیں ہیں اور اب ہے جمہوریت کا عہد! آج کی جمہوریت میں شکار کھیلنے کے لیے نہ تو جنگلوں جنگلوں اکبر و جہانگیر کی طرح خاک چھاننے کی ضرورت ہے اور نہ پلنگانہ اور خوش خانہ تعمیر کرنے کی اور نہ فوج کو ہاتھ پاؤں کی چستی برقرار رکھنے کے لیے شکارگاہوں کو لے جانے کی ـــــ اور دورِ حاضر کے "جہانگیر و "اکبر" کے لیے کھلے بازاروں اور وسیع کھیتوں میں دن دہاڑے شکار کھلا ہوا ہے .....

اور سہیل! بیان نہیں کر سکتا کہ کس بلا کی گدگدی تھی تمہارے خط میں! تم نے تو اپنے رسالہ کے لیے شکاری افسانہ کی فرمایش کی تھی مگر میرے اندر والا شکاری سچ مچ مچل پڑا اور افسانہ نگار بے چارہ اس کی تڑپ کے سامنے حرکت نہ کر سکا اور یہاں میں کوئی بھیا ہر چند اس قسم کی چیز تو تھا نہیں جو تمہارے شکاری افسانہ کی فرمایش کے تازیانہ پر تڑپ نہ اٹھتا اور سچ مچ شکاری کہانی کا عملی ڈرامہ کھیلنے نہ پہنچ جاتا۔ اور تمہارا خط! سہیل! جیسے مجھے پانچ سال کا بچھڑا پرانا ساتھی مل گیا۔ جیسے تم بذاتِ خود میرے ساتھ کنوتی ملائے شکاری کپڑے پہنے کھلونا سی بندوق لیے چل رہے ہو۔

آج میں تنہا تھا! سمجھ لو کہ آج جتنی میری قلم کی بزم آراستہ ہے اتنی ہی "سیف" کی رزم اُکھڑ چکی ہے! تمہارا ملے فرمایشی خط پر جھرجھری آئی اور میں انگڑائی لے کر اٹھا۔ جیسے تمام دن کا سوتا شیر مغرب کے وقت اپنی سرد و نم خواب گاہ سے اینڈتا خمار اُتارتا اٹھتا ہے۔ مگر شیر تو اکیلا ہی شکار کھیلتا ہے، اور میں تو آدمی ہوں اور میری شکاری سوسائٹی کا مخصوص دائرہ ختم سا ہو چکا ہے۔ بوڑھے اُستاد رضا خاں جن کی ستر سالہ پیری میں شکار کے دم قدم سے ٹھیک سترہ سالہ رنگِ شباب اُچھلتا تھا، فالج کے حملہ کا شکار ہو کر اپنے سب تڑاخے خاموش کر چکے ہیں اور مولانا بصیر قبلہ ضعفِ ہضم کے ہاتھوں کم زور ہو کر صرف ؏

زمینِ شعر ہی میں رہ گئی زلفِ نیاں کافر

کے مصداق صرف شاعر ہی شاعر رہ گئے اور کبھی کبھی ہماری پارٹی کے شکار سے واپس آنے پر مہمات کی تفصیل

سُن کر لُطف اندوز ہونے تک شکاری! سیّد پاکستان بھاگ گیا اور اس کے پیچھے پیچھے مسلم بھی!
سکسینہ بابو کا تبادلہ ہوگیا۔ اور وہ یک چشم کیپٹن ہارڈی ڈسٹرکٹ اوپیم ایجنٹ جو ہر وقت نشانہ تاکے
رہتا تھا اور بوڑھا ایگزیکٹو انجینئر مسٹر پرو ہٹ اور ریزرو پولیس لائن کا نوجوان انچارج ولیم
نیسٹر جو مارتے کم تھے اور بولتے زیادہ تھے، تقسیم سے بہت پہلے تقسیم کی بُو سُونگھ کر ولایت چلے
گئے تھے۔ اب تم ہی بتاؤ چاہے اس کے چھلکے میں ڈائنامیٹ ہی کیوں نہ بھرا ہوا اکیلا چنا کیا
خاک بھاڑ پھوڑے! اور ساتھ لاتا بھی تو کسے؟ میرے اندر جو اسپورٹس مین تڑپ رہا ہے
اس کے ذوق کی روز افزوں تشنگی کو کیسے تسکین دوں! کبھی کبھی پڑے پڑے اور لکھتے لکھتے
ویسے ہی اعصاب میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتی تھیں اور تمہارے خط نے بسمل بنا کر چھوڑا۔ اللہ
اللہ سہیل! تھی تو ہم دس بارہ ہی منچلوں کی ٹولی مگر سمجھ لو کہ شیر، چیتے گلدار عقاب، شاہین،
شہباز سب کے سب ایک گوٹ جمع تھے اور کوئی کھیلتا ہو گا سیزن سیزن یہاں بارہوں مہینے
جنگل میں منگل منا کر خون کی ہولیاں کھیلتے اور تیسوں دن اپنی مقررہ ہانٹوں میں محشر تازہ بپا
کیے رہتے۔

اور سہیل! تم تو خیر شکاری ہو اب یہ نہیں معلوم کون سے "بندوق لگانے والے"
"بندوق چلانے والے" یا "بندوق چھوڑنے والے؟" اور جس مین ذرا بھی اسپورٹس مین
کا شعور ہو گا اس وقت میری مجبوری اور جذبات کو سمجھ لے گا۔ اور تم تو شاید خالص شکاری
جذبہ کے بھی کچھ شناور ہو؟ یقیناً اس کی ابتدائی ٹکنیک اور قواعد وضوابط سے واقف ہوگے
اور بہار میں تو سُنتے ہیں کہ بڑی لمبی چوڑی گہری جھیلیں ہیں جہاں اک ذرا سردی شروع ہوتے
ہی قاز مرغابی کلنگ کے ٹڈی دل سائبیریا اور چین کے برفستانوں اور تبت اور مالٹا کی جھیلوں
اور صحرائے گوبھی کے دلدلوں سے ایک پرواز اڑ کر آپڑتے ہیں اور یوں تو تم جانتے ہو کہ ہر
اسپورٹ ٹیم ورک TEAM WORK ہے اور خاص طور پر ان مائیگریٹ کر کے آنے والے
پرندوں کا شکار تو بالکل ہی، اور اس کے لیے مقرر کردہ قواعد وضوابط کے ساتھ جھیل پر
بالکل اسی طرح پوسٹیں اور ڈیوٹیاں لگتی ہیں جس طرح پلے گراؤنڈ پر ہاکی، کرکٹ، فٹ بال کے
کھیلوں میں، اب ایسی صورت میں میں اکیلا چڑیا کے شکار کو جا کر کیا کرتا اور کیسے کھیلتا اور ٹِک تو

اس شکار کی بھی کوئی نہیں بنتی تھی جس میں آ پھنسا۔ کیوں کہ جنگل کے شکار کے لیے بھی متعدد شکاری ہوتے ہیں تاہم بہت سے قلی اور حالی موالی کر لیے اور جنگل کا ہانکا کرانے کا اور صرف ایک ناکا گھیر کر بیٹھنے کا اکیلا اکیلا سُو ناسُونا پر وگرام بنالیا۔ سمجھ لو کہ ہماری اسپورٹنگ بیکسی اور تنہائی کا یہ عالم تھا کہ دشمنوں تک کو رحم آگیا اور تمہاری بھاوج جو شادی کے بعد سے اب تک گھر کے اندر میرے شوقِ شکار سے دست و گریباں رہی تھیں، میری اس تنہائی شوق اور شوقِ تنہائی پر افسوس کرنے لگیں اور انھوں نے عمر میں پہلی مرتبہ میرے اس کیمپ کا سامان جو پانچ سال بعد ہو رہا تھا ذرا دل کے ساتھ کیا۔

سہیل! تم نے بچپن میں بندر کا تماشا دیکھا ہے۔ بس یاد کرلو جب بندریا رُوٹھ کر میکے چلی جاتی ہے اور مداری بندر کو اسے منانے کے لیے بھیجتا ہے تو جس طرح وہ بندر کندھے پر ڈنڈا رکھ کر سسرال جایا کرتا ہے یا فلم دیوداس میں ہیرو کا پارٹ ادا کرتے ہوئے سہگل بندوق لے کر شکار کو جاتا ہے بس کچھ اسی انداز سے جیسے شکار جانے کا ڈرامہ سا کھیل رہا ہوں میں اپنا اکا و تنہا ساتھی شکار کھیلنے چلا۔ جیسے بڑھتا آگے کو ہوں، چلتا پیچھے کو! اور تم یہ بھی جانتے ہوگے کہ "شکاری اور بھکاری کا کیا ٹھیک۔!" جدھر مُنہ اُٹھ جائے اُدھر ہی پاؤں چل پڑیں! بس تو تم یہ سمجھ لو کہ ایک رُخ کو میں بھی چل پڑا۔ جیپ کار نے وہاں تک پہنچایا، جہاں تک زمین نے اجازت دی۔ تمام راستہ دائیں بائیں نظر کی کمندیں پھینکتا، آنکھوں میں کھپے ہوئے مناظر کا ہر ہر زاویہ ناپتا اور قدموں میں چالیس سال نپی ہوئی وسعتوں کے چپے چپے سے صحنِ خانہ جیسا مانوس تاثر لیتا۔

میرا کیمپ، قاعدہ کے مطابق کل صبح ہی لگ گیا تھا اور قلی وغیرہ سب طے ہو چکے تھے۔ مگر تمام دن سوچنے کے باوجود بھی کوئی اسکیم مرتب نہ کر سکا تھا۔ مشہور بات ہے اکیلا نہ ہنستا بھلا نہ روتا۔ پہلے جب ایسے پروگرام بنا کرتے تھے تو چلنے سے پیشتر کئی کئی دن پارٹی کے اراکین میں بحث ہوا کرتی تھی اور باقاعدہ جائے قیام اور سمت، کا پروگرام بنتا تھا جس پر نہایت پابندی سے ساتھ عمل کیا جاتا تھا۔ پہلے سے آدمی جنگل میں بھیج دیے جاتے تھے جو جانوروں کی ہانٹیں اور گذرگاہیں، بھانپ کر اطلاعیں دیتے تھے اور ان کے مطابق پروگرام بنا کرتا تھا۔۔۔۔

خیر وہ آج سب کچھ خود ہی بنا کر اور اپنی پارٹی کا ایک اکیلا رکن بن کر شکار کھیلنے یہاں پہنچا ہوں جیپ کار یہاں سے چار میل کے قریب ایک گاؤں میں چھوڑ دینی پڑی اور وہاں سے بیل تانگے پر سوار ہو کر سورج غروب ہوتے ہوتے اس جنگل کے کنارے پر لگے ہوئے کیمپ میں پہنچ گیا۔ پہلے شکاری مزدوروں سے کچھ بات چیت کی۔ پھر دو پیالی چائے پی اور سرِ شام ہی سے تمہیں خط لکھنے بیٹھ گیا۔ اب بھوک لگ رہی ہے لہٰذا خط ختم کرتا ہوں۔ دیکھو اگر کوئی خاص بات کل کے شکار میں قابلِ ذکر ہوئی تو اس خط کو کل شب میں پورا کر کے پرسوں پوسٹ کراؤں گا۔ آج کھانا کھا کر قاعدہ کے مطابق مجھے جلد ہی سو جانا چاہیے کیوں کہ علی الصبح اٹھ کر جانا ہے اور پہلا روز ہے لہٰذا کل بہت سویرے ہی چل پڑنا ہے۔ اچھا رخصت باقی کل شب....

۱۶ر دسمبر (۱۱ بجے شب)

آج علی الصبح بیدار ہوا جیسا کہ میں نے رات لکھا تھا اور یوں تو شکار کو جایا ہی اس لیے جاتا ہے کہ وہاں عجیب النوع حالات و کوائف سے دوچار ہوں اور خلافِ امید واقعات سے پالا پڑے مگر آج کے شکار نے کیا بتاؤں زندگی میں پہلی اور شاید اخیر مرتبہ وہ حالات پیش کیے سہیل کہ تم اور نہ صرف تم بلکہ سب ادبی دوست اور خاص طور پر ایک ایک ترقی پسند ساتھی یاد آیا اور ساتھ ساتھ اپنی بچھڑی ہوئی شکار پارٹی کا ایک ایک رکن بھی! کاش میرے ایک ہاتھ پر تم سب ہوتے اور دوسرے پر وہ سب! اور میں ایک اور ایک اور ایک ایک سو گیارہ ہوتا تو کچھ مزہ آتا۔ اور یہ جو آج "جنگل میں مور ناچا، کس نے دیکھا!" تمام دن اعصابی اور دماغی جھک جھک ہوئی یہ سب رائگاں سی گئی، تم سوچو گے کہ خیر اعصابی جھک جھک کے لیے تو شکار کو جاتے ہی ہیں بھلا دماغی جھک جھک کا کیا موقع ہو سکتا ہے، شکار جیسے اسپورٹ میں؟ مگر ایک روہیل کھنڈی دیہاتی مثل ہے کہ "چمار کو سُرگے بیگار!" یعنی "شودر کو اللہ میاں کے گھر بھی بیگار ملتی ہے۔" آیا تھا یہاں کتاب کاغذ قلم دوات، فلسفہ سیاست اور منطق سے گریز و فرار کر کے ذرا ہاتھ پاؤں چلانے اور دماغ کو سکون دینے سو تمام دن ٹھونٹھ پر اُتو بنا بیٹھا رہا اور شام کو وہ بک بک کرنی پڑی کہ دماغ خالی ہو گیا اور اب سوچا کہ لاؤ تمہیں خط ہی لکھ کر دماغی تکان اتار لوں۔ شکاری بے فکرے اگر ساتھ ہوتے

تو وہ تو خیر "اپادست" ہی رہتے۔ میری طرح الّو بنے کہیں بیٹھے ہی رہتے، سارا دن اور تمام رات اپنی شکست پر دل ہی دل میں روتے مگر تم سب ساتھی آج وہ وہ جوہر دکھلاتے کہ مزے آ جاتے اور وہ بھی بچہ یاد کرتے کہ ہوئی تھی کسی خوش فکرے سے ملاقات! کم سے کم تم نہ بھی بولتے تو میرے ہی نطق کے جوہر نہ دیکھ لیتے، میری محنت تو وصول ہو جاتی ۔ خیر!

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

سہیل! اس وقت تم دل میں کہتے ہوگے کہ کیا گزری؟ مگر پیارے ایسی گزریں جو سب تحیّر کن کی حد تک خلافِ امید ہیں اور خط کے اختتام پر تم بھی القابات کی ستم ظریفی کے قائل ہو جاؤ گے۔ آیا تھا یہاں ہاتھ پاؤں دُھنے کو، سو وہ تو نہ ہوا اور پڑ گیا اسی چیز سے پالا جس سے بھاگ کر یہاں آیا اور اب دماغ ان تمام چیزوں کا متحرک اسٹاک بنا ہوا ہے۔ وہ تو اس کے بعد تھوڑی بہت گانے بجانے کی جدید ترین تفریح ہو گئی ورنہ نہ معلوم دماغ کے اندر کتنا ہجوم ہوتا ان تمام افکار کا جو سہ پہرے شام تک متحرک رہے شاید ساری رات انھیں پر ہوتا رہتا۔

نقشہ یہ ہے سہیل کہ میرے کیمپ سے پورب کی جانب اس جنگل کے کنارے جہاں مجھے آج شکار کھیلنا تھا چھ سات میل چوڑا اور نہ معلوم کتنا لمبا ایک کمر کمر اونچی گھاس کا قطعہ پٹّی کی شکل میں لگا چلا گیا ہے اور میرے خیال میں یہ اسی طرح جنگل کے کنارے کنارے بلا انقطاع سینکڑوں میل چلا گیا ہے۔ یہ پٹّی کہیں پر زیادہ چوڑی ہو گئی ہے اور جنگل کے اندر گھُستی چلی گئی ہے اور کہیں پر صرف دو تین میل ہی چوڑی رہ گئی ہے اور گھنا جنگل اس میں گھُس آیا ہے مگر سلسلہ ساتھ ساتھ لامتناہی دُوری تک گیا ہے جس کا اور چھور باوجود اس کے اندر تیس چالیس سال صحرانوردی کرنے کے بھی مجھے نہ معلوم ہو سکا اور نہ میں نے کبھی اس کا جغرافیہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ البتہ یہ سُنتے ہیں کہ یہ اودھ فاریسٹ اور نیپال کی ترائی کے جنگلات کے سلسلہ کی ایک شاخ ہے اور یہ مخصوص شاخ بھی اسی طرح گھاس کے قطعہ کی گوٹ لگی ہوئی کئی اضلاع میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ گھاس وہ ہے جس کی جھاڑو بنتی ہے اور سینک کہلاتی ہے اور اس کی جڑیں مشہور خوشبودار چیز خس ہوتی ہیں اور یہاں پر جہاں میرا کیمپ ہے یہ قطعہ

میری مجوزہ شکار گاہ والے گھنے جنگل اور میرے کیمپ کے درمیان پانچ چھ میل کی چوڑائی میں حائل ہے۔

دسمبر کا مہینہ، اور صبح کا وقت آج تمام فضا بسیط کہرے کی نم آلود چادر میں گم تھی۔ مگر میں اور میرے ساتھی حدتِ شوق اور فکرِ معاش میں سردی پر غلبہ پائے ہوئے منہ اندھیرے سے ہی بیل گاڑی پر گرم سفر تھے کہ کہرا صاف ہوتے ہوتے اپنے ٹھکانے پر جا دھمکیں اور ہم اس گھاس کے قطعہ کی چوڑائی طے کر کے سامنے والے ڈھاک جنگل کو جا رہے تھے۔ زردی مائل سبز گھاس کا قطعہ چڑھتی اُترتی دھندلاہٹوں میں زیر و زبر تھا اور کبھی کبھی اس کنارے پر کالی لکیر کی شکل میں جنگل کی بھی ایک آدھ جھلک کہیں کہیں پر کہرے سے نکل کر سامنے آ جاتی جس کی سمت میں تیز تیز بڑھ رہے تھے اور گاڑی کے پہیوں کی گردش کے ساتھ میرے آدمی آگے پیچھے دائیں بائیں مستعدی سے قدم ملائے چل رہے تھے۔ پشت کی جانب پچھم میں چودھویں کا چاند اپنا خاموش و سرد سفر ختم کر کے تھکا تھکا ماندہ ماندہ سا مغربی پٹیوں میں جھکا ہوا تھا اور سامنے جنگل کی سیاہ لکیر کے پرے مشرقی افق کی تابناکی لمحہ بہ لمحہ ترقی کرتی جاتی تھی اور چلتے چلتے تمام سلسلہ قرمزی خیر گیوں سے بھڑک ہی اٹھا۔ پیچھے سے مغربی ہوا کے رُک رُک کر آتے ہوئے جھونکوں نے کہرے کے غلیظ پردے پھاڑنا شروع کیے اور سامنے سے شفق کی تابناکیوں نے اس نم آلود تاریکی میں جگہ جگہ مشعلیں سی بھڑکا دیں اور دیکھتے دیکھتے سبندور کے ستون سے چلتے نظر آنے لگے، اور کہیں کہیں پر گلال اور افشاں کے درخشاں بگولے سے اُٹھنے لگے اور کائنات پر شہابی روشنی کا سیلاب پھٹ پڑا اور اک ذرا آگے بڑھتے بڑھتے سامنے افق پر سونے کی بھٹیاں سی دہک اُٹھیں اور چاندی کے آبشارے پھوٹ پڑے اور کہرا جو گلال اور افشاں کے ذرات کی طرح متحرک تھا اس سے رنگ و تابانی لے کر جیسے ہوا کی لہریں بھی چمک اُٹھیں اور ان کے لمس سے سبزی مائل سنہری گھاس کے قطعہ پر بھی اور سیاہی مائل سبز جنگل کے سلسلہ پر بھی گنگا جمنی ملمع کاریاں ہونے لگیں اور بے ساختہ میں بے اختیار گنگنا پڑا ؎

صبح کا سونا جو ہاتھ آتا امیر

بھیجتے تحفہ موذن کے لیے

اور چلتے ہی چلتے جیسے پردہ سیمیں پر اُبھرنے لگی اور مرتعش گھاس کا طویل قطعہ اور لامتناہی جنگل

کا ہیبت سلسلہ شہاب پاشیوں اور نور افشانیوں میں سے نکل کر سامنے آگیا۔ اور جب میں نے
سامنے نظر اُٹھائی تو جیسے اوشادیوی کا رتھ ۔ مجھے اپنی گاڑی کے عین مقابل سُبک خرامی کے
ساتھ بڑھتا دکھائی دیا اور گھاس کا تنکا تنکا جنگل کا پتہ پتہ پیشوائی کے لیے تن سا گیا۔ دُور
درختوں سے طاؤس کی با ادب با ملاحظہ ہوشیار! آواز نقیب کی طرح سُنائی دی اور ننھی ننھی
چڑیوں کے تنگ پھنگیوں سے اُڑ اُڑ کر گھاس کے وسیع قطعہ کی جانب بڑھتے دکھائی دیے۔ ہزار ہا
اقسام کے کیڑے ٹڈے اُچھلنے پھُدکنے لگے۔ اور خاموش و پُر سکون جنگل اور میدان میں رنگا
رنگ، زندگی ناچنے لگی اور بھانت بھانت کی زندگی الاپنے لگی، زندگی جس کی بارش دستِ خلاق
آباد شہروں سے کہیں زیادہ دریا دلی کے ساتھ ویران جنگلوں میں کرتا ہے قدرت کے ریڈیو
اسٹیشن سے بڑے زور کے ساتھ بول پڑی' چلتے ہوئے بازاروں' دوڑتی ہوئی ریلوں اور گھومتے
ہوئے ملوں سے کہیں زیادہ جوش کے ساتھ فطرت کے اس عظیم کارخانہ میں جھنجھنا پڑی اور سیل ا
آدمی کے ہاتھ کے چلتے ہی آبادیوں میں پتھر اور فولاد چھلانگیں لگاتے ہیں' اندھیریاں جگمگا اُٹھتی
ہیں۔ اُجالیاں تھرکنے لگتی ہیں اور صباحیں صبحِ بنارس اور شامیں شامِ اودھ کے لقب سے سرفراز
کی جاتی ہیں۔ کاش آج کی صبح اور شام میں تم میرے ساتھ ہوتے تو کہہ اُٹھتے کہ صبحِ بنارس کی سب
نیرنگیاں اور شامِ اودھ کے کل رُومان ہیچ ہیں جنگل کے ایک ایک لمحہ کے مقابلہ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

گھاس کے ٹھاٹھیں مارتے دریا کے اس پار کھڑے ہوئے گھنے جنگل کی پہاڑ سی بلند
چوٹی کے سلسلہ پر ایک جگہ سورج کی قرمزیں پیشانی چمکی اور جیسے رات کی سردی کا چراغ بھڑک
اٹھا اور تمام رات کی سردی اور اُبھرتی ہوئی نوخیز سورج کی گرمی میں آویزش سی ہونے لگی اور
ایک دفعہ کو رات نے دن کو اپنا چارج دیتے وقت بھڑک کر تمام کائنات کو طبقہ زمہریر بنا دیا۔
ادھر پورب سے بڑھتی ہوئی گرم گرم کرنوں کی برچھیاں لمبی ہو ہو کر پڑیں اور بڑھیں! دیکھتے دیکھتے
سردی اور گرمی کی جنگ ختم ہوئی۔

معادنِ حیات حرارت نے جمود پر غلبہ پا لیا اور ؏

عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

سارے ماحول میں ذوقِ حفظ زندگی انگڑائیاں لے اٹھا اور قدرت کے کارخانے میں جدوجہد

کا بازار گرم ہو گیا۔

میں نے ایک انگڑائی اور چند جمائیاں لے کر اپنے چاروں طرف پر تالا اور کہا۔

" ہوں، اس گھاس میں بھی تو شکار نکلتا ہے۔" اور پھر راستہ پر نگاہ ڈال کر کہا۔" یہ دیکھو نا، یہ کھوج، " ہاں میاں! یہ تمام رات کی چرائی کے ہیں اور یہ سب اسی گھاس میں نکلیں گے، یہ چر کر سارا دن اسی میں بیٹھے رہتے ہیں اور اگر دن میں انھیں کوئی پریشان کرے تو اٹھ کر جنگل میں گھس جاتے ہیں سامنے، اور ہاں سبھی جانوروں کے کھوج ہیں، چیتل سانبھر، جھانک نیل، ہرن پاڑھا اور کہیں کہیں پر چکارہ۔"

" مگر آج تو یہ سب راستہ راستہ لمبی ڈگ پر سیدھے جنگل میں جاتے معلوم ہوتے ہیں ــــ"

" لیکن سرکار آج ہاں میں یہ تو بتانا بھول ہی گیا اس گھاس میں سے تو سب شکار بڑھ گیا ہوگا جنگل میں یہ جو پڑے ہیں بھیلوں کے ڈیرے، انھوں نے بدکا دیا ہوگا۔ بڑے مارنے والے ہیں، جال سے ماریں، کتوں سے ماریں، بھالوں سے ماریں۔"

" مگر بھیّا ان بے چاروں نے کیا ڈیرہ ڈالتے ہی بدکا دیا شکار یہ تو کل تیسرے پہر ہی اس جنگل میں آکر پڑے ہیں۔ ابھی تک انھوں نے چوں بھی نہیں کی ہے۔"

" اور پھر یہ تو بڑے ٹھنڈے شکاری ہیں، اور ان کی تو گذر اوقات ہی شکار پر ہے ان سے بھڑک کر شکار بھاگا کرے تو یہ کھائیں کیا؟ ایں۔"

" اجی میں تو بیس دفعہ دیکھ چکا ہوں ان کا شکار، جب تک جنگل کا چوہا چوہا مار کر نہ کھا جائیں دم نہ لیں۔"

" اور اتنے چپکے چپکے کہ مجال کیا جو پتہ کھٹک تو جائے۔"

" اجی شکار کا بھیجا کھائیں سر سہلائیں، آسیب ہیں پورے آسیب، اب یہ گھاس ان کے خچر بھینسوں بکروں کا چارہ ہے اور اس میں کا شکار ان کا اور ان کے کتوں کا ــــ"

" مگر یہ خچر بھینسے کیوں پالتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"اپنا سامان اور جال لاد کر لے جانے کے لیے!"

"تو جالوں سے خرگوش، لومڑی گیدڑ پھانس لیتے ہوں گے۔"

"نہیں صاحب نیل سانبھر جھانک اور سؤر تک اور ہرن چکارہ پاڑھا تو کوئی چیز نہیں اور ان کے کتے بلا کے کٹر اور ہونہار ہوتے ہیں، مُنہ ڈالیں تو شیر تک سے نہ چوکیں۔ اور پھر سرکار ایک دفعہ کو آپ کی گولی سے بچ کر نکل جائے ان کے برچھے کا مارا پانی نہیں مانگتا۔ یہ سب خیمے نیل سانبھر کی کھالوں کے گھٹے ہوئے ہیں۔"

"میاں بستر اور پہننے کے کپڑے تک کھالوں کے ہوتے ہیں۔"

"سرکار یہ سارے جنگل کو اپنی کھیتی سمجھتے ہیں اور بڑی ترکیب کے ساتھ بغیر بھڑکائے شکار کرتے ہیں۔"

میرے آدمی مجھ کو بتاتے چل رہے تھے اور سُن سُن کر میرا اشتیاق بڑھ رہا تھا اور تم یاد آرہے تھے اگر اس وقت ساتھ ہوتے تو شکار کی دنیا سے ہٹ کر شاعری کی دنیا میں جا پڑتے اور شاید مجھ کو بہت زیادہ لطف آتا۔ میں نے دُور سے پُر اشتیاق نگاہیں ان کے چرمی خیموں کی بھُوری بھُوری بستی پر ڈالیں اور دل میں خیال کیا کہ شکار تو کچھ ان صحرا نشینوں کا ہی حصہ ہے جو ابتدائے آفرینش سے آج تک تمدن سے برسرِ پیکار ہیں اور ہزار ہا سالہ مدنیت سے گریزو فرار کیے آج ایٹم والی دنیا میں بقول میرزا غالب ؎

بے در و دیوار سا گھر بنائے

آسمان کی بنت، چھت اور زمین کے مخملیں فرش پر جگمگاتے سنسناتے محلوں سے کہیں زیادہ سکون کے ساتھ محوِ استراحت ہیں۔ اور گڑگڑاتے کارخانوں اور بھڑبھڑاتی سڑکوں سے کہیں زیادہ مصروفِ کار! اور سہیل مجھے تو خلافت الارض کے صحیح علم بردار یہی فطرت زادے معلوم ہوئے اور مجھے ان کے دیکھنے کا شوق ہوا اور میں نے اپنے تانگے کا رُخ اس خانہ بدوش بستی کی جانب کرا دیا۔

اور ہم سب کے سب ان کے یہاں پہنچ گئے۔ یہ لوگ بھی شکار جانے کی تیاری میں تھے، میرا استقبال انھوں نے کچھ ناخواندہ مہمان جیسا مکروہ تیوریوں سے کیا اور شاید یہ سمجھے کہ

میں سرکاری اہل کار ہوں جو بالعموم انھیں پریشان کرتے رہتے ہیں مگر میرے یہ بتانے پر بھی کہ میں بھی ان کی طرح شکاری ہوں ان کی تیوریوں کی کراہت جوں کی توں رہی جیسے ان کے بشرے یہ کہہ رہے تھے کہ ہم پچاس ہزار سالہ پرانے شکاریوں سے تم پانچ ہزار سالہ نئے شکاریوں کی کیا مناسبت! اور جب انھوں نے آپس میں اپنی قدیم غیر آریائی زبان میں بات چیت کی تو میں نے ان کے لہجہ اور طرز سے اندازہ کیا کہ یہ اس وقت مجھ کو اپنے اوپر بار سمجھ رہے ہیں اور شکار جاتے وقت میرے ورود کو فالِ بد قسم کی چیز۔ خیر میں نے اپنے مخصوص انداز میں گویا بڑا بھاری ایثار کرتے ہوئے کہا۔

"آج میں تم کو بھی اپنے ساتھ شکار میں رکھوں گا۔"

اس پر انھوں نے پھر اپنی زبان میں آپس میں کچھ بحث کی اور پھر ان میں سے ایک نے جو ان کی جماعت کا مقتدر فرد معلوم ہوتا تھا، اپنی مطلب براری کرتی ہوئی ٹوٹی پھوٹی زبان میں کہا۔

"آپ کا بھلا ہمارا کیا ساتھ؟"

"کیوں؟" میرا بیباک بھنگی بول پڑا۔

"یوں کہ آپ کے ہتھیار بہت ناقص ہیں" اور یہ کہتے ہوئے اس نے میری بندوق اور رائفل پر حقارت آمیز نگاہ ڈالی جو میرے حالی موالی کندھوں پر لیے ہوئے تھے۔

سب ہنس پڑے اور میں نے طنزیہ سنجیدگی سے نہایت نرمی کے ساتھ کہا —

"ہاں بھائی تو کیا خرابی ہے ہمارے ان ہتھیاروں میں؟ جو تم ہمیں اپنے ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھتے۔"

اور اس نے یک گونہ آزادی کے ساتھ جواب دیا۔

"خرابی آپ نہیں جانتے" اور پھر ٹھہر ٹھہر کر فلسفیانہ انداز میں کہا "آپ ایک شکار مار کر اتنا بڑا بکھوا کا کرتے ہیں کہ سارے جنگل کا شکار چوکنا ہو جاتا ہے" اور پھر سب ہنس پڑے اور اس نے پھر سنبھل کر بیباکی کے ساتھ کہا — "ادنہہ شکار شناسی اور داؤ گھات سے ہوتا ہے اور آپ دھماکوں سے کرتے ہیں، شکار بھاگ جاتا ہے، بچے نہیں دیتا، مشکل ہو جانے گا،

اور پھر مار بہت کم ملے گا۔"

اور سہیل! اس کے اعتراض کا جواب نہ تو میرے پاس تھا اور نہ میرے ہائی ولاسٹی رائفل کے پاس اس کے برچھے کے خاموش و بے آواز کاٹ کا جواب تھا اور جیسے مجھے اپنے سب ہتھیار اس کے کھردرے بانس میں ٹھکے ہوئے برچھے کے ہاتھ بھر لمبے پھل کے مقابلہ پر ہیچ معلوم ہوئے اور پھر دوسری نظر میں اس کے فولادی جسم میں اعصاب کی رسیاں سی بل کھاتے اور بات بات پر اسپرنگ سے اچھلتے دیکھ کر مجھ پر ایک قسم کا اعصابی احساسِ کمتری طاری ہو کر مجھے مرعوب سا کرنے لگا۔ اور بھیا! ان کے خیموں کو غور سے دیکھ کر تو شرم سے میری گردن جھک گئی۔ دوست! ہم ساری عمر میں ولایتی ساخت کے مہلک ترین شکاری ہتھیاروں سے چند جانور شکار کرلیں تو مانو بڑے شکاری بن گئے۔ اور پھر دس پانچ کھالوں اور سروں سے اپنے ڈرائنگ روم دیواریں اور فرش مزیّن کر کے ہر ایک مہم کی منسلکہ روایت تاریخ کی طرح محفوظ رکھتے ہیں اور یہ چیزیں خاندانی ٹرافیز کے طور پر نسلاً بعد نسلاً چلتی ہیں۔ دُور کیوں جاؤ میرے لڑکے کو میرے باپ کے مارے ہوئے خاص شکاروں کی مہمات برزبان یاد ہیں اور ہر کھال اور سر دکھا کر آپ کو اتنی تفصیل کے ساتھ سُنائے گا جیسے یہ دادا میاں کے ساتھ شکار میں تھا۔ باپ نے نہ ماری مینڈکی بیٹا تیرانداز! شکاری دادا کا شکاری پوتا اپنے باپ کی پیدائش سے بھی پہلے کے تمام قصّے علم سینہ کے ذریعہ اپنے سینہ میں محفوظ کیے ہوئے ہے آج تک، اب دوست تم ہی بتاؤ جب ہم اعلیٰ ترین آلاتِ ہلاکت سے مسلح ہو کر اور ہزار پانسو چڑیاں چوپائے اور چار چھ درندے شکار کر کے KEEN SPORTS MAN کا خطاب پاتے ہیں اور بین الاقوامی مصوّر رسالوں میں تصویریں اور تفصیلیں چھپوا چھپوا کر نام و شہرت حاصل کرتے ہیں تو پھر ان صحرانشینوں کو کون سا خطاب دیا جائے جن میں سے ایک، ایک شکاری جنگلی زندگی پر اچھلتا کودتا، مارتا کاٹتا مجسم تھیسس ہے جو آج ایٹم کی بیسویں صدی والی دنیا کے اندر پتھر کے عین بعد والے لوہے کے ماورا التاریخی دور سے گذر رہے ہیں اور بارہ انچی لوہے کو بارہ فٹی بانس میں لگا کر شکار کے ذریعہ پیٹ بھرتے ہیں، شکار کے ذریعہ تن ڈھکتے ہیں، شکار کے ذریعہ گھر بناتے ہیں۔ اور میں نے ان کے خیموں پہ باہر سے اندر تک گہری نگاہ ڈالی، اپنے ہاتھ کا مارا اور

اپنے ہی ہاتھ کا کچا پکا و باغت کیا ہوا چمڑا، فرش سے لے کر چھت تک سب کچھ شکار کی کار فرمائی!
خیمے نیل سانبھر اور جھانک کی دبیز کھالوں کے! بستر ریچھ، ہانتا، بھیڑیے اور گل دار کی کھالوں
کے اور ان کے نیم عریاں جسم بھی خال ہی خال کپڑے کے مرہونِ منت نظر آئے چوں کہ موسم سردی
کا تھا لہٰذا ضروری ستر پوشی کے علاوہ خرگوش، لومڑی، گیدڑ اور بن بلاؤ کے پشم دار نرم چمڑے
کام میں لائے گئے تھے ...

بال، کھال ہڈی، سب کچھ اثاث البیت! اور ان دو گز چوڑے چار گز لمبے کھال اور
بانس کے نیم انسانی مسکنوں میں زندگی مچل رہی تھی، بے فکری ناچ رہی تھی اور روح و جسم کے
اتّصال کی تمام تر نیرنگیاں سمجھیے ایک ایک خاندان تندرستی، آزادی اور دلبری کے خزانے بھرے
بیٹھا تھا۔ان کا بدن ان کا ٹھوس سرمایہ تھا۔سنگین اعصاب کے پہیئے پر فولادی رگوں کے لوچ کے
ساتھ خالص خون کی اعلیٰ ترین وہبی نعمت گھمر گھمر کر رہی تھی اور بوڑھے، جوان، بچے میں بھرپور
نوجوانی ہی نوجوانی کے سوتے اینڈ اینڈ کر اُبل رہے تھے اور ہر آنکھ سے زندگی کے نقرئی شرارے
چھوٹ رہے تھے۔ وحشی جانوروں کی کھالوں کے گرم گرم سایہ میں امن و آزادی کا ڈیرہ تھا اور
نوعِ انسانی کی فطری نعمتیں چپہ چپہ پر گلے مل رہی تھیں۔ وہ خود ہی اپنی ریاست ہیں اور خود ہی
حکومت اپنا سرمایہ و محنت اپنے آپ! اور صحرا کی روشن اور خاموش وسعتوں میں ان تنگ و
پست خیموں کے اندر موت و زندگی، بغیر ایٹم بمب اور پنسلین کو بیچ میں ڈالے اپنے جھگڑے آپ
سمجھوتے کر کے چکاتی رہتی ہیں اور آزادئ تحریر و تقریر کی تمام پابندیاں اور حق و ناحق کے کل
فیصلے بغیر گول میز کانفرنس اور قرطاسِ ابیض کے اپنے آپ اُلجھتے سلجھتے رہتے ہیں اور کشمیر و کوریا
کے کل مسئلے بغیر سیکورٹی کونسل اور یو۔این۔او کے طے ہوتے رہتے ہیں اور حُسن و عشق کی سب
عشوہ طرازیاں بلا غازہ و کریم اور بغیر شراب و ریشم کے رہینِ منت ہوئے اپنے رومان پوری رنگینیوں
اور تابناکیوں سے لڑاتے رہتے ہیں۔ ان کے چرمی خیمے ان کے شبستانِ عشرت بھی ہیں اور ایوانِ
آئین ساز بھی۔ صحرا کا لامحدود و یکتا خاموش ماحول ان کی تعلیم گاہ بھی ہے اور رسد گاہ بھی۔ سیاست،
قانون، معاشیات فنونِ عالیہ کے سب نکات ان کے اندر آپ ہی آپ حل ہو جاتے ہیں اور سیاستِ
مدن اور راس المال کے سب آثار چڑھاؤ اسی طرح متحرک رہتے ہیں جس طرح مہیب جنگلوں میں

بھانت بھانت کی نمو اُگتی سُوکھتی، سُوکھتی اُگتی ہے۔

اور سُہیل! میں نے خیال کیا کہ آج دو سو سال سے مشین انسان کو دیتی خود کفالت ہے
بھی نسل چکی لیکن اللہ اللہ! یہ فرزندانِ صحرا آج بیسویں صدی کے وسط تک اپنی صحرائی خود کفالت، کو تمدن کی اولیں شعاعوں کے لمس سے بچانے کے لیے ایٹم بمب اور پنسلین دونوں سے بر سرِ پیکار ہیں، اور میں نے پھر ایک گہری نگاہ ڈالی تو ان کے ساتھ کہیں کہیں ولایتی ساخت کی چیزیں اور کپڑا وغیرہ نظر آیا۔ اوہو! میں نے خیال کیا اتنے شدید گریز و فرار کے باوجود بھی یہ بے چارے "حضرت ڈالر" کی ہتھ پھیری سے محفوظ نہیں! اور میں نے سوال کیا۔

"تمہارے شکار میں سے تو کسی چیز کی کھپت بازار میں معلوم نہیں ہوتی پھر تم کو یہ سامان خریدنے کے لیے روپیہ کہاں سے ملتا ہے؟"

"ان میں سے بعض چیزیں تو مشن کے پادری صاحب ہمیشہ پیچھے بانٹ جاتے ہیں۔" اور پھر ایک جانب پڑے ہوئے ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اور خس، یہ خس — جب ہم شکار کھیل کر ذرا سستاتے ہیں تو جاڑوں میں یہ خس کھود کر جمع کر لیتے ہیں اور گرمی شروع ہوتے ہی خس کے ٹھیکیدار اسے شہروں میں بھر کر لے جاتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "خس! اور معاذاللہ سہیل! میرے شامہ پر ایک ضرب سی پڑی، جاڑوں میں خس کا تخیل ہی کتنا روح فرسا ہے دوست! ذرا غور تو کرو۔ اور پھر ستم بالائے ستم گرمی شروع ہوتے ہی خس سے محرومی! وائے بدنصیبی جب مئی جون کے آفتاب کی کرنیں ان کے چرمی مسکنوں کو بھٹیوں میں تبدیل کر دیتی ہیں تو ان کی دسمبر جنوری کی سونگھ سونگھ کر کھودی ہوئی خس متمدن دنیا کے اجارہ داروں کے شبستانوں میں کونے کونے کے اندر دسمبر جنوری کی ہوا باندھ دیتی ہے۔ لیکن واہ ری بے نیازی۔ ان کے اسفندیاری جسموں پر جس قدر گرم ہو کر آج دسمبر جنوری کے جھونکے لگ رہے ہیں اتنے ہی سرد بن کر مئی جون کے تھپیڑے پڑتے ہیں، ان کے پست خیموں سے جیٹھ بیساکھ کی لوئیں بھی منہ چڑاتی کھسیانی ہو کر نکلی چلی جاتی ہیں اور ماگھ پوس کی بیتیں ٹکرا ٹکرا کر اُلٹی جا پڑتی ہیں۔ جنوری لغایتہ دسمبر اپنے خیموں کے اندر ہی نہیں زمین و آسمان کے درمیان کی کل فضاء ان کے حق میں AIR CONDITIONED رہتی ہے اور موسم برشگال کی کل تبدیلیاں اور نظام شمسی کے تمام

انقلاب ان کی بے نیازی کے سامنے سر جھکائے کٹتے پٹتے نکلے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ خالص انسانی زندگی کا دھارا پہاڑوں کی بلندیوں اور گھاٹیوں کی پستیوں میں خود ہی اپنی سطح تلاش کرتا ہوا تندگامی اور سلامت روی کے ساتھ رواں ہے۔ بغیر بھاپ بجلی اور تیل کے سہارے کے!۔ اپنا راستہ آپ بناتا! متمدن دنیا کی سب روپہلی سنہری قدروں کو اپنی رَو میں خس و خاشاک کی طرح اڑاتا یہ قافلہ اپنے بے سنگ و میل سفر میں رواں ہے....

اور سہیل! آج اگرچہ قاعدہ سے ان کے ساتھ شکار میں میرا پارٹ وہی رہا ہے جو مشہور ضرب المثل "شکاری، شکار کھیلیں اور...... ساتھ ساتھ پھریں" میں ساتھ ساتھ پھرنے والے کا ہوتا ہے مگر ایسے ساتھ ساتھ پھرنے پر ساری عمر کے شکار قربان ہیں دوست، وہ لطف آیا! کاش تم میرے ساتھ ہوتے تو کتنا لطف اٹھاتے ہم دونوں! اور شکار سے تو ڈیڑھ دو بجے فارغ ہو کر ان کے خیموں پر پہنچ گیا تھا مگر وہاں ان کے مذہبی، سیاسی، سماجی جو کچھ کہو سب کچھ رہنما امریکن مشن کے پادری صاحب کو دار د پایا اور مغرب تک ان سے مباحثہ کرتا رہا اور جب وہ اپنے کیمپ کو رخصت ہو گئے تو پھر مغرب کے وقت میں بھی چلنے لگا مگر خانہ بدوشوں نے اپنی جنگلی تواضع میں مجھ کو روک لیا اور دس بجے تک ان کی محفلِ رقص و سرود دیکھ کر دن کے شکار کی تکان تو تھی نہیں البتہ وہ خفت اتارتا رہا جو آج ان کے برچھے کے مقابلہ میں میرے رائفل کو ہوئی تھی۔ اگرچہ دس کے بعد بھی اُٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا مگر دوسرے دن کے پروگرام کی تیاری کے خیال سے اٹھ آیا پھر بھوک نے بھی حملہ کیا تھا اور چائے بھی نہ ملی تھی سہ پہر کی، ٹھیک ہے، تھرموس میں بھری ہوئی چائے پی ضرور تھی مگر طلب بجھی نہ تھی۔ گیارہ بجے کھانا کھایا اور پھر ایک پیالی چائے پی لی، لہٰذا تمام دن کی روئداد سامنے آنے لگی اور نیند رُوٹھ گئی اور جب نیند روٹھ گئی تو پھر تمہیں خط لکھنے بیٹھ گیا۔ نیند نہیں منتی تو تم ہی کو منالوں۔

سہیل! ان کی محفل چھوڑے ہوئے مجھ کو اس وقت ڈھائی گھنٹے ہو گئے اور لکھتے لکھتے جب ذرا نظر اٹھاتا ہوں تو کیمپ کے روزن سے ان کی جلتی ہوئی آگ کی سُرخ سُرخ روشنی دیکھ کر آنکھوں میں سرور اور دل میں تازہ گدگدی دوڑ جاتی ہے وہ دھوئیں کے شامیانے تلے ان کی زندہ محفلِ رقص و طعام گرم ہے۔ یقین ماننا سہیل! کہ ہم کسی جگمگاتی عشرت گاہ میں سفید براق

میزوں کے گرد جھکے ہوئے بید کی کرسیوں پر بیٹھ کر سچی چینی اور کچی چاندی کے اتصال کی کھنک اور جام و مینا کے ٹکراؤ کی بلوریں جھنکار کے ساتھ پیہم نغمہ کی مدد سے بھی وہ سماں نہیں باندھ سکتے جو ان فطرت زادوں نے آگ پر بھُنتے ہوئے سانبھر کے اَدھ کچے گوشت اور ہرن کے بچے کی کھال سے منڈھے ہوئے دف کے زور سے جنگل کی تاریک و بسیط فضا میں باندھ دیا ہے۔ یہ جنگلی تقریباً روزانہ جاڑوں کی لمبی راتوں کا شروع حصہ بڑی بھاری آگ کے گرد ناچنے گانے میں صرف کرتے ہیں۔

سہیل! کیا تمہیں باغوں اور پارکوں کی تراشی ہوئی یکسانیت ہی خوب صورت اور نظر فریب معلوم ہوتی ہے، سچ بتانا جنگل کی آزاد و بے لگام اُبلتی ہوئی لامحدود نمو کیا اس سے کہیں زیادہ متناسب اور فردوس نظر نہیں ہوتی؟ بھیّا یقین ماننا ہماری ساری تماشہ گاہیں جو بجلی اور کیمرے کے بل پر چمکتی اور تھرکتی ہیں اور گراموفون کے زور پر گاتی بجاتی ہیں دنگ ہیں ان فطرت زادوں کی گرماگرم جیتی جاگتی محفل کے سامنے! سنسناتی ٹھنڈی ہوا کے متحرک ایوان میں یہ عورت مرد ناچ رہے ہیں! گا رہے ہیں! دکھانے کے لیے نہیں، صرف ناچنے اور گانے کے لیے ناچ رہے ہیں گا رہے ہیں! سڈول عضلات اور تیکھی چتونوں کی تجارت کے لیے نہیں، رونگٹے رونگٹے کے رومانی تقاضہ سے مجبور ہو ہو کر آہنی جسموں سے سچے فولاد کی لچک کا جمالیاتی مظاہرہ کر رہے ہیں! تمام دن مریخ کے شکاری دور سے گذرنے کے ردِ عمل میں مشتری کے موسیقی سایہ میں تھرک رہے ہیں۔ اپنے شکار کے کھال کی دَف اور سینگ کی قرنا بجا بجا کر صید افگنی کے سپاہیانہ فن سے موسیقی کے فائن آرٹ کو جنم دے رہے ہیں۔ پانچ ہزار سالہ پُرانا گیت گا گا کر ہماری جگمگاتی، گنگناتی "نقل" کی منزل پر پہنچی ہوئی بلوریں دنیا کی تابناک تماشہ گاہوں کا مضحکہ اُڑا رہے ہیں! اور براہِ راست فن کارِ فطرت سے اکتساب کیے ہوئے خالص آرٹ کا آغاز و مظاہرہ کر رہے ہیں۔

پیارے سہیل! اگر وہ گیت جو انسان نے امکان کے ظلمت خانے سے نکلتے ہی گایا، سُننا ہو تو ان کی محفل میں بیٹھو! اگر حیوانی جسم میں سچ مچ بجلی کی لپک کا نظارہ کرنا ہے تو ان کا ناچ دیکھو اور اگر آدمی کو ملک الموت کی طرح ٹوٹتے دیکھنا چاہتے ہو تو ان کا بے پناہ شکار ادر

طاقت و بے باکی کے ساتھ آزادی و پاک دامنی کے ملے جلے مجسمے دیکھنا ہیں تو ان کی روغن کی ہوئی سی آبنوسی عورتوں کے نیم عریاں جسم دیکھو! ان کی عورتیں! صحیح معنی میں انسانی کھیتیاں! سات پردوں اور ہزار پابندیوں کے درمیان رہنے والیوں سے بھی زیادہ اپنے برہنہ جسموں میں ڈھکی ہوئیں۔ کانوں میں ہڈیوں کے زیور اور گلے میں پنجوں کے ہار پہن کر اور خرگوش لومڑی کے چمڑوں سے ستر پوشی کر کے سوسائٹی کی رنگین و زریں لیڈیز سے کہیں زیادہ فارورڈ اور آزاد خیال! اور حویلی کی شرمیلی نویلی دلہنوں سے زیادہ باحیا و عصمت مآب! غرض سہیل! اگر انسان کو آدمی کے اصلی و نسلی روپ میں دیکھنا چاہتے ہو تو انسانیت کو تمدن و تہذیب کے ایوانِ طلاء کار پریوں ہی ڈھاڑیں مار مار کر سر پیٹتے چھوڑ دو اور آؤ اس پتھریلی، خاکی، بناتی اور چرمی سوسائٹی کا مطالعہ کرو اور زمین، ہوا اور سورج کے ربط ضبط سے اپنی ضرورت کے مطابق بھرپور استفادہ کرتی ہوئی روحِ انسانی کو پُر امن بالیدگی میں دیکھو!

۷ار دسمبر (۱۰ بجے شب)

کل رات کا بڑا حصہ خانہ بدوشوں کے ناچ اور تمہارے خط کی نذر ہوا اور نہ معلوم لکھتے لکھتے کس وقت میں سو کر رہ گیا، کیوں کہ تم کو خط کیمپ کاٹ پر بیٹھ کر لحاف میں دبکے دُبکے لکھ رہا تھا اور خط ختم کر کے ہی سونے کا ارادہ تھا مگر دن کی تکان اور لحاف اور چارپائی کے نشوں نے دبا لیا اور صبح کو آنکھ کھلی۔ خیر آج کے پروگرام کی تفصیل تو بعد میں لکھوں گا ابھی تو کل ہی کی آپ بیتی کما کم ہے سُنانے کو۔ تم سمجھتے ہو گے کہ چوں کہ ان جنگلیوں کے ساتھ شکار میں پڑ کر خوب احمق بنا ہے، لہٰذا اس ذکر سے قصداً احتراز کر کے ان کی سماجی و معاشی صورت گری کر کے خط ختم کرنا چاہتا ہے۔ مگر میں تم کو اوپر لکھ چکا ہوں کہ کل علی الصبح جب میں ان کے خیموں پر پہنچا تو یہ لوگ شکار جانے کی تیاری میں تھے اور میرے ہتھیار ناقص ہونے کے سبب مجھے اپنے ساتھ شکار میں لے جانے کے قابل نہ سمجھتے تھے، خیر میں نے مجبوراً ان کا شکار دیکھنے ہی کا ارادہ کر لیا اور آج ان کا جال کا پروگرام تھا۔ ان کے جال جسے یہ اپنی مخصوص بولی میں "کھابڑ" کہتے ہیں، جال کیا ہوتے ہیں، موٹی موٹی رسیوں کے تین تین انچ مربع پھندوں کا پچاس پچاس گز لمبا اور قدِ آدم چوڑا

سلسلہ ایک۔ ایک جال ہوتا ہے، یوں تو میں ان کی ہر چیز سے متاثر ہوا اور آج ان کے کتوں کے شکار سے کچھ کم کل ان کے برچھوں کے شکار سے بھی نہیں ہوا تھا مگر سب سے زیادہ ان کے جالوں کی مضبوط ساخت سے مرعوب ہوا۔ اور میں نے ان کی رسیوں کو پہچان کر کہ نہ تو یہ پاکستانی جوٹ کے ریشہ کی ہیں اور نہ ہندوستانی سنتی کے، برجستہ سوال کیا کہ یہ کاہے سے بٹی ہوئی ہیں تو انھوں نے بتایا کہ برسات میں جنگل سے ڈھاک کی باریک باریک جڑیں کھود کر اور انھیں کوٹ کر ان کا ریشہ تیار کیا جاتا ہے اور اس سے رسیاں بٹ کر جال بُنے جاتے ہیں، جُوٹ اور سَن اس کی مضبوطی کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں ہوتی۔

اور سہیل! جب میں نے ان سے ان کے وطن کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے اس کی جغرافیائی حدود کے متعلق کچھ I AM MONARCH OF ALL I SURVEY قسم کا جامع جواب دیا اور جو کچھ بتایا اس سے میں نے اندازہ کیا کہ یہ لوگ بندھیاچل کی ترائیوں سے چل کر وسط ہند کے جنگلات پار کر کے اودھ فاریسٹ سے گزرتے ہمالیہ کے دامنوں تک پہنچتے ہیں اور پھر اسی طرح موسموں کا لحاظ کرتے ہوئے پلٹتے ہیں اور بس یہی ان کی لامحدود بازی گاہ ہے جس کے اندر یہ چھوٹے بڑے قبیلوں کی شکل میں متحرک خدا کی وسیع زمین کو اپنا وطن بنائے ہوئے ہیں۔ ان کا وطن جس میں کاغذی حد بندی کی تخصیص نہیں مگر تمدن اور مدنیت کے گریز و بغاوت میں ان سب قبیلوں کا عملی فلسفہ ایک فیڈریشن کے جیسے شعور میں ہے۔

اور سہیل! میں تو ان کا سب کچھ دیکھ کر اپنا سب کچھ قربان کر بیٹھا اور جی چاہا کہ اپنی ڈالر اور ایٹم کی زرّیں و بازدہ دنیا سے سات ہزار سال پیچھے کو بھاگ جاؤں اور تمدن کے اس INFECTED ایریا سے نکل کر ان میں گھل مل جاؤں اور خالص آدمی ہی آدمی بن کر رہ جاؤں، اور امن، آزادی، خلوص، تندرستی اور بہادری کی اس صحرائی حیثیت سے پھر ایک مرتبہ اپنا سفر جاری کر دوں۔ اور بھیا انھیں دیکھ کر مجھے ان کا اشتیاق اس درجہ بڑھ گیا کہ میں ان کی ہر بات پر تیار ہو گیا اور ان کا شکار دیکھ کر تو مجھے اتنا رشک آیا کہ جی میں آیا کہ اپنا ہائی ولاسٹی رائفل توڑ کر پھینک دوں۔ وہ لپنے لپنے سروں پر جال لاد کر چلے، اور

یہاں تک، کہ ایک مخصوص مقام پر مجھے اپنا بیل تانگا بھی چھوڑ دینا پڑا اور دو ڈھائی میل پیدل چلنے کے بعد انھوں نے گھاس کے ایک بڑے حصہ کی نظری پیمایش کی اور اشارہ کرتے ہوئے اپنی بولی کی مخصوص شکاری اصطلاحات میں سرگوشیاں کیں۔

تقریباً سو آدمی۔ تھے اور کم و بیش اتنے ہی جال! اور وہ یہ جال لے کر ایک عسکری نظم جیسے قاعدہ سے سفر مینا کے سپاہیوں کی طرح نپے تُلے قدم بڑھاتے اپنی نظری پیمایش کیے ہوئے صحیح حساب کے ساتھ پھیل کر ایک ماشینی نقشے کے ساتھ اپنا کام کرنے لگے۔ انھوں نے اپنے برچھوں کی نوک سے ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو انچ زمین کھود کر قدِ آدم سے کچھ بلند بانس جو ہر جال کے ساتھ کئی کئی تھے ایستادہ کر دیے اور ان پر جال ٹانگ دیے اور دیکھتے دیکھتے میلوں مربع قطعہ پر جالوں کی قدِ آدم دیواریں کھڑی کر دیں۔

اور جب میں نے اپنی شکاری دُوربین سے پرتالا تو بہت جلد سمجھ لیا کہ پانچ چھ میل مربع اراضی پر انھوں نے اچھا خاصہ جالوں کا گورکھ دھندا پھیلا دیا ہے۔ انھوں نے سو میں سے جال ایک ایک، ڈیڑھ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلہ پر اس طرح کھڑے کیے تھے کہ اس لُوپ، LOOP کو جو دو جالوں کے درمیان تھا۔ تیسرا آگے والے فرلانگ بھر کے فاصلہ پر گھیر کر پُر کرتا تھا اور اسی طرح میلوں کے گرد میں ایک کی سیدھ بچا کر نکاس کا راستہ مسدود کرتے ہوئے دوسرا جال تنا کھڑا تھا اور میں نے تمام انتظام اور باقاعدگی کو دیکھ کر اندازہ کیا کہ ALTERNATE طریقہ پر جالوں کی دیواریں اس طرح قایم کر کے نکاس کے راستوں پر حائل کر دی ہیں کہ اس چار پانچ میل کے قطعہ کے اندر جو بھی جانور آجائے گا نکل کر جا ہی نہ سکے گا۔ اور جب میں نے اور زیادہ غور کیا تو اندازہ کیا کہ جتنے جال کھڑے ہیں وہ مربع کے ایک۔ نہ ایک ضلع کا کام کر رہے ہیں اور پورا گھیرا تین سمتوں سے مربع کی شکل میں ہے۔

اور سہیل! کیا بغیر پیمانہ پرکار اور بلا جریب فیتے کے ان کی یہ تقسیم قابلِ تحسین نہ تھی اور پھر ان کا جال لگانے کا طریقہ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا باقاعدہ پہ ڈسی کرتی ہوئی شکل! اور انھوں نے بیک وقت کام شروع کیا اور یک دم ختم، اور جس وقت شمال والا اپنا آخری بانس نصب کر رہا تھا اسی وقت تین میل کی دوری پر جنوب والا آدمی اخیر بانس نصب کرتے

کام مکمل کر رہا تھا۔

اللہ! اللہ! سہیل! اقلیدس، منصوریشن ٹرگنامیٹری سب کی سب اَزبر ہیں ان کے نپے تُلے قدموں اور بچے ہاتھوں کو! اور جال لگا کر وہ اُلٹے پاؤں قدم دبائے اسی عسکری نظام کے تحت پلٹ رہے تھے اور پلٹ کر پھر وہیں پر جمع ہو گئے جہاں سے چلے تھے اور اب انھوں نے سرگوشیوں اور اشاروں میں اپنی دوسری تقسیم شروع کی۔ اب اس تقسیم شکاری کی حیثیت سے میں نے اپنا FUNCTION دریافت کیا جس پر انھوں نے مجھ ناکارہ عنصر کے مصرف پر غور کیا۔ اور پھر اپنے اس گھیرے سے باہر دوسری حد پر جہاں ان کے جالوں کا سلسلہ ختم ہوتا تھا اور جدھر کو انہیں ہانکا کرنا تھا، اس سمت پر ایک سُوکھے ہوئے درخت کا بلند تنا میری نشست کے لیے تجویز کیا اور جب میں نے دُوربین سے اپنی مجوزہ پوسٹ دیکھی تو غور کیا کہ یہ گھنے ڈھاک کے جنگل سے کچھ دُور ایک سُوکھے ہوئے سہمل کے درخت کا بڑا موٹا تنا ہے جس کی شاخیں اور گُدّھے غائب ہو چکے ہیں اور میں جال لگانے کے طریقے سے بھی سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ جانور کی جبلّت کے مطابق ہانکا کریں گے اور گھاس کے قطعہ سے جنگل کی جانب کو چلیں گے کیوں کہ تم جانتے ہو کہ DISTURB ہو کر جنگلی جانور گھنے جنگل کی سمت راہِ فرار اختیار کرتا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا۔

"اچھا تو پھر میں وہاں پر کیا کروں؟"

"آپ اس کے اوپر آرام کے ساتھ بیٹھ کر ہمارے ہانکے کا تماشہ دیکھیں اور اگر کوئی جانور جالوں سے بچ کر یا جال توڑ کر نکلے گا تو اس ٹھڈے سے سو قدم اِدھر اُدھر نکلے گا۔"

"لیکن اگر کوئی جانور نکلا اور میں نے فیر کیا تو ممکن ہے کہ تمہارے ہانکے ہوئے دوسرے شکار پیچھے کو پلٹ پڑیں اور ہانکا بے کار ہو جائے۔" میں نے کہا۔

ان میں سے ایک نے مسکرا کر انتہائی خود اعتمادانہ تیوریوں سے کہا۔ "آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں پہلے تو آپ کی زد تک کوئی جانور پہنچے گا ہی نہیں اور اگر کوئی گھیرے سے نکل کر کسی طرح پہنچ بھی گیا تو اس کے پیچھے والا سب شکار کسی جال میں پھنس چکا ہو گا اور گھیرا آزاد شکار سے بالکل خالی ہو گا۔" اور یہ کہتے ہوئے اس نے گھاس کے وسیع قطعہ پر کچھ اس انداز

سے نگاہ ڈالی جیسے ایک کسان اپنی تیار فصل پر ڈالتا ہے۔

اس کی بات پر میں نے پھر دُور بین لگا کر جالوں کے گھیرے کو پرتالا۔ یہ خیال کر کے کہ کس بلا کی خود اعتمادی ہے اس کی بات میں شکار جیسے اتفاقی اور حادثاتی کھیل کے متعلق تو سب ناکہ بندیاں اور حد بندیاں دیکھ کر مجھ کو شاہنامہ فردوسی کے وہ کنوئیں یاد آئے جو رستم کے بھائی شغاد نے اس کے لیے کھودے تھے اور جن میں رخش گر گر کر ایک کے بعد دوسرے میں جست کرتا ساتویں میں جا کر مع رستم کے مرا تھا۔

اور میں اس گھاس کے بن میں جگہ جگہ اس سے پیشتر بھی شکار کھیل چکا تھا۔ تمام رات دور دراز کاشتہ رقبوں سے چر کر پلٹتے ہوئے جانور علی الصبح اس میں بیٹھ رہتے ہیں اور اگر دن بھر کوئی انھیں DISTURB نہ کرے تو شام کو یہیں سے اُٹھ کر پھر کاشتہ رقبوں کی جانب چل دیتے ہیں اور اگر دن میں کوئی پریشان کرتا ہے تو اُٹھ کر ملحقہ گھنے ڈھاک کے جنگل میں گھس جاتے ہیں اور کہیں کہیں پر تو یہ گھاس کا سلسلہ نیلوں، سانبھروں، جھانکوں اور ہرن چکاروں کی کان ہوتا ہے۔ مگر میرا پروگرام آج گھاس کے شکار کا نہ تھا اور میں جنگل کو جا رہا تھا۔ لیکن ان ظالموں نے مجھے اتنا مائل کیا کہ اپنا پروگرام ہی بھول گیا اور پھر ان کے شکار سے اتنا مسحور ہوا کہ ہمیشہ کے لیے شکار چھوڑ دینے کو جی چاہتا ہے۔

"اور پھر پھنسنے کے بعد کیا ہوگا؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"آپ کے پاس تو دُور بین ہے، آپ تو سب دیکھ لیں گے وہیں سے بیٹھے بیٹھے، ہم سب قاعدہ کے مطابق بغیر یہ غور کیے کہ کون کون سے جال میں کیا کیا شکار پھنس گیا اپنا ہانکا پورا کریں گے جب ہانکا ختم کر لیں گے تو اپنے اپنے جالوں کی طرف پلٹیں گے اور اتنی دیر میں پھنسا ہوا شکار، تڑپ تڑپ کر خوب اچھی طرح پھندوں میں اُلجھ جائے گا اور ہم اس پھنسے ہوئے شکار کو برچھیوں سے مار مار کر اور پھر جالوں سے نکال نکال کر اپنے خچر بھینسوں پر لاد کر لے جائیں گے۔ اب ہمارا ہانکا کب ختم ہوگا؟ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ اس وقت ختم ہوگا جب ہمارے دائیں اور بائیں بازو کے چاروں اخیر آدمی آپ کے قریب والے یعنی سب سے اخیر والے جال کے دونوں سروں پر اور ادھر پچھم سے بڑھنے والے دونوں آدمی آپ کے جال کے ادھر پہنچ جائیں گے اور جب یہ چھیوں اخیر والے

جال پر جمع ہو جائیں گے تو کام اخیر ہوگا، اور ادھر ہمارے ڈیرہ دں سے عورتیں اور بچے خچر بھینسے لے کر چل دیں گے شکار وہ لاد کر لے جائیں گے اور صبح کی طرح جال ہم اپنے اوپر۔"

"بات ختم کر کے میں اپنی جگہ پر پہنچنے کے لیے تیز تیز بڑھا کیوں کہ وہ سب اپنی ڈیوٹی لے چکے تھے اور میرے پہنچنے کے منتظر تھے۔ تقریباً پندرہ فٹ بلند سیمل کے درخت کا سوکھا ہوا تنا جس کی چھتری جنگل کی سینکڑوں سالہ تاریخی روایات اس ٹھڈ کے سپرد کر کے اور عمر پوری کر کے ٹوٹ کر گر چکی تھی میں اپنے خاص ملازم کے ساتھ یہاں پہنچ گیا جو شکار کی نلوتوں اور جلوتوں میں میرا شریک ہے اور قوم کا بھنگی ہے۔ رائفل میں نے لازم کے ہاتھ میں دے دیا اور بغیر جوتے اتارے ہی لکڑی کی اٹھی ہوئی گومڑیوں پر پاؤں ٹیکتا بندر کی سی ایک جست میں اوپر دکھائی دیا۔ اچھی خاصی چھوٹی چوکی برابر کھُردری اونچی نیچی جگہ پر میں نے اپنے آپ کو پایا۔ نیچے سے اس نے رائفل ذرا اُچک کر بڑھایا اور میں نے اسے جڑ سے لپٹ جانے کی ہدایت کی اور وہ خوب جانتا تھا کہ اس موقع پر چھپنے دبکنے کے سلسلہ میں اس کا کیا فرض ہے۔ اور میں نے دُوربین سے پھر پڑتال کی اور یہ پانچ ہزار سال پُرانے شکار کا ڈرامہ دیکھنے کے لیے بہترین نشست تھی۔ خانہ بدوش میلوں کے گرد میں پھیل چکے تھے اور انھوں نے کام شروع کر دیا تھا اور ان کا طریقہ دیکھ کر مجھے افریقہ کے ان سوڈانی قبائل کا نقشۂ جنگ یاد آرہا تھا جس کی تفصیل ملکہ وکٹوریہ کی سوانحِ حیات میں نیم مورخ انگریز (G.A HENTY) نے ملکہ کی افریقی فتوحات کی تفصیل کرتے وقت لکھی ہے۔ یہ لوگ بھی انہی کی طرح باقاعدہ نیم دائرہ کی شکل میں بڑھ رہے تھے، نہایت سُبک رفتاری اور استقامت کے ساتھ قدم قدم پہ ٹانگا ڈالتے ہوئے۔

پتہ نہیں سہیل تم نے ہانکے کا شکار دیکھا ہے مگر یہ تو تم جانتے ہی ہوگے کہ آج کل جو طریقہ ہانکے کے شکار کا ہم متمدن شکاریوں میں رائج ہے یہ بہت کچھ مغل بادشاہوں سے ہم تک پہنچا ہے اور انگریز شکاریوں نے تھوڑی بہت ترمیم تنسیخ کے ساتھ اس کو اپنا لیا۔ ہمارے ہانکے میں تو جنگل میں قیامتِ کبریٰ برپا ہو جاتی ہے آدمیوں کی تعداد ہانکے کے قطعہ کے رقبہ کے مطابق کم اور زیادہ ہوتی ہے۔ جگہ جگہ نکاس کے راستوں پر محفوظ نشستوں پر شکاری دبک کر بیٹھ جاتے ہیں اور مخالف سمت سے ہانکا کرنے والے قلیوں کی جماعت بڑھتی ہے۔ پیدل ٹٹوؤں پر ڈھول

بجاتی، چیختی چنگھاڑتی کہیں کہیں پٹاخے چھوڑتی شور کے سیلاب کی طرح بڑھتی ہے ان کے دائیں بائیں دونوں سمتوں پر جگہ جگہ آدمی تعینات ہوتے ہیں جو سائڈیں گھیرے ہوئے نمایاں بھی رہتے ہیں اور تھوڑا بہت شور اور حرکت بھی کرتے ہیں تاکہ جانور شکاریوں کی سمت سیدھا بڑھے اور ادھر اُدھر کٹ کر نہ نکل جائے اور شیر کے ہانکے میں یہ آدمی حفاظت کے خیال سے درختوں پر رہتے ہیں انھیں ہماری شکاری اصطلاح میں اسٹاپ (STOP) کہتے ہیں اور یہ ہانکے سے بھڑک کر بھاگے ہوئے جانور کا رُخ ٹھیک شکاریوں کے ناکوں کی جانب ہانکا کرنے والوں کے عین مخالف سمت برقرار رکھنے میں مدد دیتے ہیں اور ہمارے ہانکے میں اس مخصوص قطعۂ صحرا کا امن وامان برباد ہوجاتا ہے اور بدحواس بھاگتے ہوئے جانور اندھا دھند دبکے بیٹھے ہوئے شکاریوں کے قریب سے گذرتے ہیں اور بندوق کا لقمہ بنتے ہیں اور بے تحاشا بھاگتے ہوئے جانوروں کو شکاریوں کی بندوقوں کی آوازیں بھی صدائے بازگشت میں پیچھے سے ہانکا کرنے والوں کے شور میں مل کر سنائی دیتی ہیں۔ جوں جوں ہمارا ہانکا ہماری سمت بڑھتا جاتا ہے۔ اس کا شور قاعدہ کے مطابق کم ہوتا جاتا ہے اور جن جن اسٹاپوں کے محاذ کا جنگل جھڑ جاتا ہے وہ اپنی اپنی ڈیوٹیاں چھوڑ کر ہانکے میں شریک ہوتے جاتے ہیں۔ جنگل کے اس مخصوص قطعہ میں ایک بھنگا یا مکھی بھی اپنی جگہ پر قایم نہیں رہ سکتی۔ ہر چھوٹا بڑا جانور انتہائی منتشر الاعصاب ہوکر کسی نہ کسی شکاری کے سامنے سے گذرتا ہے۔

مینائیں، مرغیاں، تیتر کڑکڑاتے بدحواس اُڑتے ہیں۔ سانبھر، نیل، جھانک، سُور، شیر، گل دار سبھی کو بے تحاشا شکاریوں کے محاذ کی پُل صراط سے گذرنا پڑتا ہے۔ سب کے سب اپنی جبلّت بھول کر گھال میل ہوجاتے ہیں اور ذرا ذرا سے وقفہ سے شکار کی بہتی ہوئی لہریں شکاریوں کے سامنے سے گذرتی ہیں اور بالعموم بلندی پر اطمینان کے ساتھ دبکے ہوئے شکاری دنا دن چھنتے ہیں اور من من بھر دو دو من کا ایک ایک لقمہ عزرائیل غپا غپ نگلتے ہیں اور شکاریوں کی پوری لائن پر موت کا بازار پوری حدت کے ساتھ گرم ہوجاتا ہے اور ایک کامیاب ہانکے میں ایک ایک شکاری کے ہاتھ پر شکار کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ ہانکا کرنے والوں کا شور، بندوقوں کے دھماکے زخمی جانوروں کے ڈکرانے کی آوازیں اور سوکھے پتوں کے اوپر جھاڑیوں میں بے تحاشا

بھاگتے ہوئے جانوروں کا شور ! ایک دفعہ کو تو جنگل، نمونۂ قیامت بن جاتا ہے۔ گھاس سے لے کر دیو پیکر درخت تک زلزلہ میں آجاتے ہیں اور یہاں تک کہ قطعہ خالی ہو جاتا ہے اور بڑھتے بڑھتے ہانکا کرنے والے مزدور شکاری محاذ کی لائن کے قریب نمودار ہوتے ہیں جہاں مقتل گاہ ہوتی ہے اور شکاریوں کی نالیں جھک جاتی ہیں، بازو ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور جوش مندھا جاتا ہے، چہرہ پر کامیابی کی چمک، ہونٹوں پر دل آویز تفاخر کی مسکراہٹ، اور آنکھوں میں مخصوص اسپورٹنگ اسپرٹ کا سرور نمایاں ہو جاتا ہے، سامنے پڑے ہوئے بسمل و نیم بسمل جانوروں پر ہانکا کرنے والے مزدوروں کی دست درازیوں کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ مسلمان مزدور جھپٹ جھپٹ کر تڑپتے دم توڑتے جانوروں پر چھریاں پھیرنے لگتے ہیں اور ذرا دیر میں پھر موت کا سناٹا طاری ہو جاتا ہے اور صرف شکار کو لاد کر کیمپ تک لے جانے کی بت بتاہٹ اور انتظام کی آوازیں رہ جاتی ہیں اور پھر جنگل میں وہی خاموشی ہو جاتی ہے جو ہانکے سے پہلے تھی یا طوفان کے بعد۔

مگر اس وقت میں اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا دُوربین سے ان وحشیوں کے وسیع ہانکے کو سروے کر رہا تھا۔ کتنا پُر سکون! کتنا آہستہ اور کس قدر باضابطہ تھا سہیل ان جنگلیوں کا ہانکا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آہستہ آہستہ مٹھارتے جاتے اور مسلسل 'ہُر ہُر ہُر' کی آواز ایسی ماشینی ہم آہنگی سے نکالتے جاتے کہ ایک میٹھی میٹھی چونکا دینے والی کیفیت سے ان کا گھیرا ہوا تمام نیم دائرہ گونجتا چلتا اور میں نے اندازہ کیا کہ تمام رات کی 'چرائی' کے نیند مار جاگے بھاگے جانور واقعی اس وقت بھڑک کر آہستہ آہستہ اُٹھتے ہوں گے۔ جب یہ ہانکا کرتے ہوئے ان کے بالکل قریب پہنچ جاتے ہوں گے۔ ان کا نرم رو ہانکا میری جانب کو بڑھتا رہا مگر اس نرم روی اور سبک آوازی کے باوجود بھی اتنا محیط اور حاوی تھا کہ اس مخصوص گھیرے کے اندر وہ انچ انچ بھر زمین پر گویا چھا گئے۔ وہ لوگ میری جانب نہایت فن کارانہ انداز میں بڑھ رہے... تھے اور قریب تر ہوتے جا رہے تھے اور میرا ماتھا ٹھنکا۔ ہر حال اب تک جوں کا توں ایستادہ منتظر تھا۔ اور میں نے غور کیا کہ یہ لوگ تقریباً ایک تہائی فاصلہ سمیٹ چکے مگر کہیں سے ایک جانور بھی نہیں اُٹھا! ہلکی ہلکی ہوا کے رُک رُک کر پچھم سے آتے ہوئے جھونکے گھاس میں جزر و مد کی میٹھی کیفیت

پیدا کر رہے تھے۔ زردی مائل سبز گھاس پر صبح کی دھوپ میں چمک چمک کر لہریں اٹھتیں، آہستہ آہستہ ہوا اور گھاس کے اتصال کا سناٹا اور ہانکے والے خانہ بدوشوں کی آوازیں ایک لطیف صوتی انداز میں میرے کانوں میں پڑ رہی تھیں اور دُور بین کے لینس پیچھے پورپ سے پڑتی ہوئی سُورج کی کرنوں کے ساتھ بڑا اچھا کام کر رہے تھے۔ اب ہانکے والوں کا دائرہ تنگ ہو گیا اور بخوبی اس کی ہلالی شکل سامنے آگئی۔ یا اللہ! کیا راز ہے؟ شکار اس گھاس میں پہلے بھی کھیل چکا ہوں اور پھر ابھی اعلیٰ الصبح راستہ میں کاشتہ رقبوں کی جانب سے واپس آتے ہوئے جانوروں کے قدموں کے نشانات بھی دیکھے تھے جو میرے اندازہ میں رات کے اخیر حصہ اور صبحِ صادق کے وقت کے تھے اور میں نے خیال کیا۔

"کہاں مر گئے اتنی بڑی شکار گاہ کے سب جانور! زمین نگل گئی یا آسمان کو اُڑ گئے میرے اللہ!"

اور دیکھتے دیکھتے ہانکا اور بھی قریب آگیا۔ مگر کہیں پر ادنیٰ حرکت بھی دکھائی نہ دی۔ بس وہی تمام قطعہ پر بدستور ہوا کی دھوپ چھاؤں لہریں پڑتی رہیں اور میرا اندازہ تھا کہ کم و بیش سو چرندے برآمد ہو چکے ہوتے اس وقت تک اور جال بھر چکے ہوتے، یوں تو جس وقت میں اس جگہ پر چڑھا تھا تو "شیخ بیٹھا بیٹھا دیکھ" ایک عجیب بیگانگی کا احساس لیے ہوئے تھا۔

اور سہیل! خود ہی سمجھو جس شکار میں ایک پُرانے اسپورٹس مین کو اس وقت چانس ملنے کی امید پر جبکہ شکار سب سے اخیر جال توڑ کر بھاگے اس میں اسے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ مگر اُوپر پہنچ کر ان کے جالوں کی دیواروں کی باقاعدگی! ان کے ہانکے کا پُرسکون محیط اور بے پناہ ہمہ گیری! ان کے بڑھنے کا خوب صورت انداز، گویا پورے کا پورا نیم دائرہ ایک ڈوری میں پرویا ہوا ہے اور سامنے سے ڈوری کے دونوں سرے آہستہ آہستہ کھینچ کر کوئی اسے تنگ کر رہا ہے اور سرکل کے خم دار خط کا ہر نقطہ بیک وقت کسی ایک مستقل طاقت کے تحت نامعلوم طریقہ پر بنا ہوا سائے کی طرح سُکڑ رہا ہے۔ اور میں نے غور کیا کہ وہ سب متفق الحرکاتی کے ساتھ اپنی سبک رفتاری سے بڑھ رہے ہیں کہ دریا کے اندر کھڑے ہوئے تیرتے معلوم ہو رہے

ہیں۔

جوں جوں وہ آگے بڑھے میری ناامیدی بڑھی، اپنے شکار سے ٹل گیا اور یہاں بھی معاملہ خالی ورنہ دیکھ کر تھوڑی بہت تفریح ہو جاتی ـــ مگر یہ گھاس کیوں خالی۔ ہے! جبکہ رات کے آخر حصہ تک اس کے اندر جانوروں کی آمد کا کاشتہ رقبوں کی جانب سے نشانات قدم کے ذریعہ کھوج ملتا ہے۔ میرے دل میں سوال پیدا ہوا۔ یہ آج ساری عمر کا تجربہ کیوں غلط ہو رہا ہے ـــ ایسے موقع کا اتنا مکمل ہانکا! اور کہیں چوہے کا بچہ بھی نہیں اُٹھا۔

دائرہ کافی تنگ ہو گیا۔ میری دُوربین خوردبین سی بن گئی اور میں نے ہوا میں جھومتی ہوئی گھاس کی پھنگیوں پر ایک عجیب لہر سی دیکھی، کچھ سمجھنے کی کوشش کی، لیکن کچھ نہ سکا! مگر انداز سے یہ اندازہ ضرور کر لیا کہ خانہ بدوشوں نے اس رینگتی کھسکتی ہوئی لہر کو دیکھ لیا ہے اور وہ نہایت فن کارانہ چابک دستی سے اپنے ہر جال کی جانب ہانکنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بھیا سہیل! میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے غور کیا کہ یہ لہر ہر جال کے اتنے قریب پہنچ کر کہ ایک قدم آگے بڑھنے میں جال سے ٹکرا جائے، ذرا مدھم پڑتی ہے اور پھر نہایت آرٹسٹک طرز کے ساتھ اپنی مخصوص کھسکتی ہوئی سی سبک رفتاری سے دائیں بائیں کسی جانب کو کترا جاتی ہے اور جال کو صاف بچا کر اس LOOP میں سے گذر جاتی ہے جو دو جالوں کے درمیان میں پڑتا ہے مگر اس LOOP میں سے گذرنے کے بعد اس کے عین سامنے پھر جال پڑتا ہے اور ڈھائی تین سو گز چل کر وہ پھر اس جال سے کتراتی ایک جانب کو بچ کر نکل جاتی ہے اور میرے دیکھتے دیکھتے دس پندرہ جال بچا کر وہ میری طرف کھسکتی چلی آئی اور میں نے اندازہ کر لیا کہ گھاس کے نیچے نیچے کوئی چیز چل رہی ہے، مگر کتنی ذکی الحس مخلوق ہے یا الٰہی! جال کے بالکل قریب پہنچ کر صاف راستہ کتر جاتی ہے! اندر ہی اندر! میں نے دل میں کہا، اور میں تو تعجب میں دریافتِ حال کے لیے بیتاب تھا مگر جب میں نے دوربین سے اسے ہانکتے ہوئے خانہ بدوشوں کا چہرہ دیکھا تو میری حیرت اور بڑھ گئی۔ سہیل! انتہائی سنجیدہ، بلکہ خونخواری حد تک پہنچا ہوا شکاری پن ان کے بُشروں سے عیاں تھا۔ میں اب تک کچھ نہ سمجھا، میرے دائیں بائیں اور سامنے پورے ہلالی محاذ پر گھاس میں کمر کمر ڈوبے خانہ بدوش

شکاریوں کا نیم دائرہ میرے بالکل قریب آگیا اور وہ بڑھتی ہوئی لکیر جیسے گھاس کے نیچے نیچے اژدہا سا لہراتا چلا آرہا ہے۔ میرے بالکل سامنے آگئی۔ دو ڈھائی سو گز کے اندر۔ میں حیران ضرور تھا مگر مطمئن اک ذرا ہیں سب، حال کھلا جاتا ہے، کیوں کہ سب کچھ میری ہی جانب کو بڑھ رہا تھا۔ مگر میرا جالوں کے گھیرے کی سرحدیں فیر کرنا تو طے ہی نہ تھا اور قاعدہ کے مطابق نہ ہانکے کے اندر کو فیر کر سکتا تھا اور مارتا بھی کیا، ایک ٹیڑھی میڑھی لہراتی لکیر کے سوا اور کوئی چیز تو سامنے تھی نہیں۔

اور اب تو وہ میرے بالکل قریب آگئے تھے، سہیل! تم نے شاید تصویر بھی دیکھی ہوگی پچھلی جنگِ عظیم میں جرمنی نے میدانِ جنگ میں ROBUT اتارے تھے بس وہ فولادی آدمیوں کی مشینیں کچھ ایسی ہی بڑھتی ہوں گی لڑنے کے لیے اور سہیل! نظارہ اتنا دلفریب اتنا ماشینی اور ساتھ ہی ساتھ اس قدر معمہ پن لیے ہوئے کہ تماشہ گاہ میں بیٹھا محسوس کر رہا تھا۔ نہ سہی شکار کا EXITEMENT یہ لہراتا ہوا TEMPO کس سے کم تھا۔ جیسے اٹھارویں صدی کے مغربی لٹریچر سے کوئی افسانہ پڑھ رہا ہوں۔

اور افسانہ اختتام پر آگیا مگر نتیجہ کے معمہ پن میں ذرا کمی نہ آئی۔ ماحول پر جتنا سکون اور حرکت میں جتنا DISCIPLINE کار فرما تھا اتنی ہی میرے اندر دریافتِ حال کی شدید بیتابی متحرک تھی۔ جیسے گھاس سے نیچے شطرنج کا بادشاہ چوطرفہ چال چلتا گشت بچاتا نکلا چلا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ بچنے میں چند گز ہانکا کرنے والوں کی جانب رُخ کرنا پڑتا پھر سیدھا ہو جاتا جو عام جنگلی جانوروں کی جبلّت کے منافی سا ہے۔ اور یہاں تک کہ خانہ بدوش ہانکا کرنے والوں کا ہراول میرے بالکل قریب آگیا اور نوبت اخیر جال پر پہنچ گئی اور یہاں پر ہراول کے چھیوں آدمیوں نے ہر چند کوشش کی کہ یہ اس جال سے ٹکرا جائے مگر وہ لہر آخیر جال کی ٹکر بھی بچا کر بائیں جانب کو مڑی اور نہ معلوم کتنے جالوں کی ٹکر بچا کر جالوں کے گھیرے سے صاف باہر آگئی۔ ادھر ہلال کی نوکوں والے دو خانہ بدوش اور دو دو شمال و جنوب کے بازوؤں والے بالکل آملے اور لمبا چوڑا ہلال سمٹتے سمٹتے صرف چھ آدمیوں کا ایک مثلث مساوی الساقین بن گیا اور ایک دوسرے سے چند فٹ کے فاصلہ پر وہ چھیوں آدمی مثلث

مساوی الساقین کے تینوں زاویوں پہ دو دو کھڑے تھے۔ اور اب وہ آسیبی ناقسم کی چیز ان تینوں کے درمیان ٹھہری ہوئی تھی اور چھیوں نظروں کی ٹکٹکی عین وہیں پر جمی ہوئی تھی اور اب جیسے وہ چھیوں آئندہ حرکت کے منتظر تھے' برچھے تانے ہوئے۔ ہمہ تن توجہ اور مجسم بہادری بنے ہوئے — اور تقریباً دو تین منٹ حرکت رکی رہی اور معاً میرے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح لہرا گیا اور شروع سے آخر تک سب کچھ سمجھ میں آگیا اور دیر میں سمجھ میں آنے کا سبب یہ تھا وہ دور دور میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہاں پر غیر متوقع طور پر یہ نکل سکتا ہے۔ باوجودیکہ میرے ساتھ میں ۴۰۴ ویسٹلی رچرڈ کار وائٹ ہائی ولاسٹی رائفل تھا مگر میں اس شکار کے لیے اس وقت تیار نہ تھا جو میرے سامنے آنے والا تھا اور نہ موقع دیکھ کر خود کو اس کی اہمیت کے لیے تیار کر سکتا تھا۔ میں یہاں نیل' سانبھر' جھانک چیتل کے لیے آیا تھا۔ اگرچہ یہ تو شیر ہی تھا میرا رائفل ہاتھی تک کے لیے کافی تھا اور اس وقت بھی میں اس اہم شکار کے لیے تیار ہو جاتا جس سے دوچار تھا مگر جب میں نے سائنٹیفک انداز سے پرتالا تو میری نشست کی اونچائی تو بالکل ہی غلط تھی نہ تو بربینڈر کے معیار پر صحیح اترتی تھی اور نہ جم کاربٹ کے اور بیٹھتے وقت میں اس پر توجہ بھی کیوں دیتا میں تو یہاں چرندوں کا شکار کرنے آیا تھا۔ پھر میں نے غور کیا کہ اگر یہ گھاس سے نکل کر ادھر چٹیل میدان میں سے گذرتا ہمارے سامنے کھل کر بھی آیا تو فاصلہ غلط ہے اور جنرل نائٹ انگیل کے تجربہ کے مطابق کم سے کم ساٹھ گز سے گولی مارنا چاہیے اور اس سے کم میں شکاری کے لیے خطرہ ہے اور یہ تو بمشکل تیس چالیس گز ہے اور میں اسی چکنم میں تھا کہ یک دم پیچھے والے دونوں زاویوں سے چاروں خانہ بدوشوں کی ایک آواز بلند ہوئی "گلہا"

اور سہیل! تمہیں کیا بتاؤں شاید کسی سنیما کا کٹ آؤٹ بھی اسکرین پر یہ منظر پیش نہیں کر سکتا اور میں نے گھاس میں سے ایک بجلی سی تڑپ آگے کو اچھلتے دیکھی اور اسی جست کے ردِ عمل میں رو ما کے برچھے نے اسے پیچھے پٹخ دیا۔

سہیل! تمہیں کیا بتاؤں تفصیل میں تو بڑی دیر لگے گی اور اسے تو شاید علم الحرکات کا ماہر بھی قرار واقعی تفصیل نہ کر پاتا۔ گھاس میں سے شیر کی جست اور اسی جست پر رو ما کا ذرا

جُھک کر اسے نیزہ پر لے کر نہایت فن کارانہ انداز میں اُلٹا پٹخنا اور جیسے اسی حرکت کے ساتھ ساتھ بیک وقت چھیوں نیزوں کو غپا غپ گھسیڑ کر شیر کو چومیخا کر کے دبا لینا ایک ہی حرکت ہوئی اور جب نگاہ نے ذرا ٹھہر کر جائزہ لیا تو شیر پیٹ سے لے کر گردن تک چھ بھالوں میں ٹھنکا ہوا زمین پر دم توڑ رہا تھا بظاہر اس نے روما پر عاجز ہو کر حملہ کیا تھا مگر میرے خیال میں اس مثلث مساوی الساقین کے تکونے حصار سے وہ روما کے سر کے اُوپر سے جست کر کے نکل بھاگنا چاہتا تھا اور شیر نے گھبرا کر یہ جست لگائی تھی جو روما نے اپنے برچھے پر لے لی' میرے رائفل کا سیف چڑھا رہ گیا اور شیر مجھ سے چالیس گز کے اندر چومیخا اخیر سانسیں لے رہا تھا اور اس ہنگامہ میں میرے رائفل کی بٹ بار بار میرے کندھے پر آئی کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ عنقریب یہ برچھوں کی بھالیں سونت کر اور ان میں سے دو چار کو نوچ کھسوٹ کر نو دو گیارہ ہو گا اور ان کے درمیان سے نکل کر میری صاف زد پر گذرے گا مگر بھیا سہیل! توبہ کرو پار کر دیے۔ پورے پورے برچھے ان جنگلیوں نے اور چار چار انگل بانس تک گھسیڑ دیے اندر۔

تم جانتے ہو کہ شیر غیر معمولی ذکی الحس درندہ ہوتا ہے اور اس کے کان بڑے تیز ہوتے ہیں گھاس جال سے ٹکرا کر بہت ہی آہستہ مانوس قسم کی آواز پیدا کرتی تھی جس کا سُن لینا کچھ شیر کے ہی سامعہ کا حصّہ تھا اور اُس سے وہ خطرہ کا احساس کر کے صاف کترا جاتا تھا مگر جب اس نے سب جال بچا کر بھی اپنے آپ کو گھرا پایا تو یہ حرکت کی۔ اگرچہ روما اور اس کے ساتھیوں کا خیال ہے کہ وہ روما کے مُنہ پر عاجز ہو کر لپوٹا رسید کرنے کا حملہ تھا لیکن میرے خیال میں وہ بچ کر بھاگ نکلنے کی جست تھی جس کو روما نے اپنے برچھے کی نوک پر لیا اور دیکھتے دیکھتے دُم کا کوڑا لہرا کر پٹ سے زمین پر لگا اور یہ شیر کے جان نکلنے کی آخری شہادت تھی۔

چھیوں خانہ بدوش ایک دوسرے کی جانب فتح مندانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

میرے رائفل کے میگزین میں چھیوں کارتوسوں کی کارڈائٹ پاور کے کیمیاوی اجزا مشتعل ہو کر گیسیں بننے کی آرزو میں جہاں کے تہاں رہ گئے اور ہزاروں من کی جھوک اور ہزاروں میل فی سیکنڈ کی رفتار سے نکلنے والی گولیوں کے شیل جوں کے توں ٹھنڈے اور ساکت کارتوسوں میں اٹکے رہ گئے اور خالص انسانی حرکت میں شیر ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ اور سہیل! جیسا کہ میں اوپر لکھ

چکا ہوں کہ میں تو اتنا مفصل لکھنے کے بعد بھی اس حرکت و تصادم کی تشریح تمہارے سامنے قرار واقعی نہ کر سکا اور میں کیا شاید اسے علم الحرکات کا کوئی ماہر بھی بھرپور الفاظ میں نہ سمو سکتا تھا۔ شاید کسی مووی کیمرے کا لینس اس کی کہربائی شعاعوں کو جذب کر کے تھوڑا بہت ریکارڈ کر سکتا۔

اور بھئی وہ تو ان جنگلیوں نے میرے سامنے آنے کی نوبت ہی نہ آنے دی اور سامنے آتا بھی تو شاید میں جیسا کہ ابھی لکھ چکا ہوں شیر جیسے اہم شکار کو غیر سائنسی اور خلاف قاعدہ جگہ سے گولی نہ لگاتا اور SAFET-FIRST کے اصول کو مدِ نظر رکھتا کیوں کہ جیسا کہ میں نے بتایا کہ میری بلندی فاصلہ اینگل کوئی چیز بھی مقرر کردہ شیر کے شکار کے اصولوں پر پوری نہ اترتی تھی اور ہر چیز شیر کی موجودگی کا احساس کرتے ہی میرے دماغ میں آ کر مجھ کو ہوشیار کرتی چلی گئی۔

شیر کا شکار میں اس سے پیشتر بھی کر چکا ہوں لیکن اس کے لیے گھر سے تیاری کر کے چلا چلا جاتا ہے اور میرے کیمپ کے ساتھ شیر کے شکار کی کوئی تیاری نہ تھی تو سہیل! تم ہی بتاؤ جب میں صحیح بلندی پر نہیں تھا، جب مجھ سے وہ محفوظ فاصلہ کے اندر نہ گذرتا، جب نشانہ لگانے کے لیے ٹھیک اینگل نہیں پڑ رہا تھا اور جب کیمپ کے ساتھ کوئی سامان شیر کے شکار کے ضروری اور حفظِ ماتقدم کے لوازمات میں سے نہیں تھا تو شیر پر گولی لگانے کا ارادہ بھی کیسے کر لیتا جو اس وقت شیخی میں تم کو یہ لکھ دوں کہ اگر خانہ بدوشوں کے درمیان سے نکل کر بھاگتا تو میں ایک گولی میں ختم کر دیتا ورنہ خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو تم سب کہتے کہ میاں ان جنگلیوں میں اور تم میں فرق کیا رہا جو بانس میں فٹ بھر لوہے کی بھال لگا کر شیر سے دست بدست مجادلہ کرنے کے لیے چار پانچ گھنٹہ اس کا تعاقب کرتے رہے اور میں نے اپنے بھنگی ملازم کو آواز دی جس کو جڑ پر بٹھا کر میں خود اوپر آ بیٹھا تھا مگر صدائے برنخواست! میں رائفل گلے میں ٹانگ کر نیچے اترا۔ مگر وہ اب تک بدستور تنے سے چپکا ہوا تھا۔ برچھا ایک جانب اوندھا پڑا ہوا رنگت مٹیالی، آنکھیں بھرائی پتھرائی تمام جسم میں رعشہ اور یہ عالم کہ جیسے سوکھی لکڑی میں پیوست ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور شاید مجھے مع رائفل کے دیکھ کر اسے کچھ ڈھارس سی ہوئی۔

سہیل! تم جانتے ہو گے کہ دیہاتی و قصباتی زمیندار بھنگیوں کو اپنے باڈی گارڈ کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور یہ باڈی گارڈ بستیوں میں ہمہ وقت "ضربِ سلطانی" کے نشہ میں چور شیروں اور تیندوؤں کی طرح غرّانے اینڈتے پھرتے ہیں مگر اس وقت مجھ کو دیکھ کر کیا بُلانے پر بھی نہ اُٹھ سکا اور تیوریوں میں ضرور یک گونہ اطمینان کی نشانیاں پیدا ہوئیں مگر اپنے مٹیالے کپڑوں میں تنے پر ایسا چمٹا ہوا تھا جیسے سوکھی لکڑی اُبھری ہوئی ہے۔ تمام انداز سے الامان والحفیظ پکارتا ہوا۔

سہیل! وہ خاکروب تھا۔ اس کی تاریخ شاہد ہے کہ اسے تمدن نے مطیع کر کے اپنی ہسٹری کی کتاب میں ایک باب شودر کے نام سے شامل کیا اور کتے کے ساتھ اسے بھی پکڑ کر وفادار، کالقب دیا۔ ورنہ آج بھی اس کے جسم پر عضلات و اعصاب کی رسیاں رو ما سے کم بٹی ہوئی نہ تھیں، مگر اس کی رسیاں اس کے جسم و ضمیر کو جکڑے ہوئے تھیں اور وہ تمدن کا غلام تھا اور وہ تو وہ اس کا نام دار آقا "عبدالماشین" تھا لیکن "ابوالماشین" روما کا کھردرا برچھا آج بھی تمدن کے سامنے بلند تھا اور روما کے خون کی سُرخی براہِ راست دل سے اکتسابِ رنگ کیے ہوئے تھی مگر اس کے خون کا راستہ دماغ کی تابناکیوں سے کسبِ ضیاء کراتے ہوئے تھا تو بھئی کیا ڈر ہے کہ جب اس سے دس گز کے اندر آدمی اور شیر میں دست بدست لڑائی ہوئی تو اس کا خون ڈر کے مارے خشک ہو گیا۔

اور میں نے روما سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "کیوں جی جب تم شیر کے سامنے آئے تھے تو تم نے اپنی حفاظت کا کیا بندوبست کیا تھا۔ تم تو یوں ننگ دھڑنگ شہتیر کے شہتیر شہتیر دیے سامنے کھڑے تھے!"

اور ان سب نے جیسے یک گونہ طنزیہ حقارت کے انداز میں میری جانب دیکھا اور روما نے ٹھیٹ اسپورٹس مین والی بیباکی سے اپنا خون آلود برچھا ذرا مضبوطی کے ساتھ پکڑ کر میری جانب کو بڑھایا اور فخریہ انداز اور خود اعتماد تیوریوں سے کہا۔ "ہمارا برچھا! یہ برچھا ـــــ یہ ہے ہماری حفاظت کا ضامن!" اور پھر اک ذرا توقف کے بعد اپنا یہ جوشیلا سا طرز بدلتے ہوئے اپنائیت کے انداز میں جیسے وہ میری اس ہمدردی کے خیالات سے میرا ممنون سا

ہو رہا ہے اس نے نہایت نرم طریقہ سے کہا۔

" دیکھیے ہم نے ہانکا شروع کرنے کے ذرا ہی دیر بعد اندازہ کر لیا تھا کہ یہاں شکار بالکل نہیں ہے۔ اب سوال پیدا ہوا کہ کیوں نہیں ہے؟ کھوج لگ رہے ہیں! پیشاب مینگنی مل رہا ہے! اور ہم میں سے ہر ایک سمجھ گیا کہ باگھ نکلے گا اور یہ جو ہم اسے دوپہر سے ہانکتے ہر جال پر لا رہے تھے اور یہ کٹ کٹ کر صاف بچ جاتا تھا یہ تو آپ نے اپنی دوربین سے ہم سے بھی اچھی طرح دیکھ لیا۔ اور قاعدہ سے ہم چھیوں کی "ہان" میں یہ باگھ پڑتا تھا جب جال بچا کر باہر نکل گیا تو حساب سے ہم وہاں پر بالکل ٹھیک پہنچے جہاں پر یہ گھرا ہوا تھا اور ہم چھیوں میں سے کسی کو پتہ نہیں تھا کہ شیر کس پر جست کرے گا مگر جس پر بھی جست کرتا وہ اسے ایسے ہی اُلٹا دے مارتا جیسے میں نے دے مارا۔"

اور اس کے مُنہ سے ایک ذرا پختہ عمر کے خانہ بدوش نے بات لے کر کہا۔

" اور آپ یہ تو بتائیے تین چار ہاتھ کا شیر ہوتا ہے اور ہمارا "برچھا" چھ سات ہاتھ کا ہوتا ہے ہم تک شیر پہنچ کیسے جائے گا جب یہ لمبا "برچھا" ہمارے ہاتھ میں ہے اور یہی اس کی لمبائی ہماری حفاظت کا انتظام ہے جس کے متعلق آپ بار بار پوچھ رہے ہیں"۔ اور پھر شیر کی لمبائی اور برچھے کی لمبائی دونوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" دیکھیے نا! — اور ناپ لیں نا"۔ اور یہ کہہ کر اس نے شیر کی دُم سے لے کر مونچھ تک برچھا رکھ کر دکھایا اور کتنی سادہ، سائنٹفک اور عام فہم بات تھی سہیل! ذرا غور تو کرو میرے پاس اس کی اس دلیل کا کوئی جواب تھا بھلا؟ اور زندہ تائید میں مُردہ شیر سامنے پڑا تھا۔

خانہ بدوش جلدی جلدی جال سمیٹ سماٹ کر چل پڑے اور روما اور اس کے پانچوں ساتھیوں نے شیر کی چاروں ٹانگیں ایک رسّی کے ٹکڑے میں یکجائی باندھ کر اور اسے پوٹلی سا بنا کر اپنے برچھے کے بانسوں میں لٹکا کر کندھوں پر رکھ لیا اور چل دیے۔ وہ آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے اور جب ان کے خیموں پر پہنچے تو پتہ چلا کہ ؎

نکلے تھے جستجوئے بُت خانہ وصنم میں
بھٹکے تو آ کے نکلے کیئے کہاں حرم میں

سامنے میدان میں ان کی عورتوں اور بچوں کے درمیان خلافِ امید ایک مقدس صورت نظر آئی۔ جیسے ایک تازہ ولایت فرشتہ آسمان سے نازل ہوا ہے۔ سرخ و سپید چہرہ، گویا حنظل کے پھل پر کرسمس کی چاندنی پڑ رہی ہے، نیلی آنکھیں جن کے اندر فوری کینچلی اتارے ہوئے ناگ کی آنکھوں والی شعاعیں چھوٹ رہی ہیں اور قریب ہاتھ بھر لمبی نقلی ریشم جیسے سنہرے تاروں کی داڑھی، نوک پر زاویہ منفرجہ بناتی اور دونوں جانب جبڑوں پر زاویہ حادہ کی شکل پیدا کرتی کنوتیوں تک چلی گئی تھی اور پھر مخصوص کاٹ کی سیاہ ٹوپی میں دونوں سرے گھسے چلے گئے تھے! اور پیشانی سے لے کر داڑھی کی نیچے والی نوک تک اچھی خاصی گاتھک طرزِ تعمیر کے دو دروازوں کی نوک دار ڈاٹیں ایک الٹی اور ایک سیدھی جڑی لٹکتی اور کھڑی معلوم ہو رہی تھیں اور یہ سرخ سپید سیاہ انتظام نور و ظلمت کا پیارا امتزاج معلوم ہو رہا تھا جیسے کالی گھٹا چاند کو لیے ساری چاندنی ہضم کیے بیٹھی ہے۔ انھیں دیکھ کر پہلی نظر میں مجھے ایک دھچکا سا لگا اگرچہ فوراً سمجھ گیا تھا کہ مشن کے پادری صاحب رونق افروز ہیں جن کا ذکرِ خیر ان خیموں میں ولایتی اشیاء کی شانِ نزول کے ساتھ سُن چکا تھا "ولی را ولی می شناسد" اور جس طرح میں نے انھیں پہچان لیا کہ "حضرت شکاری ہیں" اسی طرح وہ میری وضع قطع دیکھ کر پہچان گئے کہ "میں شکاری ہوں" اور دونوں اپنے اپنے شکار پر ہیں۔ اگرچہ میرا ہائی ولاسٹی رائفل آج بے کار ثابت ہوا تھا مگر ان کا سڑا گلا جال ان خانہ بدوشوں کے مضبوط 'کھابڑوں' کے درمیان ایستادہ تھا۔ اور شکاریوں کا شکار کر رہا تھا۔ وہ شیشہ اور پلاسٹک کی چمک دار اور امریکن نیو گولڈ کی تابناک چیزیں ان میں بانٹ چکے تھے جو مجھے بعض بعض عورتوں اور بچوں کے ہاتھوں میں نظر آئیں اور جب انھوں نے آنکھیں چار کیں تو باوجودیکہ نہایت احتیاط کے ساتھ ان کے اندر بھیڑ بکری جیسی کیفیت پیدا کر کے چار کی تھیں مگر میں نے ان کی چمک میں امریکن سیاست کے مرغولے ناچتے دیکھ ہی لیے۔ انھوں نے لٹکتے ہوئے شیر کو تو کچھ متعجب انداز سے نہ دیکھا مگر میرا خیر مقدم ضرور انھیں نامانوس سے طرز کے ساتھ کرنا پڑا۔ اور شاید میرے پہنچنے پر انھیں ان خانہ بدوشوں کے درمیان گفتگو کا کچھ رُخ بھی بدلنا پڑا۔ اگرچہ ہم دونوں ایک دوسرے سے ان خانہ بدوشوں کی نسبت بہت زیادہ

قریب تھے ان کے سر پر سیاہ سرج کی طرے دار ٹوپی تھی میرے سر پر خاکی گابرڈین کا پگڑی دار ہیٹ! میں خاکی فلالین کا کوٹ اور ڈبل زین کی جودھپوری برجس پہنے ہوئے تھا وہ سیاہ کوٹنگ کی عباء و قباء زیب تن فرمائے ہوئے تھے۔ میرے پاؤں میں سانبھر کا اینکلیٹ بوٹ تھا۔ وہ کالے کروم کا شو پہنے ہوئے تھے۔ میرے گلے میں دُوربین لٹک رہی تھی اور ان کے گلے میں سنہری صلیب، وہ سُرخ سپید تھے اور میں بھی گورا چِٹا۔ ان کے ہاتھ میں اسٹک چیر تھی اور میرے ہاتھ میں میگزین رائفل، وہ اپنے کیمپ سے چاء کے ساتھ مکھن توس کیک کھا کر چلے تھے اور میں انڈے کا حلوا اور روغنی ٹکیاں، غرض بیسویں صدی کی "نقل و عقل" کی دنیا میں ہم ایک دوسرے کے پورے محرم راز تھے لیکن پھر بھی ان سنگِ موسیٰ کے سیاہ فام چلتے پھرتے ستونوں کی دنیا میں وہ مجھ سے اور شاید میں ان سے ایک عجیب قسم کا اُچاٹ پن سا محسوس کر رہے تھے۔ جیسے ہم ایک دوسرے کے سامنے ننگے کھڑے ہو گئے تھے اور اندازے کہہ رہے تھے کہ آپ کی ہماری ملاقات بنگلے پر ہوتی یا سوئل کے ہال میں، یا سینما میں، اور اور کہیں نہیں تو بدرجہ مجبوری ریل کے ڈبہ میں ہی! اور میں تو خیر یہی سوچ رہا تھا کہ ہائی ولاستی رائفل تو میرے ہاتھ میں تھا اور شیر مار ان جنگلیوں کے برچھوں نے، یہی کیا کم تھا مگر اب یہ پادری صاحب کو تو نہ معلوم ہوتا کاش! اور شاید پادری صاحب یہ سوچ رہے تھے کہ ان خانہ بدوشوں کو یہ نہ معلوم ہوتا کہ پادری صاحب کے علاوہ ہمارے کوئی اور بھی پادری صاحب جیسے ہوا کرتے ہیں۔ اور میں زندہ مثال دونوں کے درمیان کھڑا ہی ہوا تھا۔ اور میرا وجود پادری صاحب کے نزدیک خانہ بدوشوں کے اس پندار میں مخل ہو رہا تھا کہ پادری صاحب ان کا اور صرف ان کا مال غیر منقولہ قسم کی چیز ہیں اور کچھ اس قسم کی چیز کہ خیر شاید باپ تو پادری صاحب کے ہوا کرتے ہیں مگر بیٹا نہیں ہوا کرتا۔

اور سہیل! حیرت ہے کہ پادری صاحب کے کلچرڈ جراثیم سے کئی پشت سے یہ خانہ بدوش اپنی فطرت بچائے ہوئے ہاتھ پاؤں بچائے موذی کوتر جائے نظر آئے۔ اس نشہ پندار میں کہ وہ خواہ پادری صاحب کے ہوں یا نہ ہوں پادری صاحب صرف انہی کے ہیں۔ کچھ شیر مادر قسم کی چیز! اور اس وقت میرا وہاں پہنچنا کچھ ایسا ہوا، جیسے پڈنگ میں قورمہ ملا دیا جائے یا قورمہ میں ونیلا ایسنس!

میرا وارد ہونا ان کے سیاسی وعظ میں مخل ہوا اور میرے سلام پر انہیں میری جانب متوجہ ہونا پڑا۔ درمیان میں تعارف کرانے والا تو کوئی تھا ہی نہیں، صورت سائل سوال تھی۔ میری وضع قطع پکار رہی تھی میں شکاری ہوں اور ان حضرت کی برزخ کہہ رہی تھی کہ ہم شکاری ہیں، اور دونوں اپنی اپنی شکارگاہ میں! اور انھوں نے نہایت ہی میٹھی اور نیچی آواز میں محبت بھرے تیوروں سے فرمایا۔

"آپ شکاری ہیں، اور شاید یہاں کے کلچرڈ زمیندار (CULTURED ZEMIDAR) ایں؟ یا کیا؟" اور انھوں نے مجھے ایک مخصوص پُرتقدس انداز میں سلونے تیوروں سے سر سے پاؤں تک پرتالا۔ اور میں نے دل میں کہا کیوں نہ پہچانیں گے آپ مجھے پہلی نظر میں ؏

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

آپ بھی شکاری ہم بھی شکاری، آپ بھی کلچرڈ زمیندار ہم بھی کلچرڈ زمیندار!

"جی ہاں! جی ہاں" میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا "زمیندار، اور یہاں پر زراعتی فارم بھی ہیں، اور کبھی کبھی اِدھر شکار کو چلا آتا ہوں، آج خوب ملاقات ہوگئی"۔

"ہوں — وہ آں — جی ہاں، بڑی خوشی، بڑی خوشی" اور یہ کہتے ہوئے پادری صاحب نے اپنی عمر سے زیادہ اپنے تقدس اور شاید اس سے بھی زیادہ اپنی ڈاڑھی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے بجائے مصافحہ کرنے کے بزرگانہ شفقت کے ساتھ میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اور میں نے ذرا بھولے پن کے ساتھ کہا۔ "ہوں وہ آپ کیا بتا رہے تھے انھیں؟ میں مخل تو نہیں ہوا؟"

"جی نہیں۔ آیئے نا۔ ہم انھیں کلچر کے ابتدائی اصول کی تعلیم دیتے ہیں"۔ پادری صاحب کا نیم کلیسائی قسم کا جواب تھا جس کے لب ولہجہ سے میں نے اندازہ کیا کہ اُردو بولنے پر نہایت اچھی طرح قادر ہیں اور آگے چل کر پتہ چلا کہ تمام ہندوستانی زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں بلکہ کل ایشیائی زبانوں میں دخیل ہیں اور یہاں تک کہ ان خانہ بدوشوں کے مختلف قبائل کی زبان سمجھ سکتے ہیں اور بعض بعض خاص قبائل کی زبان بول بھی لیتے ہیں

اور اس مخصوص قبیلہ میں جس کے اندر آج وہ بیٹھے ہوئے تھے اُردو زبان کی کارفرمائی میں بڑی حد تک انھیں کا ہاتھ تھا۔

اور ان کے جواب پر میں نے شرارت آمیز بھولے پن کے ساتھ کہا۔ " یعنی مذہبی تعلیم، یہی مسیحیت کی تبلیغ؟"

"جی نا ہیں۔ ابھی مذہبی شعور قبول کرنے سے تو ان کے دماغ عاری ہیں، یوں سمجھیے کہ ابھی تک تو یہ آدمی سے دُور اور جانور سے قریب تھے اور ہم انہیں کلچر کی بہت ہی ابتدائی باتیں ان کی نفسیات کا لحاظ رکھتے ہوئے سکھا کر انھیں انسان کے قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر مذہبی شعور، اور مسیحیت جیسا اعلیٰ مذہبی شعور تو ان کے لیے ابھی بہت بعد کی بات ہے۔"

"لیکن تقریباً دو سال آپ کے مشن کو ہمارے ملک کے اندر ان کے ساتھ DEAL کرتے ہو گئے اور آپ نے خود بھی ہندوستان کے اندر نیم خانہ بدوش قبائل کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کیا ہوگا اور ہاں آپ کا مشن تو بین الاقوامی ہے اور آپ نے تمام دنیا کے خانہ بدوش قبائل کا نفسیاتی تجربہ کیا ہوگا اور آپ نے یہ اندازہ کر لیا ہوگا کہ ان کا رجحانِ طبع تمدن کے کون سے شعبہ کی جانب بآسانی موڑا جا سکتا ہے۔"

" جی مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میرے پاس میرا اپنا PRODUCE کیا ہوا لٹریچر نہیں ہے۔ دیکھئے انتظام کروں گا، آپ اسے دیکھ کر خوش ہوں گے یقیناً! میں نے ایشیا کے تمام خانہ بدوش قبائل پر تین تھیسس لکھے جس پر مجھ کو امریکہ کی تین مختلف یونیورسٹیوں نے ڈاکٹریٹ ایوارڈ کیا۔ یوں تو ہر سہ مقالہ جات میں نفسیاتی نقطۂ نظر سے ان کی زندگی کے ہر پہلو پر بحث کی ہے لیکن آپ کے اس خاص سوال کے جواب میں میں ہر جگہ اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کا رجحان طبع عسکریت کی جانب ہے اور دیکھیے نا مرے ہوئے شیر کی جانب اشارہ کرکے اسے تو ہر عامی سمجھ سکتا ہے کہ ان کے یہ روزمرّہ کے مشاغل ہیں اور اس میں یہ کتنے کامیاب ہیں اور کس قدر باضابطہ! یہ سب BORN SOLDIER ہوتے ہیں پیدائشی طور پر یہ تباہی کی اعلیٰ اقدار سے مالامال ہوتے ہیں جو بہت معمولی سی توجہ کے بعد سائنٹیفک راستہ

پر لگ جاتی ہیں پچھلی جنگ عظیم میں CONSCRIPTION کے ذریعہ انھیں فیلڈ پر لے جایا گیا پھر بھی انھوں نے کارِ نمایاں دکھایا اور اس جنگ میں تو نہایت جوش کے ساتھ والنٹیر لیے گئے اور فوج کے ہر شعبہ میں بڑے کامیاب سپاہی ثابت ہوئے۔ بلا کے جفاکش، بہادر اور باضابطہ! لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی یہی صلاحیتیں بے کاری کے زمانہ میں بہک بھی جاتی ہیں اور یہ لوگ بڑے شہرہ پشت ڈاکو اور رہزن بھی بن جاتے ہیں اور انھیں امن و امان کے صحیح راستہ پر لگائے رکھنے کے لیے ہم ان کے اندر اپنا مشن جاری رکھتے ہیں۔ اور بیسویں صدی بھر تو ہم سے یہ لوگ بھڑکتے رہے۔ کئی پادری ان کے درمیان تبلیغ کرتے ہوئے شہید ہو گئے اور ہم بمشکل پولیس کی مدد سے ان تک اپنا مشن لے کر جا سکتے تھے اور اب تک ان میں بعض قبائل ایسے ہیں جو خانہ جنگی اور لوٹ مار کے راستہ پر پڑ گئے ہیں اور ہم اصلاح کے لیے اور پولیس احتساب کے لیے ان کے ساتھ سایہ کی طرح لگے لگے پھرتے ہیں اور ان میں سے زیادہ تر قبائل اصلاح ہو کر بدستور شکار اور گھاس کے سہارے پر ہیں اور تمدن کا ادنیٰ سا بھی اثر قبول کرنے کے لیے ان کی آزاد فطرتیں اتنی جد وجہد کرتی ہیں کہ بس ہمیں پتھر میں جونک لگانی پڑتی ہے اور اس مخصوص ضمن میں ہم نے انھیں قطب شمالی سے قطب جنوبی تک یکساں عصبیت کا حامل پایا اور لطف یہ ہے کہ اس گریز و فرار کے سلسلہ میں ان کی ذہنیت میں تمام کرۂ ارض پر یکساں شکل کی مطابقت ہے، جیسے تمدن سے بغاوت کا رشتہ ان کے اندر بین الاقوامی یکسانیت کا حامل ہے اور یہ عجیب سی بات ہے، میرا ذاتی تجربہ ہے، ویسے ماہانہ اور پندرہ روزہ دوروں پر یہ ہمارا بخوشی استقبال کرتے ہیں اور آپ دیکھیے نا خاصے مانوس ہیں بچے اور عورتیں تک اور یہ کہتے ہوئے پادری صاحب نے دو تین آبنوسی بچوں کے سروں پر اپنا ہاتھی دانت جیسا سفید ہاتھ پھیرا جو ان کی عبا قبا سے کھیل رہے تھے" اور یہ بات نہیں یہ ہماری بات پر بھی کان دھرتے ہیں، ہمارے مشن نے ان کی زبان پر بھی تھوڑی بہت مشق کر لی ہے اور انھیں بھی علاقائی زبانوں کا سمجھنا بولنا سکھا دیا ہے اب چوں کہ یہ خاص قبیلہ اودھ فارسیٹ، روہیلکھنڈ اور کمایوں کے جنگلات میں گھومتا ہے لہٰذا عورت مرد سب اُردو زبان خوب سمجھ لیتے ہیں اور ان میں سے اکثر مرد اچھی خاصی بول لیتے ہیں اور یہاں پر ہی منحصر نہیں

تمام ایشیا میں ہماری تبلیغ کے طفیل خانہ بدوش ان زبانوں سے آشنا ہو گئے ہیں جو اس HAUNT میں جس میں وہ چکر لگاتے رہتے ہیں، متمدن اقوام شہروں اور دیہات میں بولتی لکھتی پڑھتی ہیں اور تمدن سے قریب تر لانے کا اولین و بہترین ذریعۂ شناسائی دانستِ زبان ہے۔ شروع شروع میں ہمارے مشن کو ان کے اندر بڑی دقتیں پیش آئیں اور اب تو دیکھیے بے دھڑک ان میں اُردو بول رہا ہوں اور ان کی قدیم غیر آریائی زبان سمجھ رہا ہوں اور یہی رستہ انھیں تہذیب و تمدن کی بلندی پر لے جانے میں سیڑھی کا کام دے گا۔ ورنہ شروع شروع میں تو جان جوکھم کا کام تھا ان کے اندر تبلیغ کرنا اور اب تو کبھی کبھی ان کے ڈیروں میں ریڈیو لگا دیتے ہیں جب کوئی مذہبی پروگرام ہو، ان میں سے اکثر قبائل کو اخلاقی اثرات سے ہم لوگ متاثر کر چکے ہیں اور جگہ جگہ اچھا خاصہ مذہبی رنگ بھی چڑھ گیا ہے اور جو بہت ہی بچھڑے ہوئے ہیں انھیں بھی کچھ نہ کچھ ٹرین کیا ہے ابھی شاید آپ نے اخبارات میں دیکھا ہو پچھلے مہینوں میں جزائر بورنیو سے نہایت ہی وحشی قسم کے بعض قبائل کو ملایا فرانٹ پر فوج کی ابتدائی تعلیم دے کر بھیجا گیا تو انھوں نے وہاں میکنیکل فورسز کے چھکے چھڑا دیے، ایسی بہادری سے لڑے کہ متمدن فوجیں انگشت بدنداں رہ گئیں، اور دشمن کے مُنہ پھیر دیے۔"

اور سہیل! تم جانتے ہو کہ میں یہاں نہ تو سیاسی مباحثہ کرنے آیا تھا اور نہ مذہبی مباحثے، پادری صاحب کے پورے لیکچر کو ہر پہلو سے چپکا بیٹھا سنتا تھا۔ طبیعت شکار کے شدید EXITEMENT کے ردِ عمل میں کندسی تھی، شاید تھوڑی دیر اور سُنتا رہتا اور پھر رخصت ہو جاتا چپ چاپ مگر ان کے یہ اخیر جملے سُن کر میں جیسے جھنجھنا اُٹھا، اور کلیجہ منہ کو آگیا اور میں تل سا گیا! تم نے بھی اخبارات میں پڑھا ہو گا کہ ابھی انگریز دیوزاد شاہی حکومت نے ملایا میں جنگِ آزادی لڑنے والی ترقی پسند فوجوں کے مقابلہ کے لیے بورنیو کے خانہ بدوش قبائل میں سے خاص طور پر ان وحشی قبیلوں میں CONSCRIPTION کیا جو آدم خور ہیں اور اپنے پرائے سب مُردے بے تکلف کھا جاتے ہیں اور انھیں جنگ کی ابتدائی تعلیم دے کر فرانٹ پر جا بھڑایا۔ اور بس ہتھیار تھا کہ وہ وحشی فوجوں کی جملہ ضروریات سے بے نیاز ہو گئے۔ کپڑے کی انھیں ضرورت نہ تھی اور راشن کے لیے انھیں اپنی فوج سے لے کر دشمن کی

فوج تک ہر چیز شکار ہی شکار تھی — اور اس پر میں تو ہیں چنگیز و ہلاکو بھی بھنّا اُٹھتے۔ میں نے پادری صاحب کے مُنہ سے بات لے کر کہا۔ "مگر کس کے دشمنوں کے؟" اور میرا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

اور پادری صاحب نے میرے اس غیر متوقع سوال پر ذرا چونک کر میری جانب دیکھا اور یہ اندازہ کر کے کہ میرے انداز سے یہ کہیں چوکنے نہ ہو جائیں اور پھر مجھ کو مزید گفتگو کا موقع نہ دیں میں نے اپنی بات خود نہایت اوچھے پن سے کاٹ دی اور چابک دستی کے ساتھ اڑا کر ایک دوسرا سوال دے مارا۔

"لیکن خود آپ کے مُلک میں بھی تو بہت سے نیگروز ہیں اور کہیں کہیں آزاد قبائل بھی، وہاں تو پھر کہنے ہی کیا ہوں گے ان کے —! آپ نے انھیں سوسائٹی NATIVES کی صفِ اول میں جگہ دے ہی دی ہوگی؟ ایں؟!"

اور پادری صاحب میرے پہلے ہی سوال پر بھڑکے ہوئے تھے اور اس میٹھے روغنِ تازہ سے ملتے ہوئے سوال پر اُچھل سے پڑے، جیسے میں نے ناک کے اندر سے بال نوچ لیا، اور غالباً میری غیر متوقع ستم ظریفی اور تجاہلِ عارفانہ کے اس طنزیہ انداز پر کچھ مشتبہ ہو کر میرا بشری بھانپا اور شاید کچھ پہچان کر ذرا شستہ ہو گئے اور فرمایا۔

"وہ — اوں — آں! ہم انھیں برابر متمدن بنانے میں کوشاں ہیں، اور کر رہا ہے وہاں بھی ہمارا مشن اور ہماری کوششوں میں تو کرۂ ارض میں کہیں بھی کوتاہی نہیں ہوتی ....

اور انھوں نے مجھے پھر مشتبہ چُری چُری نظروں سے دیکھا مگر سہیل! میں جلا ہوا تھا بورنیو کی جدید ترین جبریہ بھرتی فوج کی مہم کے فخریہ اندازِ بیان پر ایک زہرخند ہنسی کے ساتھ بول پڑا —

"جی ہاں!، بھلا کیا کہنے آپ کی زرّیں انسانی خدمات کے! یہاں ہندوستان اور ایشیا میں تو آپ اپنے دو صدی کے کارنامے اپنی گفتگو میں مجملاً بیان کر ہی دیے اور چھوڑیے یہاں کی دونوں جنگوں کے سلسلوں میں اپنے مشن کی خدمات کی تشریح وہ تو خیر اظہر من الشمس ہیں اور خیر اس تازہ ترین بورنیو والے کارنامے کو بھی جانے دیجیے، میں تو آپ کے اپنے وطنِ مالوف کی خدمات کی تفاصیل پر کچھ روشنی چاہتا ہوں جہاں۔ ے جناب کا یہ اصلاحی مشن بین الاقوامی

اسکیم لے کر دو سو سال پیشتر چلا ہے ۔ قبلہ سچ بتائیے کیا وہاں پر نیگروز کے ساتھ آدمیوں جیسا سلوک ہوتا ہے یا بندروں جیسا ؟ وہاں کے اصلی باشندے کیڑے مکوڑے سمجھ کر مسل دیے گئے یا کہیں آج ان کا مردم شماری میں وجود ہے ؟" اور میں نے غور کیا کہ پادری صاحب بہت زیر و زبر ہو رہے ہیں اور مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں میدان چھوڑ نہ جائیں اور میں نے اپنے لہجہ کی طنزیہ تلخی کو سلونی مسکراہٹ میں تبدیل کرتے ہوئے اور لہجہ کو شیریں آوازیں پر دکم کہا —

" صاحب امریکہ ہی پر کیا ہر جگہ جہاں کہیں متمدن اقوام کی سیادت ہے وہاں خانہ بدوشوں کے ساتھ ڈھٹائی سے قانون بنا بنا کر مذبحہ کے جانوروں سے بدتر سلوک کو آئینی شکل دی جاتی ہے۔ اب انھیں دو صدیوں کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیے جوں ہی یورپ سائنس کی ابتدائی صلاحیتوں سے آشنا ہوا سیدھا افریقہ پر تیندوے کی طرح جھپٹ پڑا اور غیر متمدّن انسانوں کے ساتھ گھاس پھونس جیسا رویّہ اختیار کر کے رسمِ غلامی کو شدید ترین شکل دی، اور کچھ افریقہ پر ہی منحصر نہیں، جیسا کہ ابھی آپ نے فرمایا کہ قطب شمالی سے قطب جنوبی تک اس بد نصیب مخلوق کا وجود کہاں نہیں ہے اور شاید ہر جگہ آپ کا مشن سایۂ رحمت بنا ہوا ساتھ ساتھ ہے۔ لیکن اس کے باوجود کیا عرض کروں یورپ کی نوآبادیاتی ذہنیت کا! آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں ان آدم زادوں کے حق میں آدم خور ثابت ہوئیں آپ کی متمدن اقوام! اور حضرت! میری گستاخی معاف آپ کے خالص مذہب اور تمدّن کی جنم بھوم نے جس اعلیٰ انصاف اور عسکری اخلاق کا مظاہرہ بیسویں صدی کے وسط میں متمدن دنیا کے سامنے لی بینا کی حکومت اور عوام کے حق میں پیش کیا وہ تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہے"۔

" بالکل ٹھیک ہے بیٹا! مگر بات ہمارے مشن کی تھی اور ہمارے خلوص نیت میں کون شبہ کرسکتا ہے"۔ انھوں نے کنکھیوں سے میری جانب ایسے دیکھتے ہوئے کہا کہ میں عنقریب ان کی بغل میں گھونسہ مارنے والا ہوں۔

اور میں نے پھر ذرا ڈھیل دے کر قدرے رُخ سا بدلتے ہوئے کہا۔ " لیکن ہوں، حضرت! وہ آپ کا مشن تمام کرۂ ارض پر ان خانہ بدوشوں کی اصلاح میں مبتلا نظر آتا ہے مگر مشن بے چارہ

بھی کیا کرے ! آخر وہ بھی تو متمدن سوسائٹی ہی کا ایک منظم ادارہ ہے۔ یہ کچھ ان خانہ بدوشوں کی تنظیم تو ہے نہیں ۔۔!" میں نے ہجو ملیح والے اپنائیت کے انداز میں کہا۔

لیکن سہیل ! وہ تو واعظ تھے، اور سائنٹیفک واعظ ! میرے ایک ایک لفظ کا دل ہی دل میں تجزیہ کرتے جا رہے تھے۔ نہ گھونٹ بھر پینے کو تیار تھے اور نہ اس جنگل کی تنہائی میں لگی لپٹی رکھنے کو۔ انھوں نے بات کا راہبانہ اور صلح کل سا پہلو لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن صاحب! جب ہم ان کی اصلاح کا بیڑا اٹھا کر اس کے لیے اپنی زندگی وقف کر چکے تو ہم خود کو انھیں میں سے ایک خیال کرتے ہیں اور یہی ساری دنیا سے امید کرتے ہیں کہ ہماری خدمات کے لحاظ سے ہمیں انہیں میں سے خیال کرے"۔

اور سہیل ! بار بار لکھنا پڑتا ہے کہ میں یہاں شکار کھیلنے آیا تھا نہ کہ سیاسی بحثیں کرنے۔ اور وہ تو میں ان کی باتوں پر پھنک کر اور ان کے بھولے پن پر جل کر اُبل پڑا، اور تم ہی بتاؤ منطقی منافقت کا ڈھول کب تک بجتا۔ اور وہ تو میں شروع میں ہی بول پڑتا تم میری عادت کو جانتے ہو مگر کچھ موڈ میں نہ تھا اور موڈ میں ہوتا بھی تو کیا، جی چاہ رہا تھا کہ کوئی شکاری دوست ملے تو آج اس پانچ ہزار سال پُرانے شیر کے شکار پہ دو باتیں کریں، برچھے کے زخموں پر تبصرہ ہو۔ شیر کے اُچھلنے کے زاویہ اور روَما کے جوابی حملہ کا سائنٹیفک تجزیہ ہو۔ تمام راستہ غور کرتا آیا تھا کہ روما کے برچھے نے سامنے سے جست کرتے ہوئے شیر کا قلب چھید اتھا۔ اور دائیں بائیں کے دو خانہ بدوشوں کے برچھے اِدھر اُدھر سے دونوں شانوں میں گھُس کر دونوں پھیپھڑے چیر گئے تھے اور شاید اندر روَما کے برچھے کی نوک کے ساتھ مل گئے ہوں گے۔ بقیہ روَما کے دوسرے ساتھی نے تقریباً روَما کے ساتھ ہی ساتھ اپنا برچھا حلقوم سے پار کر دیا تھا اور داہنے بائیں والے بقیہ دونوں نے پیٹ اور پچھلا حصہ کمر وغیرہ چھید کر جگر اور گردے وغیرہ پھاڑ دیئے تھے۔ نوجوان شیر تھا، تمام بال نرم اور چمک دار تھے اور عضلات و اعصاب پورے بھراؤ پر تھے۔ کچلیاں نہایت نوکیلی اور چمک دار اور اک نظر میں خانہ بدوشوں نے چاروں شانہ چت زمین پر چومیخا کر دیا۔

اب سہیل ! تم ہی بتاؤ، اس مسئلہ پر بات چیت کرنا اس وقت خوشگوار معلوم

ہوتی کہ یہ خشک، سیاسی بکواس ہیں پڑ گیا مگر میں کیا کروں وہ جتنے بھولے بنتے گئے اتنا ہی مجھے تاؤ آتا گیا۔ اور اصلاح، اصلاح سنتے سنتے میرے کان پک گئے تھے دوست کیا بتاؤں، میں نے کہا —

"مگر جناب وہ عیوب تو بیان کیجیے جن کی اصلاح کے لیے آپ ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑے ہیں اور ان کی کتنی بستیاں اب تک آپ کہاں کہاں بسا چکے؟"

اور جیسے میرے سخت وار کو اپنی روئی کے گالے جیسی فطرت پر روک کر خالی سا دیتے ہوئے نہایت ہی رحم اور افسوس کے انداز میں اپنے چاروں طرف کھڑے ہوئے خانہ بدوشوں کی جانب میری توجہ مبذول کرتے ہوئے فرمایا۔

"عیب! عیب و ثواب کی تخصیص تو ان آدمیوں کے درمیان ہو سکتی ہے جو نیکی بدی کی قوتِ تمیز رکھتے ہوں اور یہ غریب! چہ چہ چہ!! یہ تو اس قدر معصوم ہیں کہ غلط و صحیح کی تمیز سے ہی بے نیاز ہیں اور ان کے سامنے اچھا بُرا کیسا ہی راستہ نہیں ہے بس ہم تو انھیں نیکی کی تعلیم دے رہے ہیں۔"

"چہ خوش! تو گویا آپ انہیں صحیح راستہ دکھا رہے ہیں اور ماشاءاللہ ان کے ساتھ آپ کا خلوص اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ آپ خود کو انھیں میں سے بتاتے ہیں، اور شاید یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ کا سوچنے کا طریقہ بھی انھیں جیسا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم آپ کو مہذب دُنیا کی بہترین ذہنی اقدار میں سے ایک خیال کرتے ہیں اور ادھر ان کے بہترین دوست بھی، لہٰذا ان کے ساتھ سب سے بڑی ہمدردی یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ آپ انھیں نیکی کی تعلیم دیں۔ مہذب دنیا کو ان کے نیکی کرنے کی ترغیب کیوں نہ دیں اور شاید ان کے اور مہذب دُنیا کے درمیان بہترین ثالث ثابت ہوں تو پھر ان کو صحیح راستہ دکھانے میں آپ کی کوششیں ایک اور ایک گیارہ بن جائیں، اور سب سے آسان کلچر کی تعلیم ان کی آبادکاری ہے —"

"لیکن جب ہم ان کی اخلاقی اور تمدنی حالت سدھارنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو متمدن دنیا ان کے حقوق ان کے حوالے کرنے پر خود ہی مجبور ہو جائے گی۔" پادری صاحب

مہمل سا جواب تھا اور میں نے خیال کیا کہ پادری صاحب مجھے بھی اتنا ہی بھولا سمجھ رہے ہیں جتنا خود بنتے ہیں اور جیسا ان جنگلیوں کو خیال کرتے ہیں۔ میں نے ذرا جھرجھری لے کر کہا:

"قبلہ میری تلخ نوائی معاف! میں جناب سے دریافت کرتا ہوں کہ ان جنگلیوں کو چھوڑیئے امریکہ کا متمدن اقوام کے ساتھ دنیا کے اندر کیا رول رہا ہے جو ہم سمجھ لیں کہ تھوڑا سا کلچر پیدا ہونے کے بعد ان خانہ بدوشوں کے حقوق انھیں مل جائیں گے۔"

"مگر دیکھیے یہ موضوع اس وقت زیرِ بحث نہ تھا کہ امریکہ اور دیگر ممالک کے کیا تعلقات ہیں۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس پر زبان کھولوں۔ لیکن آپ ہمیں امریکہ میں شامل کرکے بات کرتے ہیں تو ہم اس سے انکار بھی نہیں کرسکتے۔ دیکھیے ہم مذہبی ہیں اور ہمیں کسی حکومت سے سروکار نہیں، اور نہ میں امریکن نظامِ حکومت کی بھلائی اور پراپیگنڈہ کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن شاید ہمیں سب کو ان عظیم احسانات کا اعتراف کرنا پڑے گا جو ہمارے موجودہ تمدن کی تعمیر کے سلسلہ میں امریکہ نے کل کرۂ ارض پر کیے ہیں، اور ان دو صدی کے معاشی اور سائنسی انقلابات سے ایجادات واختراع کے ذریعہ انسانی ضروریات کی جو آسانیاں ہماری دنیا کو بہم پہنچائیں وہ محتاجِ بیان نہیں اور جارج واشنگٹن اور ابراہیم لنکن جیسے عظیم اور ہمدردِ انسانیت مفکر دنیا کو امریکہ ہی نے دیئے جن کی تعلیم سے انسان نے آدمی کا درجہ پہچانا۔"

اور اب میں نے نہایت ڈھٹائی سے تکلف بالائے طاق رکھ کر پادری صاحب سے آنکھیں چار کرتے ہوئے کہا۔

"ممکن ہے کہ ابراہیم لنکن اور جارج واشنگٹن اور شاید کٹی اور کی نیت میں خلوص رہا ہو اور ان کا عمل اپنے وقت پر ترقی پسند رہا ہو اور ممکن ہے کہ اس سے ایک وقتِ خاص تک آدمی کے حقوق آدمی کو قرار واقعی ملے ہوں، مگر موجودہ دور میں جو رول امریکہ دنیا کے ساتھ ادا کر رہا ہے وہ خالص شدید اور فسطائی ہے، اور معاف فرمائیے قبلہ! آپ کا مشن بھی اسی نظام کا چلتا ہوا ایک پرزہ ہے اور امریکہ کی جملہ بین الاقوامی جدو

جہد میں اپنے مخصوص پہلو سے ممد و معاون ہے"۔

اور پادری صاحب کے چہرے پر توی روشنیاں سی ٹمٹمانے بجھنے لگیں اور انھوں نے جلدی جلدی ادھر اُدھر سے اپنی عبا قبا سمیٹی اور بار بار گھونٹ سے لیے اور بولے۔

"چ چ چ! دیکھیے آپ مسلمان ہیں! اور کلام پاک کی تعلیم ہے "ظُنّ المؤمنین خَیْر" اور کسی کے متعلق بھی بغیر پرکھے ہوئے بُری رائے قایم کرلینا ہی اسلام کے منافی ہے نہ کہ ایک اچھے کے متعلق، توبہ! توبہ!!"۔

"جی ہاں! مگر بے باک صداقت بھی تو مسلمان کی پہچان ہے، اور اس وقت میں اپنی خلقی صداقت سے کام لے کر عرض کر رہا ہوں کہ جانے دیجیے ساری دنیا کے اور امریکہ تعلقات کو، ذرا ان نیم وحشی اقوام ہی کو لیجیے جن میں ہم اس وقت بیٹھے ہوئے ہیں، شاید ان کی اصلاح آپ کے مشن کی اسکیم کا ایک اہم جز ہے جو آپ امریکہ سے بنا کر چلے ہیں اور چلتے وقت یہ بھی نظر ڈالی آپ نے کہ خود آپ کی قومی حکومت کا اپنے ہم وطن نیگرو اور نیٹوز کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ لہٰذا پہلے CHARITY BEGINS FROM HOME وہیں سے کام شروع کیا ہوتا، پہلے امریکہ اور اس کے حلیفوں سے آئینی طور پر اُن کے جائز حقوق طلب کیجیے اور ان کی اصلاح خود بخود جنگلوں جنگلوں ہو جائے گی۔ قبلہ بغیر آپ کے تکلیف فرمائے ہوئے یہ آپ کے دوش بدوش نظر آئیں گے ورنہ ان کے اندر یہاں اصلاح کی کوشش کرنا اور انھیں ان کے حال پر ڈھیلا چھوڑ دینا جو جان بوجھ کر صراطِ مستقیم چھوڑے چاہِ ضلالت کی تاریکی میں پھاند رہے ہیں آپ کے مشن کو انھیں کا ایک ایجنٹ سمجھنے کے لیے کافی سے زیادہ ثبوت ہے اور آپ دیکھے بہ دلیری یکے بر فریب، قسم کی امریکن پالیسی کا آخر الذکر پہلو بھی ہیں، معاف کیجیے قبلہ، آپ کی یہ نام نہاد مقدس تعلیم ڈالر کی جھنکار کا جدید ایڈیشن ہے جیسا کہ بات کرتے وقت امریکن پالیسی کی حمایت کرتے ہوئے خود آپ کے قول سے بھی ظاہر ہو جاتا ہے"۔

پادری صاحب نے میری جانب ایسے سلونے تیوروں سے دیکھا جیسے بکرا دیکھتا ہے، پھر آنکھیں نیم وا کر کے اوپر آسمان کی جانب مُنہ اُٹھایا اور پھر دوسرا ہاتھ ذرا بلند کر کے شاید میرے حق میں خدا سے عقل و برکت نازل کرانے کی دُعا فرمائی اور پھر پُر تقدس انداز میں

پھول سے جھڑتے ہوئے ہونٹوں سے فرمایا — " افسوس ! آپ ایک عظیم تہذیب کے پیرو ہوتے ہوئے ہماری دیہی اصلاحات کو سیاست اور پالیسی سے مطعون کر کے ہمارے مشن کو متہم کرتے ہیں، معبودا! رحم کر!"

" نہیں تو، سُنیئے تو! آپ کی دیہی اصلاح ان کے درمیان یہی ہے کہ آپ انھیں ذہنی اعتبار سے اتنا بلند کرنے کا بیڑا اُٹھا کر چلے ہیں کہ متمدن اقوام خود ہی ان کے حقوق ان کے حوالے کر دینے پر مجبور ہو جائیں تو بندۂ نواز یہ کون سا طریقۂ کار ہے کہ آپ مظلوموں کی اصلاح کریں اور ظالموں کو ڈھیلا چھوڑ دیں، جب کہ آپ طبقاتی لحاظ سے ان میں سے ایک ہیں آپ کی بات ان سے بہت پہلے ان کے کان میں پڑے گی اور آپ انھیں اخلاقیات کا احساس ان سے بہت آسانی کے ساتھ دلا کر ان کے حقوق ان کو دینے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ مگر اس کی وجہ ! اس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم اصلاح کی آڑ میں آپ امریکن ڈالر کے لیے مزدور تیار کرتے ہیں اور تیسری جنگِ عظیم کی تیاری میں امریکہ کے حریفوں کی توپوں کے لیے چارہ ! جیسا کہ ابھی آپ نے ان خانہ بدوش قبائل کے متعلق فرمایا کہ انھوں نے پچھلی دونوں جنگوں میں کارہائے نمایاں دکھلائے اور بورنیو کے آدم خوروں نے ملایا میں آپ کے دشمنوں کے چھکے چھڑا دیے۔ ورنہ قبلہ اصلاح کے محتاج آج ایشیا اور افریقہ کے جنگلوں سے زیادہ یورپ کے بڑے بڑے شہر ہیں جہاں SLUM AREA کی جانب جا کر دیکھیے تو گورے امریکن بچے اور بوڑھے بھوک سے مجبور ہو کر مرغیوں اور کتوں کی طرح وہ کوڑے کے ڈھیر کرید کرید کر مُنہ چلاتے نظر آئیں گے جو اونچے طبقہ کے محلوں سے پڑاؤ پر آ کر جمع ہوتا ہے اور اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ہر تین سال میں اہلِ امریکہ اتنی شراب پی جاتے ہیں کہ اگر اس کو کسی نشیب میں جمع کیا جائے تو امریکن بیڑے کا ایک بڑا حصہ اس پر تیر جائے۔ چھوڑیے اسے خیر پچھلے الیکشن میں جب امریکہ کے نیگر و زادوں نیٹوز نے اپنا حقِ رائے دہندگی استعمال کرنے کی کوشش کی تو آفیشل غنڈہ گردی نے LYNCHING کر کے انھیں محروم کر دیا۔ حضت LYNCHING تو آپ خوب سمجھتے ہوں گے، قتل آتش زنی لوٹ، آئینی طور پر جائز کر کے نفاذ کرنے کو LYNCHING کہتے ہیں اور قبلہ امریکہ کی ان دو رائٹ آنریبل جماعتوں سے بھی آپ خوب واقف ہوں گے

جن کے اسمائے گرامی KLU . KLUX . KLAN اور TAMANY HULL ، ہیں، سائنٹیفک غنڈے، باضابطہ سفید پوش تعلیم یافتہ بھرپور قابو یافتہ۔ کیوں صاحب یہ بات غلط ہے کہ آپ کے مُلک کی یہ دو نوں طاقت ور جماعتیں اسٹریٹ غنڈہ گردی، آفیشل غنڈہ گردی اور پولٹیکل غنڈہ گردی کے منظم پلان کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ جن کے مارے عوام اور چھوٹے اہل کار بے چارے تو کس شمار قطار میں ہیں آپ کے پریذیڈنٹ تک کے پر جلتے ہیں۔ جناب آپ کی امریکن سوسائٹی ان جنگلیوں سے بہت زیادہ اصلاح کی محتاج ہے جس کے اسلحہ ساز کارخانوں کی بقاء حیات صرف مرنے اور مارنے ہی والے آدمیوں پر ہے اور اس کے لیے اپنے بد ترین نازی دشمنوں کو قید سے نکال نکال کر بحال کر رہے ہیں اور مشرق پر جنگ کے بادل اُمنڈ رہے ہیں! اور قبلہ ذرا امریکی ڈالر کی بے پناہ ہمت پر توجہ دیجیے جو آج خزانے کے سانپ کی طرح ساری متمدن دنیا کے گرد کنڈل مارے بیٹھا ہے اور آپ کے ہزار ہا سالہ کلچر بھوک کی وبا کے نذر کیے دے رہا ہے۔"

اور سہیل! میں ان کے چہرہ کا جائزہ لیتے ہوئے ٹھسکاتا چلا جا رہا تھا اور وہ دھوپ چھاؤں سے ہو رہے تھے اور یہ اندازہ کر کے کہ گرگ باراں دیدہ راہب پر اپنی تلخ نوائی سے غالب آ رہا ہوں، ایک پُر اطمینان گھونٹ سالے کر پیشتر اس کے کہ وہ کچھ جواب دے پائیں، بولا،

"شاید آپ ان بچوں کو اسی کلچر کے لیے تیار کر رہے ہیں جس کے مکتبوں میں معصوم طالب علموں کو حروفِ ابجد ذہن نشین کرانے کے لیے مہلک ہتھیاروں کی تصویروں اور جنگی اصطلاحوں سے کام لے کر ان کی گھٹی میں عسکریت کے نام پر امن شکنی اور جنگ پسندی ڈالی جاتی ہے۔ آج آپ کی تبلیغ کا اس سے بہت بہتر میدان کوریا کا محاذ ہے جہاں امریکن کارخانوں کے دلال اپنے ہتھیار سجانے والے مزدور کو دس ہزار ڈالر پیشگی کرایہ دے کر اپنی تجارت کی بقا و حیات کے لیے مرنے کو لے جاتے ہیں۔ اور شاید اس سے بھی زیادہ جناب کی اصلاحی چارہ گری کے محتاج وہ توندوں کے چند غار ہیں جن کے اندر ڈالر کے خمیر سے جوع الارض کے جراثیم کلچر ہوتے ہیں۔"

اور میں اک ذرا ٹھہرا تھا کہ پادری صاحب جلدی جلدی تھوک نگل کر مجھے نیم کلیسائی قسم کا جواب دینے کو تیار ہو گئے اور خدو خال میں نہایت ہی نرم اور صلح کل کیفیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

" خیر یہ سب کچھ، مگر ہم تو بائیبل کا مقدس درس اور مسیح کا پاک پیغام ان کے کانوں تک پہنچاتے ہیں اور اس کے لیے انھیں کلچر کی ابتدائی چیزوں سے آشنا کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔"

" مجھے بار بار کہنا پڑتا ہے قبلہ امریکن طرزِ زندگی و سیاست آج نوعِ بشر کی روحانی کوڑھ بن چکا ہے اور فسق و فجور، ظلم و جور کی دوزخ جیسی زندگی میں بھڑکا رہا ہے اور اس سے زیادہ امریکی مکتبِ خیال کی لعنت آپ کے بیٹے اور پرانے دونوں عہد ناموں کو مطعون کر رہی ہے اور آنجناب خانہ بدوشوں میں یہ خدمت انجام دے رہے ہیں اور وہاں آپ کے ہم وطن و ہم مذہب مسیح پاک کے جنازہ کو توپ پر رکھ کر تشہیر کر رہے ہیں۔ آپ یہاں جنگل میں تہذیب و تمدن کا دیا ٹمٹماتے پھرتے ہیں اور وہاں ابراہیم لنکن اور جارج واشنگٹن کی لاشیں اندھیرے بازاروں میں گھسیٹی جا رہی ہیں۔ معاف فرمایئے قبلہ خود را فضیحت، دیگراں نصیحت' ان تاریک خیموں کا پیچھا چھوڑیے اور امریکہ کے جگمگاتے شہروں کو پکڑیے جو ان سے بہت پیچھے ہٹ گئے۔

اور سہیل! تم جانتے ہو کہ ملّا ہمیشہ داخلی احساس برتری کے نشے میں چُور رہتا ہے اور پھر پڑھا لکھا سائنٹیفک ملّا تو پورا معلم الملکوت ہوتا ہے' پادری صاحب کے کان میں شاید اتنی ثقلِ سماعت آوازیں عمر میں پہلی مرتبہ جنگل کے اندر پڑی تھیں اور انھوں نے پھر ایک خانقاہی بیٹھک ماری، بہت ہی ٹھنڈے اور مختتم انداز میں گویا ساری گفتگو کا توڑ کرتے ہوئے اپنے مشن کی پرانی تاریخ کے ایک آدھ صفحہ کی ٹیک لے کر فرمایا۔

"جس آزاد خیال سوسائٹی اور جس ایمان دار ادارہ نے INDIA IN BONDAGE کا مصنف ڈاکٹر سنڈر لینڈ جیسا نیک اور صادق مصنف اور REU TEMPLEN جیسا حق گو واعظ دیا اسے آپ یوں مطعون کرتے ہیں۔"

"اور یہی تو میں کہتا ہوں حضرت پھر آگے کیا ہوا۔ ہر دو حق پسند امریکن مشن اور امریکن حکومت دونوں کے مورد عتاب ہوئے اور شاید چرچ سے خارج ہوئے اور امریکہ واپس جانے پر مجبور، کیوں کہ ان کا وجود ہندوستان کے اندر برٹش سامراج کے حق میں مضر تھا۔ بس ایسی ہی مثالوں سے تو ہم نے آپ کے دیہی مشن کو پہچانا ہے جناب!"

واعظ کی شانِ جمالی اور شانِ جلالی میں کُشتی ہونے لگی۔ ان کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ ایک لمبی سانس لے کر بار بار ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا مگر خیریت گزری کہ پھر جمالی رنگ جم گیا۔ انھوں نے ماحول کو پر تال کر اور شاید یہ اطمینان کا سانس لیا اور مجھ سے علیحدہ ہو کر خدا سے ہم کلام ہوئے ذرا بھرائی بھرائی سی آواز میں فرمایا۔

"خداوند! برکت دے اور رحمت نازل کر گمراہوں پر، اور روشنی عطا فرما کھلی آنکھوں والے کور ذلوں کو ـــ" اور پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے اپنے انتہائی پُر تقدس بشرہ سے فرمایا ـ" بیٹا! دیکھیے آپ عقل مند اور تعلیم یافتہ ہیں خدا کے واسطے بات کو فلسفہ کی حدود سے باہر نہ جانے دیجیے۔ آپ امریکہ کو فسطائی بنائیں یا فیوڈل یا کچھ، لیکن تذکرہ تھا ہمارے مشن اور ان آزاد قبائل کے درمیان ہماری خلوص و عدم خلوصِ نیت کا۔ اس پر ایمان داری کے ساتھ سوچیے۔ میں نے مانا امریکہ اور یورپ بڑی زبردست اخلاقی اصلاح کے محتاج ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی کب ہوئے کہ یہ خانہ بدوش اصلاح کے محتاج نہیں۔ لہٰذا جہاں تک ہمارے اس فعل کا تعلق ہے آپ اسے قابلِ قدر سمجھئے۔"

"میں ابھی عرض کر چکا ان کی اصلاح میں خلوص نیت سے زیادہ امریکہ کے لیے نئے جنگ کے میدان اور سپاہی فراہم کرنا مدِ نظر معلوم ہوتے ہیں اور آپ کا طریقۂ کار میرے اس دعوے کا ثبوت اپنے اندر مضمر رکھتا ہے۔ میں مختلف پہلوؤں سے آپ کو اس کا جواب دے چکا۔ آپ امریکن سیاست اور طرزِ زندگی کو اصلاح سے بے نیاز خیال کرتے ہیں یا اسے یوں ہی آزاد چھوڑتے ہیں اور ان قبائل میں اصلاح کرتے پھرتے ہیں تو صاف ظاہر ہے کہ ان کے لیے ان کے ذریعہ مواد پیدا کرتے ہیں ورنہ ان کا کون سا جھگڑا کس حکومت سے اٹکا ہوا ہے، اپنی شہنشاہی اغراض کے لیے انھیں ROBUTS کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ سستے بھاؤ پر حاصل

کرنے کے لیے آپ انھیں کلچر اور مذہب کی آڑ سے بہکاتے ہیں اور یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے پس ماندہ سوسائٹی کی قیادت کر کے شہنشاہی سیادت کو تقویت پہنچانا ہر دور میں کلیسا کا رُول رہا ہے۔"

اور سہیل! اب کی مرتبہ انھوں نے خصوع وخشوع کے ساتھ آسمان کی جانب ہاتھ اُٹھا کر توبہ کھینچی اور شاید رحم، محبت، انصاف وغیرہ کے الفاظ زیرلب ادا کیے اور پھر بڑبڑائے۔

"کوئی نئی بات نہیں صحائف انبیاء اور آسمانی کتب شاہد ہیں کہ انبیاء کرام کو جادوگر کا لقب دیا گیا، پاک مریم کو متہم کیا گیا اور معصوم ہستیوں کو تختۂ دار پر لٹکایا گیا۔ آسمانی باپ! بصارت وبصیرت دے ان کور دلوں کو جو تیرے مقدس پیغام اور تیرے بیٹے کے پاک عمل کی تبلیغ کرنے والوں کا صحیح مقام نہیں دیکھ سکتے۔"

اور اب کی مرتبہ سہیل میں پھنک سا گیا ان کے اس بہروپیہ پن پر، اور میں نے ذرا پھکڑپن سے کہا۔

"جی ہاں! جی ہاں! اور یہ بھی دُعا مانگیے کہ تیرے نام پر جو ظالموں کے ایجنٹ بنیں ان کی فوجی طاقت بڑھانے کے لیے جنگلوں جنگلوں مارے مارے پھریں انہیں بھی، تیرے نام پر جو لٹیروں کی تھیلیاں بھرنے اور کم زوروں کی جیبیں کترنے کا انتظام کریں انھیں بھی ..."

اور میں شاید کچھ اور بولتا کہ انھوں نے آمین کہنے سے پیشتر میرے مُنہ سے نہایت ہی سلونے انداز میں بات لے لی اور بولے۔

"میاں نوجوان ہو، وقت اور خون کا تقاضا ہے۔ اب یہ سب باتیں سچ بتائیے کہ آپ کے دل کی آواز ہیں، یا صرف سخن پروری ... ؟"

میں نے کہا قبلہ! نہ میرے دل کی آواز ہیں نہ سخن پروری، یہ زندہ حقیقت ہیں کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ آپ کا ___ BOARD OF FOREIGN MISSIONS IN AMERICA آپ کو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے سارے سے ہر ملک میں امریکن سفارت خانہ سے ہدایات لے کر کام کرنے کے حکم دے کر بھیجتا ہے اور ہر ملک کے سیاسی وسماجی ماحول کے مطابق امریکی سفارت خانہ اپنے مفاد کو مدِنظر رکھتے ہوئے آپ کو

طریقۂ کار کی OUT LINE دیتا ہے۔ چنانچہ چین میں آپ کی پانچویں کالم والی سرگرمیوں کا پول کھُل گیا۔ اور اب ہندوستان کے اندر بھی آپ دم توڑتی انگریزی سیادت کے ختم ہوتے ہی TO SLIP INTO OTHERS SHOES کے مصداق نہایت آہستہ سے امریکی خواجگی قایم کرنا چاہتے ہیں اور فرقہ پرست جماعتوں کو شہ دے کر امریکی سرمایہ کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں اور ہندوستان کے طول و عرض میں کہیں پر تیسری جنگِ عظیم کے اڈے کی ٹٹول میں ہیں اور قبلہ ہندوستان ہی کیا تمام ایشیائی ممالک میں آپ امریکن و برطانوی بساطِ سیاست کا مہرہ بنے ہوئے ہیں اور عوامی جمہوریتوں کے مقابلہ پر دنیا کی تمام فسطائی حکومتوں کی وکالت کا کام انجام دیتے ہیں اور یہ ہے جناب کا شکار جو مسیحیت کی پاک تبلیغ کے نام پر کھیل رہے ہیں اور امن کے نام پر فساد کی تخم ریزی کرتے ہیں۔"

اور سہیل! دونوں جانب معاملہ نہایت سُرخی اختیار کر گیا تھا، میری زبان ولائتی مقراض کی طرح چل رہی تھی اور شاید آج کے شکار کی جھونٹ اتار رہی تھی ادھر بھی کلیسائی جوالامکھی میں لاوا بڑے زور سے پک رہا تھا۔ سب خانہ بدوش کھڑے ہمہ تن توجہ تھے اور بعض ہوشیار و ذہین آدمی ہماری گفتگو کا مفہوم سمجھ گئے اور غالباً یہ تو سبھی سمجھ گئے تھے کہ پادری صاحب جو کچھ کہا کرتے ہیں اس میں بھی قیل و قال کی گنجائش ہے۔ اور شاید پادری صاحب کچھ اور بدتراز گناہ قسم کی چیز گھنے والے تھے کہ آج کا نوجوان شکاری ہیرو رومابول پڑا۔

"مگر دیکھیے تو اب تو ہمارے دیس میں گوروں کی حکومت نہیں پھر آپ پادری صاحب کی نیت کو کیوں خراب بتاتے ہیں؟"

اور یہ کہتے ہوئے اس نے میری جانب اسپورٹس مین یا اسپورٹس مین والے اپنائیت کے انداز میں دیکھا اور میں نے اندازہ کیا کہ وہ اپنی ذہانت سے اتنا ضرور سمجھا کہ میں پادری صاحب کو امریکی حکومت کا دلال بتا رہا ہوں اور وہ یہ بھی سمجھ گئے کہ ہمارے بھائی بند ساری دنیا میں گورے کالے پھیلے ہوئے ہیں اور بندھیاچل اور ہمالیہ کے درمیان منحصر نہیں ہیں اور میں نے اس کی فکر و استعداد کے مطابق جواب دیا۔

"ارے اب ہمارے حاکم تو پہلے والے گوروں سے بھی زیادہ گورے ہوگئے ہیں

اور پُرانے گورے نئے گوروں کے کندھوں پر دھر دھر کر بندوق چھوڑتے ہیں اور جب پادری صاحب کا ملک اپنے دشمنوں سے لڑنے کو میدان ہمارے ملک میں بنائے گا تو ہمیں ساتھ لڑنا پڑے گا۔"

"کیوں ؟ ہمارا مُلک پہلے تو میدان بنانے ہی کیوں دے گا ؟"

"اسی بات پر قرض جو کھائے پڑا ہے۔ ابھی پچھلے سال امریکہ نے گیہوں قرض دیا تو پیٹ بھرا ورنہ سارا ملک بھوکوں مر جاتا۔ اب جب اس نے جِلایا ہے تو جہاں چاہے گا، لڑائے گا۔"

اور شاید شکاری نوجوان جو گھاس کے قطعہ پر ایسی نگاہیں ڈالتا تھا جیسے ایک کسان اپنی تیار فصل پر، گیہوں کی کمی اور امریکہ کی امداد کو نہ سمجھ سکا اور نہ پھر اس مجبوری میں میدانِ جنگ کے جاء وقوع کو، مگر ایک اور بوڑھے خانہ بدوش نے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے صاحب! وہ جو کوئی بھی اُدھار کھلاتا ہے کری ان کری سب کرالیتا ہے۔" اور پھر روما سے مخاطب ہو کر کہا۔" تمہارے یہاں جاڑوں میں خس کا ٹھیکیدار کپڑا، تھوڑا بہت غلّہ اور لوہا بانٹ جاتا ہے اور جس کو پیسہ کی ضرورت ہو اس کو پیسہ دے جاتا ہے اور پھر گرمیوں میں تم سے من مانے بھاؤ پر خس لے جاتا ہے اور اسٹیشن تک لدان کے لیے ساتھ پکڑتا ہے۔"

اُس نے تو اپنی غیر آریائی زبان کے ساتھ اُردو ملا کر میرا لحاظ کرتے ہوئے روما کو یہ بات سمجھائی اور میرے دماغ میں بجلی سی کوندگئی خس کی فروخت کے طریقہ پر! یعنی ڈالر کے پنجہ سے یہ دُور افتادہ گم نام بیابان جنگل بھی محفوظ نہیں جو اس وقت پکی سڑک اور ریلوے لائن سے پچیس پچیس میل کے فاصلہ پر ہیں۔ خیر میں نے دل میں خیال کیا کہ وہ خس کا معاشی ٹھیکیدار تو سال میں ایک دو مرتبہ ان کے اندر آتا ہے اور یہ پادری صاحب کی شکل میں امریکہ کے ڈالر کی توپ کا پھینکا ہوا گولا تو ہر پندرھویں روز ان کے درمیان گرتا ہے۔ ذرا دیر خاموشی رہی اور پادری صاحب ۔نے آنکھیں بند کر کے رُخصتی دُعا کی۔

"الہٰی! گمراہوں کے دل پر شیطان اپنی مہر لگاتا ہے، اور وہ بد کو نیک اور نیک

کو بد سمجھتے ہیں۔ بصیرت اور برکت! آسمانی باپ! رحم و محبت!"

اور سہیل! ان کی آواز ایسے گونج رہی تھی جیسے "محل" نامی فلم میں سینما کے ہال کے اندر ٹریجڈی کو کامیڈی بنانے کے لیے کہانی کے ہیرو کی مرنے کے بعد پھر زندہ ہو کر بھرائی بھرائی سی رُوحانی آواز گونجتی ہے، اور کچھ اپنی ہیئت کذائی میں وہ کھڑے ہوئے تھے۔

دُعا کے اختتام پر انہوں نے "آمین" کہا اور میں نے ان سے زیادہ بلند آواز میں تائید کی اور وہ اپنی جیپ کی جانب لپکے۔

اور سہیل اتم نے اخیر سیزن کے شکار میں کبھی کبھی ان مرغابیوں کو جو مائیگریٹ کر کے واپس جانے والی ہوتیں ہیں اور ان کے ڈاؤں کے نیچے چربی کی دبیز تہہ پیدا ہو جاتی ہے فیر کھا کر زخمی اُڑتے ہوئے دیکھا ہوگا، تپاتی، کنتی فضا میں تلتی گرتی پڑتی جاتی ہیں، یا کبھی HAWKING میں وہ سین یاد کرو جب شکرا مالک کے انگھٹے سے شکار پر اُڑ کر اور اپنی جھپٹ میں ناکامیاب ہو کر کھسیانا کھسیانا ترچھے ترچھے پر چلاتا مُنہ کی کھائے مالک کی جانب پلٹتا ہے بس ایسے ہی کچھ پادری صاحب بڑھے، ایک پاؤں کہیں پڑ رہا ہے دوسرا کہیں، عبا و قبا کے طرّے پورب کو اُڑ رہے ہیں اور دستار فضیلت کے پچھم کو! غرض کچھ ع

آگے آگے بے خودی تھی پیچھے پیچھے ہوش تھا

کچھ دُور بڑھ کر اپنی جیپ بڑھا گئے۔

اور اب میں نے خانہ بدوشوں کے ساتھ اس ماحول کو پرتالا تو اندازہ کیا کہ ان کے درمیان میں ہی میں ہوں، میرا خیال تھا کہ وہ پادری صاحب کی شکست سے کچھ زیادہ خوش نہ ہوں گے۔ مگر ان کی نظریں دیکھ کر میں ان کے درمیان جم کر بے تکلفی کے ساتھ بیٹھ گیا اور مجھے کچھ ایسا اندازہ ہوا کہ ان لوگوں کی نگاہیں میرے اُوپر کچھ پڑ رہی ہیں جیسی میری ان پر اس وقت پڑی ہوں گی جب انھوں نے برچھے سے شیر کو مارا تھا۔ وہ الاؤ کے لیے بڑے اہتمام سے لکڑیاں جمع کر چکے تھے اور ناچ گانے کی تیاری کر رہے تھے اور مجھ کو اپنی محفل

میں شرکت کے لیے بڑے اصرار کے ساتھ روک رہے تھے۔ سورج غروب ہوتے ہوتے تیاریاں مکمل ہوگئیں اور تقریباً سب میرے گرد مجھ کو "میرِ مجلس" سا بنا کر جمع ہو گئے اور میں نے ان کے رویہ سے اندازہ کر لیا کہ جس طرح آج رزم میں میں ان کا لوہا مان گیا اسی طرح بزم میں یہ میرے سامنے زانوئے ادب تہہ کر رہے ہیں۔ اور اس وقت وہ ایک سمجھ دار ساقی والی نظروں سے صبح کی بیگانہ وار نگاہوں کی تلافی کر رہے تھے۔ جیسے ان کے درمیان اس وقت میرا وجود کوئی نئی چیز شاید نیک فال ہے، نیا ہتھیار! اور مجھے ان کے بشروں سے اندازہ ہوا کہ ان کے اندر میری فتح اور پادری صاحب کی شکست کے اطمینان و بے اطمینانی کے درمیان کشتی سی ہو رہی ہے، جیسے وہ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں مگر اپنے مفہوم کو ادائیگی کا جامہ پہنانے میں قاصر سے ہیں۔ اور میں نے ان میں سے بعض کا انداز مائل بہ تکلم دیکھ کر ان سے خود ہی کہا۔

"سمجھے تم پادری صاحب کی کچھ حقیقت؟"

اور رو تما نے کہا۔ "ہاں کچھ سمجھے کچھ نہیں سمجھے مگر آپ یہ کہتے ہیں کہ پادری صاحب ہمارا سُدھار نہیں کر رہے ہیں تو پھر کون کر رہا ہے۔ کیا آپ ہمارا سُدھار کریں گے؟"

اوہو! سہیل یہ خانہ بدوش کے اندر والا آدمی بولا، اور اس کے لہجہ اور انداز میں مجھے انقلاب کی تڑپ نظر آئی۔ قانع قطعی ہونے کے بعد بھی اصلاح کی بھوک اور تمدن کی التجا! متشین کی حسرت! اور میں نے کہا۔

"ہاں! اب بہت جلد وقت آرہا ہے کہ ہم تمہارا سُدھار کریں گے، تمہارے پاس بولی ہے ہم تمہیں پڑھنا لکھنا سکھائیں گے! تمہارے پاس طاقت ہے ہم تمہیں طاقت کا صحیح مصرف سکھائیں گے! اور تمہاری یہ سب سے بڑی مصیبت جنگلوں جنگلوں لدے پھرنا ہے اور ہم تمہارے شہر بسائیں گے، گاؤں آباد کریں گے اور تمہیں اپنے جیسا "صاحب" بنائیں گے اور ایسے ہی کپڑے پہن کر رائفل سے شکار کھیلنا سکھائیں گے۔"

اور ان میں سے چند تڑپ کر بولے۔

"ہوں رائفل! مگر پہلے اس کا دھماکا بند کیجیے اس سے ہمارا برچھا اچھا ہے"۔

اور میں ہنس پڑا اور روما بھی اور سب نوجوان۔ اور میں نے ان کے چہروں پر نگاہ کی تو ممنونِ احسان نگاہیں اپنے اوپر جمی پائیں! مجھے از سرتاپا بڑی عجوبہ سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے انداز اور بشروں میں میری جانب سے ایک پیارا پیارا سلونا پن تھا، جیسے میں نے انھیں محلوں کا خواب دکھایا ہے، اور جب میں نے دیکھا کہ ان میں سے اکثر کچھ دل خوش کن باتیں کہنا اور سُننا چاہتے ہیں تو میں نے شکار کے ہیرو روما سے مخاطب ہو کر کہا۔

"کیوں دوست روما! تم پسند کروگے ہماری طرح موٹر میں بیٹھ کر پہیہ گھماتے ہوئے بازار جانا؟"

اور جیسے وہ سب بول پڑے اور روما نے جو کچھ کہا اس کی ہر ایک نے نظروں سے تائید کی مسکرا مسکرا کر اثبات میں سر ہلا ہلا کر، اور روما نے کہا۔

"آپ سمجھتے ہوں گے کہ ہماری بڑی اچھی کٹ رہی ہے یہاں جنگلوں میں لدے لدے خاک چھانتے، ہم کو تو پھونس کا جھونپڑا اور دو بیل بھی نصیب نہیں! کیا ہم نہیں جانتے کہ جھونپڑوں اور محلوں میں کیا ہوتا ہے۔۔۔"

اور اس کے منہ سے بات لے کر ایک بڈھے نے کہا۔

"آپ شکار کھیلیں راجہ جی، آپ ہمیں کیا دے دیں گے جب سو برس سے پادری صاحب بسوہ بھر زمین نہ دلا سکے"۔

اوہ! میں تڑپ سا گیا اس کے شکوہ پر سہیل! زمین کی حسرت کتنی شدید ہے اس "ابن الارض" کے دل میں! میں نے اندازہ کیا اور کہا۔

"واہ! وہ کیسے دے دیتے آپ کو کوئی چیز! وہ تو اپنے مطلب کے لیے تم میں سے لڑاکو سپاہی بنانے کو آیا کرتے تھے، اور اب تم کو کوئی نہ دے گا تو وقت دے گا اور تم کو تمہارا اگلا پچھلا سب ملے گا۔" میں نے کہا اور پھر ان کی محفل میں جم گیا۔ شام کی چاء بھی کیمپ سے تھرموس میں بھر کر وہیں پہنچی۔

اور سہیل پیارے تم آؤ! اور ہم تم ساتھ ساتھ ان کے اندر چلیں۔ لیکن بھیّا دیکھو مہم بہت کڑی ہے! اس میں تاریخ کی روایاتی عادت بدلنی ہے اور بدلنے سے پیشتر ہمیں تاریخ

دیکھتی ہے اور تاریخی تحقیقات میں مورخ کبھی ٹیلے کریدتا ہے اور کبھی سنسان کھنڈر ڈھاتا ہے اور کبھی اہرامِ مصر اور مینار بابل ٹٹول کر عقلی گدّے لگاتا ہے اور اپنی نا معلوم مدت کا پیمانہ قبل مسیح قایم کرتا ہے۔ لیکن آؤ دیکھو یہ ہے تاریخ آدم کی ابجد، اور ارتقاء کی کتاب کا پہلا صفحہ، انھیں دو گز کے خیموں تلے انسانی تمدن کی سب بالیدگیاں اور ارتقائے آدم کی تمام بلندیاں پلی ہیں۔ وہ منزلِ مقصود جہاں سے نکل کر اور جہاں پہنچنے کے لیے آدم نے جنت سے نکلتے ہی اپنی تقدیر کا پہیّہ گھمایا تھا۔ بابا آدم کا پہیّہ جو شکاری سے گردش کر کے گلہ بان تک اور گلہ بان سے آقا و غلام تک پہنچا۔ اور پھر جاگیر اور کاشت کار کی منازل سے گذر کر آج سرمایہ دار اور مزدور کے چکر میں گردش کر رہا ہے۔ بس ایک اکھیڑ کا محتاج ہے اور اک ذرا سے گھماؤ میں جب اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچے گا تو ارتقائے آدم کی انتہائے منزل یہی خیمے ہوں گے جہاں سے معصوم آدم نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔

اور آؤ سہیل! دیکھو انسانی آبشار کا مخرج اور مدخل یہی خیمے ہیں جنھیں آج تک جھونپڑی بننا بھی نصیب نہیں ہوا۔ اور بڑے بڑے خارستانوں اور لق و دق ریگ زاروں سے گذر کر ہمارے تمدن کا متحرک محل انھیں خیموں کی جانب رواں دواں ہے جن کے اندر زندگی کے تمام ریگستان شاداب ہیں، اور ہر خارزار گل زار! اور جہاں تلخ حیات کا مزہ شہد جیسا شیریں ہے اور دودھ جیسا سفید! اور آتما کی جوت بھرپور اٹھان کے ساتھ جلتی ہے اور جیون کی پرکاش ڈے راڈ کی طرح مچل مچل کر چمکتی ہے۔

سہیل پیارے! بس تمہارے ساتھ کی دیر ہے مشین کی سب گردشیں لے کر آؤ، فلسفہ اور آرٹ کے کل اسکول ساتھ لاؤ اور تہذیب و تمدن کی کل بلندیاں سمیٹ سماٹ ان خیموں میں سمو دو! اور سمو کر روحانی اقدار کی فردوسیں کرنوں سے اپنا دامن بھر لو.....

اور آؤ سہیل! ان سے پاک تبادلہ کریں، انھیں اپنا سب کچھ دے کر عالم گیر امن، ہمہ گیر تندرستی، جہانگیر محبت اور حقیقی امدادِ باہمی وہ سب کچھ لے لیں جس کی تلاش میں ایک مرتبہ کھو کر جنت کے لیے روحِ آدم بے قرار ہے۔

اور آؤ پیشتر اس کے کہ تمدن و تہذیب کے جاگیر داروں کے انگوٹھوں سے

اُڑے ہوئے شکرے بھٹنے پائیں ہم تم پرے پر ملاتے ساتوں آسمانوں کی بلندیوں پر محیط ہو کر کائنات کو اپنے شہپر کی جولانگاہ بنالیں۔

اور سہیل! نرم نرم گدوں پر بیٹھ کر تو ان شکاریوں کے کارناموں کو پڑھتے ہی ہو جو دنیا کے گرد گرد گھیرا ڈال کر بڑے زور سے انسانی ہانکا کر رہے ہیں لیکن اگر تم یہاں آجاؤ تو اندازہ کرو کہ ان کا صد سالہ جال اس جنگلی سوسائٹی میں سب سے کم کامیاب ہے اور آج تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ پادری صاحب میرے مقابلہ پر اسے کندھے پر رکھ کر چلتے بنے۔

تم بھی کہو گے عجیب بے تکا آدمی ہے، میں شکاری کہانی طلب کر رہا ہوں اور یہ مجھے اپنے ساتھ پرے پر ملا کر دعوتِ پرواز دے رہا ہے، مگر بھیا! تم ہی غور کرو کہ اب اور آج شکاری کہانی لکھنے کا وقت ہے یا شکار کھیلنے کا! شروع میں تو جنگل کی رات بھنبھناتی رہی یا رات میں جنگل بھائیں بھائیں کرتا رہا اور اسی میں پادری صاحب کے مکالمہ کی آواز صدا بہ صحرا سی کانوں میں گونجتی رہی، اور پھر اس کے بعد آج تک وحشیوں کے نغمہ کی شیریں آواز جل ترنگ سی بجا رہی ہے میرے اندر! جیسے بہت سے پہاڑی چشموں کا ایک میٹھا نغمہ تسلسل و تواتر کے ساتھ شعور میں گونج رہا ہے اور یہ تو کل ہی کی داستان ہے اور سمجھ میں نہیں آتا دوست ان کی کون سی مہم کو ترجیح دوں! کل کے برچھے کے شکار کو یا آج کے کتوں کے شکار کو! آج ان کے کتوں نے تو غضب کا تماشہ دکھایا! ہمارے دیسی نسل کے بلکہ اس سے بہتر نسل کے کتے ان کے پاس ہیں سہیل! حیرت سے زیادہ رونے کا مقام ہے کہ شکار میں بن بلاؤ کی ذرا سی پھنکار اور گیدڑ کی ادنیٰ سی بھبکی کے مارے دم دبا کر HOUNDING کا میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں اور دودھ پلا پلا کر اور ڈاگ بسکٹ کھلا کھلا کر شکار کے لیے تیار کیے جاتے جاتے ہیں اور ان کے پس خوردہ چھیچھڑوں پر پلے کتوں نے آج میری آنکھوں کے آگے آن کی آن میں شیرنی کے چیتھڑے اُڑا دیئے جو کل اسی LOCALITY میں کہیں پر دُبکی ہوئی تھی اور پھر تمام رات غرا غرا کر شیر کو پکارتی پھری تھی اور آج علی الصبح ان ظالموں نے اسے اپنے کتوں سے جا دبایا۔

غضب کا سین تھا سہیل! بس وہی کہنا پڑتا ہے کہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ کیا

لکھوں! کل سے زیادہ سنسنی خیز تھا آج کا ڈرامہ اور بھیّا! آج تو میری بندوق میں کارتوس پڑنے کی بھی نوبت نہ آئی! بس دوربین سے تھیٹر کے اسٹیج کی طرح سب کچھ دیکھتا رہا الامان! عزرائیل کی عزرائیل کی ٹکر تھی اور کئی کتے بھی بُری طرح زخمی ہوئے یہ خانہ بدوش اپنے کتوں کو اپنے بچوں کی طرح چاہتے ہیں اور شیر کا شکار ان کے معاشی مشاغل میں تو ہے نہیں ویسے یہ ہٹنا تو کسی چیز کے سامنے سے جانتے ہی نہیں ہیں نہ راجپوتانہ سے اُٹھی ہوئی آندھیوں سے، نہ خلیج بنگال کی چلی ہوئی بارشوں سے اور نہ ہمالیہ کی چوٹیوں سے آتی ہوئی برف باریوں سے، ہر ایک کے مقابلہ میں ان کا علم بلند ہی رہتا ہے تو اس شیر کے جوڑے سے کب پہلو تہی کرتے، مگر اس کا مارنا تو ان کے لیے معاشی فرض بھی بن گیا تھا کیوں کہ انھوں نے اندازہ کرلیا تھا کہ ان کی موجودگی کی وجہ سے چرندے جنگل خالی کر گئے ہیں جو ان کی زندہ کھیتی ہیں، اور بس اس کھیتی کی رکھوالی کے سلسلہ میں انھوں نے شیر کا شکار علاوہ شکاری جذبہ کے ایک معاشی فرض سمجھ کر کیا اور پہلے روز تو خیر خلافِ امید بجائے نیل، سانبھر، جھانک، چیتل پھاندنے کے گھاس میں سے وہ لہر چل پڑی تھی مگر آج تو یہ کتوں کو لے کر اور رات میں شیرنی کی آواز سُن کر باقاعدہ منظم شیر کے شکار کی اسکیم بنا کر گئے تھے۔ اب وقت کوتاہ قصّہ طولانی آج کی مہم کے حالات اگر تم آئے تو جاءِ وقوع دکھا کر سُناؤں گا۔

لیجیے! صبح صادق ہو رہی ہے، کیمپ کے روزنوں سے وہ خطِ نور نظر آرہا ہے، دھند میلے آسمان پر کھنچا ہوا مشرق سے مغرب تک، فضا آج صاف ہے، سردی جمود پیدا کر رہی ہے اور انگلیوں سے قلم چھوٹ رہا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ سی معلوم ہو رہی ہے! طبیعت آرام چاہتی ہے، اگر اک ذرا کی ذرا پیٹھ سیدھی کرنے کو لیٹ بھی گیا تو کچھ بھی نہیں، کسل اور بڑھ جائے گا اور آج کے شکار میں میرا FUNCTION ضرور رہے گا سورج نکلتے نکلتے چل پڑنا ہے، اور تمام رات لکھتے گذر گئی شروع میں لیٹ گیا کچھ سونے کی کوشش کی، منہ ڈھکا، کروٹیں بدلیں مگر کل اور آج کے شکار، پادری صاحب کی بحث اور خانہ بدوشوں کا نغمہ اور صبح کا پروگرام جس میں خوش ہو کر خانہ بدوشوں نے میرا بھی پارٹ اور چانس مدِّنظر رکھا ہے اور ان سب پر ستم بالائے ستم رات کھانے کے بعد دو پیالی چاء! دیوانہ را ہوئے بس است! اور

یہاں تو ایک دیوانے کے سرانتی "ہوئیں" تھیں، لہٰذا نیند آنا تو معلوم ہو گیا تھا۔ جاڑوں کی پہاڑ سی رات، سوچا تھوڑی بہت تمہارا خط پورا کرنے میں ہی کاٹ دوں، اور ابھی خط پورا نہ کرنے پایا تھا کہ اخیر رات کیمپ سے تھوڑی دور پر بارہ سنگھا ہوکنے لگا، شاید کبھی سُنی ہو تم نے اس کی آواز، کتنی وحشت زا ہوتی ہے کم بخت! چرندہ ہوتے ہوئے اتنی ڈراؤنی کہ نئے شکاری تو کیمپ کے اندر لحافوں میں سہم جاتے ہیں، جیسے براہِ راست سینہ کے اندر گونج کر ہول سی پیدا کرتی ہے اور بچپن کا بیٹھا ہوا باطل خوف آج تک دل میں جگہ کیے ہوئے ہے، مجھے یاد ہے جب آٹھ نو سال کی عمر میں ابا جان کے ساتھ شکار کو آیا تھا تو پہلی مرتبہ سُن کر ڈر کے مارے لحاف میں خوب بھینچ کر مُنہ ڈھانپ لیا تھا اور کیمپ کاٹ پر پڑے ہی پڑے کپڑے کی دیواروں کے غیر محفوظ ہونے کے اندیشہ میں نیند اُڑ گئی تھی۔

سہیل! کہتے ہیں کہ خوشبو اور رنگ وقت کو یاد دلاتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ آواز بھی، ورنہ اس کی پہلی ضرب پر آج تک وہ وقت کیوں یاد آجاتا ہے اور اب جبکہ اٹھائیس سال سے عمر کے ہر سال میں سے آٹھ مہینے جنگل میں کٹنے کا اوسط ہے یہ ہوک کم بخت مجھ کو یک گونہ متاثر ضرور کرتی ہے اور آج بھی باوجود تمہارے اس خط کے استغراق کے ہر مرتبہ مجھ کو اپنی جانب متوجہ کر رہی ہے اور اگر میں نہ لکھتا ہوتا تو ایک نامعلوم سی وحشت کا موجب ہوتی۔ اگرچہ آج کے شکار کے لیے یہ نیک فال ہے اور صبح ہی صبح اچھا شگون! اور تم جانتے ہو کہ جنگلی جانوروں کی بولیوں سے شگون لینا تو ہندوستانی روایات میں چلا آرہا ہے اور ہم شکاریوں میں تو باقاعدہ انھیں پیشگوئیاں سمجھا جاتا ہے اور ان چرندوں کی ناک کو تو تم جانتے ہی ہوگے بڑی تیز ہوتی ہے بس جیسے شیر کے کان! اور یہ درندوں کی بُو پاکر ہٹ جاتے ہیں اور اپنی ہاٹیں چھوڑ جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ جنگل چرندوں سے خالی ملا یہاں پر شیر کا جوڑا نہ معلوم کہاں سے بلا سان گمان ان جنگلیوں کے ہاتھوں کتے کی موت مرنے آن مرا! اور تمام جنگل کا چرندہ درہم برہم ہو گیا۔ لیکن آج تو خیر آدھی رات گئے سے بارہ سنگھا ہوک رہا ہے، جنگل میں خیریت کا نقیب! ہاں! آج ادھر چرندے رجوع ہو رہے ہیں، کل تو خاموش فضا میں شیرنی کی بُلاتی ہوئی مخصوص نرم آواز کسی کسی وقت سُنائی دی جو میں پہچان ہی نہ سکا کہ یہ بیوہ شیرنی کا نالۂ نیم شبی ہے کیوں کہ میرے

وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ابھی ایک اور باقی ہے مگر صبح کو یہ گُل کھلا، یک نہ شد دو شد!

لو اب تو بالکل ہی صبح نکل آئی۔ میں لکھ چکا ہوں کہ آج خانہ بدوش مجھ کو شکار میں باقاعدہ شریک کر کے میرے "ناقص" ہتھیاروں کے مطابق مجھ کو چانس دیں گے۔ یہ سو برس میں پادری صاحب سے نہ معلوم کیوں اتنے مانوس نہ ہونے پائے جتنے مجھ سے پچاس گھنٹوں میں ہو گئے اور آج تو یہ عالم تھا کہ خیر پادری صاحب کے بقول میں تو خود کو ان میں سے ایک نہیں سمجھ رہا ہوں لیکن جیسے وہ مجھے اپنوں میں سے ایک خیال کر رہے ہیں۔ میری سیادت اور چاہت کا اپنے مخصوص زاویہ سے اس سے بالکل مختلف جس سے میرے متعلقہ کاشت کار اور رعایا کرتے ہیں پُر خلوص لحاظ سا کرتے ہوئے مجھے ایک بالکل نئے جذبہ سے آشنا کر رہے ہیں اور میں ان کے درمیان ایک ساتھی کی تلاش میں ہوں تاکہ ہم مل کر ان کے متعلق تبادلۂ خیال تو کر سکیں۔ اور یہاں ؎

ہے انیسِ شامِ فرقت، دشتِ تنہائی میں کون
گونج صحرا کی فقط دم ساز ہو کر رہ گئی!

بصیر بدایونی

گونج! جس میں حل سا ہوتا جا رہا ہوں یا یہ گونج میرے کان کے پردوں پر ریکارڈ ہو کر رہ گئی ہے! لو وہ مرغا بول اٹھا! قادر سماعت بن مرغے! درختوں کی پھنگیوں پر بیٹھے اذان کی زنجیر مشرق سے مغرب تک ملا رہے ہیں، کیمپ کے ارد گرد درختوں پر جھانپلیں "سچے پیر! سچے پیر!" چیخ رہی ہیں۔

اور اب تو "جھاڑی والے راجہ" (بھورے تیتر) بھی "پٹ لو! پٹ لو" پکارنے لگے، تمام جنگل مسلسل بھنبھناہٹ میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ خاموشی و سکوت کا دبیز پردہ آہستہ آہستہ چاک ہو رہا ہے، ڈوبتے چاند کی کرنیں مغرب سے مشرق کو لمبے لمبے سائے سے پھینک رہی ہیں اور آج تو مطلع صاف ہے اور مشرق سے بڑھتی ہوئی روشنی کے سُرخ سیلاب اور معدوم ہوتی ہوئی دودھ سی چاندنی میں ایک دل آویز امتزاج سا ہو کر زمین سے آسمان تک فردوسیں ماحول کا سماں پیش کر رہا ہے اور نہ معلوم باہر کیا عالم ہو گا میں تو کیمپ کے

جالی دار روزنوں سے ہی اندازہ کر کے وجد میں آیا جارہا ہوں، باوجود سردی کی اتنی شدت کے بھی! کیمپ کاٹ پر ہی بیٹھے ہی بیٹھے خط پورا کیا اور کل رات تو تمہیں لکھتا لکھتا سو گیا تھا۔ آج تمام بدن لحاف لپیٹے ہونے کے باوجود بھی یخ سا ہو گیا اور باورچی خانہ سے چائے کے برتنوں کی کھنک گرما گرم شیریں نغمہ سا بن کر کان میں پڑ رہی ہے۔ تمہاری شکاری کہانی لکھنے کی دعوت پر تمہیں یہاں جنگل میں شکار کی دعوت دے رہا ہوں، سوال دیگر جواب دیگر! اب تم یہاں آکر دیکھ ہی جو لوگے کہ شکاری کہانی لکھتا یا شکار کھیلتا! جواب اور آمد کے پروگرام سے مطلع کرنا، میری ڈاک اخبار کے ساتھ گھر سے روزانہ شام کو یہاں پہنچتی رہے گی، اور جس ٹرین سے تم آؤ گے اس پر جیپ بھیج دوں گا۔ یہاں سے چھوٹی لائن کا اسٹیشن گھوڑی بائیس میل پورب کو کچے راستہ پر ہے اور گرینڈ ٹرنک روڈ جس پر بس چلتی ہے کچے راستہ پر پچیس میل کے فاصلہ پر پچھم کی جانب ملتی ہے اور اس کے لیے بڑی لائن کے بریلی علی گڑھ برانچ کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن آصف پور پر اترنا پڑتا ہے۔ جس راستہ آؤ گے جیپ ملے گی، صحیح اطلاع دینا تمہارا کام رہا اور میں تو لمبا پروگرام بنا کر آیا ہوں شاید پورا چلّہ یہیں گھومتا رہوں۔ ہاں ایک چیز لیتے آنا اگر مل سکیں تو ایک کنڈی پرول اور تھوڑے سنگترے، جنگل میں سبز ترکاری اچھی طرح ہاتھ نہیں آتی اور گوشت کھاتے کھاتے جی چھوڑ جاؤ گے اور سنگتروں کو میں نے یوں لکھ دیا کہ ادھر تمہاری جانب غالباً سلہٹ کا سنگترا آتا ہے چاشنی دار وہ ہمارے یہاں پہنچتا نہیں، اور یہ ناگ پوری سنگترے تو اتنے شیریں ہوتے ہیں کہ پھل کی حد سے گذر کر مٹھائی سی بن جاتے ہیں اور اخیر فصل پر تو PERRY اور MORTON کے آرنج ڈراپس۔

اور ہاں بھولنا مت، ڈھیر سارا گیاجی کا خمیرہ بھی ساتھ لانا۔ تمام دن جنگل میں سگریٹ پیتے پیتے پریشان ہو جاتا ہوں، رات کو حُقّہ کو طبیعت چاہتی ہے اور تمباکو یہاں اچھی نہیں ملتی اور بنگلہ پانوں کی ایک ٹوکری، آج کل جاڑوں میں بنگلہ پان بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اور تم پان کے رسیا ہو!

اچھا تم شکاری افسانہ کے منتظر ہوگئے اور میں شکار پارٹی بنانے کے لیے تمہارا منتظر ہوں — بھابی سے تھوڑے دنوں کے لیے رخصت کی معافی مانگ لینا، سمجھے! اور کوئی حیلہ درمیان میں نہ لانا۔ اپنا چھوٹا بڑا رائفل اور بارہ بور لیتے آنا۔ رائفل کے کارتوس رکھتے لانا بارہ بور کا ہر قسم کا امونیشن لانگ رینج کا میرے ساتھ ہے۔ فکر نہ کرنا — لیجیے چار حاضر ہے!

اچھا رخصت! بچوں کو پیار۔ بھابی کو آداب و دعائیں! فقط والسلام باقی بالمشافہ...

تمہارا منتظر

ابوالفضل صدیقی ۸/۱۲/۱۹۵۲ء

(۶½ بجے صبح)

زیرِ دام کون!

منسٹری قائم ہوئی، محکمے بنے اور ان سب میں بندر کی سی اضطراری حرکات کا ارتکاب کیا گیا جن کا وزارتیں اور محکمے، بنیادی کام کے نام کی آڑ سے کیا کرتے ہیں اور جب اس سے بھی حل نہ ہوا تو بانس پر ناچنے والے نٹوں کی طرح پیٹ کا ڈھول بجا بجا کر مانگا۔ گھر آنگن میں قانون چلا اور قبلۂ درخت گندم کی اونچائی اودھ کے صاحب زادوں کو بھی معلوم ہو گئی اور انڈین سول سروس کے حکام کو بھی پتہ چل گیا کہ پہاڑی سنگھاڑے HAZEL NUT کے درخت کی طرح دیسی سنگھاڑے کا سربفلک درخت نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کی بیل تالاب میں شیطان کی آنت کی طرح پونڈری ہوتی ہے۔ بڑی بڑی شاندار مغربی وضع کی کوٹھیوں کے ہریالی کے لانوں میں گدھوں کے ہل چل گئے۔ ان محلسراؤں کے پائیں باغوں میں کھیتیاں لہلہانے لگیں جن کے سکّان اپنے پندار میں بتاشوں کا لہلہاتا کھیت سمجھا کرتے تھے جہاں سے مٹر کی پھلیوں کی طرح سفید سفید بتاشے بازار میں بکنے آیا کرتے تھے۔

اور جب بھی پیٹ نہ بھرا تو قطب شمالی سے قطب جنوبی تک بھیک مانگی۔ پرانی دنیا چھوڑ نئی دنیا میں مظاہرے ہوئے۔ بھانت بھانت کے پروپیگنڈے کیے۔ اُدھر سانڈے کا طلاء بیچنے والے سڑک کنارے کے حکیم کی طرح تقریریں ہوئیں، اسکیم مرتب ہوئی جس کا نام نامی GROW MORE FOOD تصنیف کیا گیا۔ پانی والے مہاراج وزارت

کے روحانی رہنما ہوئے مگر رزاقِ مطلق کے کان پر جوں نہ رینگی اور ان سب ٹھٹ کروں کے بعد بھی ماگھ ننگے، بیساکھ بھوکے ہی رہے۔ اور ان بندر والی محکمہ جاتی حرکتوں سے بڑھی ہوئی کچھ لنگور شاہی جست قسم کی حرکت خوراک منتری کے پیہم دورے تھے، جو مجسٹریٹ ضلع کے عصاء کے سہارے ضلع ضلع جلسہ کر کے اپنی کلیجی کا مظاہرہ کرنے اور اسکیم کو کامیاب بنانے میں کچھ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی سی تجویزیں پیش کرتے۔ اور ہماری توجہ ہمارے ان دو گاؤں کی جانب مبذول ہو گئی جن کو جنگلی چرندوں کی وجہ سے ناقابلِ کاشت ہو کر مجبوراً ویران ہونا پڑا تھا۔ اور اس دس سال کے عرصہ میں ان کے کاشتہ رقبہ جات بنجر ہو گئے تھے اور آبادیاں ٹیلے ——— اور منتری ایسے رقبوں کو دوبارہ زیرِ کاشت لانے کے لیے حکومت سے معقول امداد دینے کا وعدہ کر گئے۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں! ——— یہ دونوں اوجڑ گاؤں جہاں میں نے اور سنگھ بابو نے اپنے اپنے زراعتی فارم گورنمنٹ سے امداد لے کر ترقی یافتہ مشینی لائنس پر قائم کیے۔ اب سے دس بارہ سال پیشتر ایک دوسرے سے ہم سوانہ آباد تھے۔ جدید مشینری اور اس کے ساتھ معقول رقم گورنمنٹ نے ششماہی قسط وار ادائیگی پر ہم کو بلا سودی قرض دی اور سب سے بڑی چیز جو ہم کو ملی وہ کنٹرول ریٹ پر کارتوس تھے اور ہتھیاروں کی تو ہمارے ہاں کمی نہ تھی۔ ہر پور کا رائفل جو چرندوں کے شکار میں کام آتا ہے، اور ایک چھوڑ دو دو بارہ بور بندوقیں۔ اور اب ہمیں شکار کھیلنا تھا۔ ایک معاشی مشغلہ کی آڑ لے کر، دو سال میں ہم نے جنگل میں قیامت برپا کر دی۔ گلّے کے گلّے ہرنوں، چیتلوں سانبھروں اور سوٗروں کے صاف کر دیے۔ اور ہم سائنٹیفک اصول پر کام کر رہے تھے اپنی تقریر کے دوران میں وزیر صاحب بالقابہ نے بتایا تھا کہ خالص انسانی غذا کا دس فی صدی حصّہ تو وہ پالتو جانور کھا جاتے ہیں جو غذاء انسانی کی کوئی بھی مقدار پیدا نہیں کر سکتے اور دس فی صدی وہ پالتو جانور کھا جاتے ہیں جو اپنی ساری عمر میں اپنی خوراک کا ٹھیک نصف پیدا کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اور انھوں نے فرمایا تھا کہ بقیہ ۸۵ فی صدی میں سے بیس فی صدی وحشی چرندے کھا جاتے ہیں جن میں سے بعض کے استیصال کی صورت ہنوز حکومت کے زیرِ غور ہے۔ مگر اول الذکر

پندرہ فی صدی کیا جانے والے پالتو جانوروں کا استحصال تو درکنار بال بیکا کرنے پر بھی تعزیراتِ ہند کا ترمیم شدہ پنجہ گردن پکڑتا ہے۔ حالانکہ یہ جدید ترمیم اس پنجہ سے ہوئی ہے جس نے بیماری کی تکلیف سے نجات دلانے کے لیے اپنے بچھڑے کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اگرچہ اس وقت بھی سماجی جنگل نے اس حرکت پر باوجود پدرانہ اقتدار کے اپنے اس سیاسی باپ کی گردن پکڑلی تھی اور بیچارے بڈھے کو بڑی مشکل سے اپنی گلو خلاصی کرانی تھی۔

مگر ہر جگہ ان کی شانِ نزول بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں شانِ وجود بھی بیان کی جاتی ہے کہ کوئی کرشن بھگت قسم کا سادھو انھیں جنگل میں پالے ہوئے تھا۔ سادھو مر گیا، پہلے یہ آوارہ ہوئیں اور پھر وحشی ہو کر رہ گئیں اور پالتو گائے سے تصخیص کرنے کے لیے انھیں "ہیل" کا نام دے دیا ورنہ یہ سیدھی سادی گائیں ہیں بھی ہماری آپ کی پالتو جیسی، گائے جو آبادی میں شاطرینِ سیاست کی مذہبی و سماجی بساط کی فرزیں ہیں اور جنگل میں اس کا وجود اتنا ہی نحس ہے جتنا آبادی میں سعید کہا جاتا ہے۔ اگرچہ جنگل تک ان کی اہمیت بدستور قائم ہے اور یہ کرشن بھگت سادھو کی پالتو ہونے کی روایت ان کے کیسرے وجود میں چار چاند لگانے کے لیے لگی ہوئی ہے مگر ان کی ظاہری ہیئت سب سے بڑی غماز ہے ان کے صحرائی النسل ہونے کی، یہ ملک کے طول و عرض میں تقریباً ہر جنگل میں دیکھی جاسکتی ہیں مگر ہر جگہ ایک ہی رنگ کی یعنی سیاہ و سفید "کیسری"، تو کیا ہر سادھو ہر جنگل میں اسی رنگ کی پالے ہوئے تھا۔ مانی ہوئی بات ہے، ہر جاندار اپنے ماحول سے رنگ اختیار کرتا ہے اور انھوں نے اپنا یہ کیسرا رنگ اپنی جائے رہائش سے لیا ہے جہاں گھنے درختوں تلے دن کو دھوپ اور رات کو چاندنی یہی رنگ جمائے رہتی ہے۔ اور یہ سادھو والی روایت ان کی عظمت کو جنگل میں سہارا دینے کے لیے لگی ہوئی ہے تاکہ ان کا سلسلۂ نسب براہِ راست ان مقدس گایوں سے ملتا رہے جنھیں کرشن جی بہ نفسِ نفیس خود شرفِ پرورش بخشا کرتے تھے۔ ملک کے اکثر حصّوں میں ایسے اضلاع ملیں گے جہاں کاشت علاقے کے علاقے جنگلی چرندوں نے ویران کر دیے۔ اور ان چرندوں میں سب سے اہم وجود ان کا ہے، دوسرے جنگلی چرندوں کا تو باوجود سامانِ شکار کی گرانی اور کم یابی کے تھوڑا بہت دفعیہ ان دس برسوں میں ہوتا رہا مگر ادھر پانچ سال میں "ہیل" پر فیر ہونا تو درکنار

کوئی ان کا رونگٹا توڑنے کی بھی ہمت نہ کرسکتا تھا۔ یوں بھی ان پانچ سالوں سے پہلے والے پانچ سال میں ہر چیز سے زیادہ ہتھیار اور ہتھیاروں سے زیادہ امونیشن نایاب رہا اور ان ادھر والے پانچ سالوں میں ہر چیز سے زیادہ ہتھیار بند نایاب ہوگیا اور میدانِ شکار سے شکاری معدوم ہو کر شکار ہی شکار رہ گیا...... اور حضرت اورنگ زیب عالم گیر کا قول "شکار کارِ بیکاراں است" اور یہاں "قحط سالی" نے کارِ بے کاری اتنا بڑھا دیا کہ بڑے بڑے کارپرداز کار سے بے کار ہوگئے اور یار لوگ دمشق کی طرح ہندوستان میں بھی عشق فراموش کر بیٹھے اور شکار، جہاد، مشاغل ہیں عشق و رقت طلب! اور عشق و رقت آتی ہے حلال کی روٹی کھا کر! اور حلال کی روٹی میں سے ایک وقت کی تو بغیر مالک والے سو کھے مویشی اور وحشی چرندے کھا جاتے ہیں اور ایک وقت کی یاروں کے حصّہ میں آتی ہے اور شکار چاہتا ہے ربط، ضبط اور خبط کی حرکتوں کا تسلسل و تواتر، اور زمانہ کے جمود نے بڑے بڑے چلتے پرزے شکاریوں کے شوق پر پہلے اوس گرائی، اور پھر برف باری کردی۔ پارٹیاں منتشر ہوگئیں، شوق غائب ہوگئے اور ع

خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

اور کیوں نہ ہو، نئے دور کا آغاز طاؤس و رباب سے ہوا ہے اور شکار میں شمشیر و سناں چلتی ہے اور جب محکمۂ غذائیات نے اعداد و شمار لگا کر اندازہ کیا تو بتایا کہ ملک کی FOOD PROBLEM انھیں مویشیوں، بندروں، کوّوں اور وحشی چرندوں کے گرد ناچتی رہتی ہے۔ مگر دو سال کے اندر اپنے دونوں مواضعات کی اراضیات پر ہم نے بڑی حد تک وحشی چرندوں کا استیصال کر کے قبضہ کر لیا اور جب ہم نے بھی حساب لگائے تو ہمارے نفع نقصان کا پتہ اب تک صرف انہی کالی کیسری ہیلوں کے گرد گھوم رہا تھا جو اور سب وحشی چرندوں کے ختم ہو جانے کے باوجود جوں کی توں پوری جماعت کے ساتھ اب تک جنگل کی سول مانرک SOLE MONARCH بنی ہوئی تھیں۔

ہمارے زراعتی فارم ایک بڑے جنگل سے ملحق ہیں۔ میں نے اور سنگھ بابو نے بچپن سے ساتھ ساتھ شکار کھیلا ہے ـــ کنور رکشپال سنگھ اس کا نام ہے اور سنگھ بابو

شکاری لقب، وہ ایک اچھا قادر انداز اسپورٹس مین ہے اور باوجود دیہاتی راجپوت رئیس زادہ ہونے کے نہایت ٹھنڈے مزاج کا شکاری ہے اور بے چارہ عمر بھر میری صفراوی المزاجی سے جو کبھی کبھی شکار میں میری چابک دستی کو تلوّن کی حد تک پہنچا دیتی ہے، نالاں رہا ہے۔

اور ہم نے دو سال میں جو مہم ہرن، چیتل، بارہ سنگھے، سؤر اور سانبھر کے شکار کی جاری کی تھی اس میں ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم نے اپنے فارموں سے ان کا وجود مٹا دیا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ دن رات کی مار دھاڑ اور پیہم دھماکوں سے ان کے نقصانات ہمارے فارموں پر اتنے کم رہ گئے تھے جو آسانی سے قابل برداشت تھے۔ مگر "ہیل" کا حل ہنوز نہ سوچ سکے تھے تعزیرات ہند میں مردم کشی اور گئو کشی ویسے تو خیر ایک ہی خانہ میں لکھی ہوئی ہے۔ لیکن مردم کشی پر صرف مقتول کے ورثاء اور حکومت کی مشینری کا ایک چھوٹا سا پرزہ حرکت میں آتا ہے اور گئو کشی ویسے تو خیر ایک ہی خانہ میں لکھی ہوئی ہے۔ لیکن مردم کشی پر صرف مقتول کے ورثاء اور حکومت کی مشینری کا ایک چھوٹا سا پرزہ حرکت میں آتا ہے اور گئو کشی پر راس کماری سے ماؤنٹ ایورسٹ تک اور کلکتہ سے امرت سر تک سارے کی ساری دنیا میں بھونچال آجاتا ہے اور حکومت کی مشینری کا ہر پرزہ اپنی اپنی مرضی کے مطابق جیسی چاہے حرکت کرنے لگتا ہے۔ اور ہیلیں ہوتی ہیں سیدھی سادی گائیں، اب یہ دوسری بات ہے کہ جس وقت یہ کاشتہ رقبوں پر پڑتی ہیں تو ایک ہی چرائی میں میلوں تک کھاکر اور کھانے سے ٹھیک دس گنا کچل کر برباد کر دیتی ہیں اور پانچ سال سے یوں بھی شکاری ناپید تھے اور جو کہیں کہیں اکا دُکا باقی رہ گیا تھا اس کی کیا مجال تھی جو سر ہتھیلی پر رکھ کر اس کا شکار کھیلتا۔ ورنہ اس کا شکار میرے لیے کوئی نئی چیز نہ تھا۔ ان پانچ سال سے پہلے والے پچیس سال میں۔ ہر سال بیسیوں ہیلیں اور بُل ہر جسامت کے شکار کرتا رہا ہوں اور علاوہ اس کے شکار کے اعلیٰ قسم کے EXITEMENT کے گوشت کی مائل بہ ترقی مخصوص لذت و روغنیت کے ساتھ ایک خاص بھینی بھینی خوشبو سے میرا کام و دہن خوب آشنا ہے۔ گوشت کا یہ عالم کہ پھڑکتے ہوئے پارچوں کے پہاڑ کے پہاڑ! چربی کی یہ افراط کہ سینکڑوں ڈنبوں کی چکیوں کے تودے ڈھیر کر دیے ہیں! افراط ہی افراط، لذت ہی لذت اور یہ تو جنگلی تھیں، پانچ سال سے تو ہر پالتو گائے پر جو اپنے مالک کے تھان پر ہی بندھی کیوں نہ ہو، اپنی نہ سمجھنے کی عادت

ہو گئی تھی اور پرائی نظر آتی تھی۔ اور یہ جنگلی گائیں تو اندھے کی لاٹھی تھیں جن کی داد نہ فریاد! کسی کی پالتو گائے کھیت میں پڑ جائے تو اس کو تنبیہ کر دو۔ کانجی ہاؤس بھیج دو۔ نقصان رسانی میں مقدمہ دائر کرکے خرچہ وصول کر لو۔ مگر یہ تو کنہیا جی ان کی کھڑی کھیتی چراتے رہیں اور حضرتِ آدم کھڑے دیکھتے رہیں اور زیرِ لب 'ٹک ٹک دیدم' دم نہ کشیدم کا وظیفہ پڑھتے رہیں۔ لیکن سنگھ بابو نے پانچ سال بعد اس کے شکار کا نادر ترین پہلو جو پیش کیا تو میں اس کی ذہانت پر عش عش کر گیا۔ اور میں نے اندازہ کیا کہ اس دیہاتی شکاری کی تجویز بلکہ تجویز کاہے کو ترکیب ملک کے ان مدبرین کی ہر فکر سے زیادہ اچھی تھی جو ہزاروں روپیہ تنخواہ پاکر دن رات اس مسئلہ کے حل کرنے کی فکر میں پل پل کر بھینسا ہو جاتے ہیں۔

۲

میرے اور سنگھ بابو کے فارم کے چکوں کے درمیان بڑے مہیب گھنے جنگل کی پٹی حائل ہے جس کی چوڑائی تو صرف پانچ چھ میل تھی۔ مگر لمبائی میلوں چلی گئی ہے اور ادھر فاریسٹ اور نیپال کی ترائیوں سے سرے ملے ہوئے ہیں اور یہ پٹی پناہ گاہ ہے ان تمام وحشی چرندوں کی جو اس کے شمال کے کنارے سے نکل کر سنگھ بابو کے فارم پر اور جنوب کے کنارے سے نکل کر میرے فارم پر پڑتے ہیں۔ اور ہم نے میلوں تک اس گھنے جنگل میں گھس گھس کر خوب خوب شکار کھیلا ہے، یہاں تک کہ ہرن ختم ہو گئے، سانبھر ختم ہو گئے، جھانک اور چیتل شکار ہو گئے، اور سوٗر مٹ گئے اور یہ جنگل اب پناہ گاہ رہ گیا صرف ان ہیلوں کی جو بلائے بے درماں بن کر جب شمال کی جانب رُخ کرتی ہیں تو سنگھ بابو کی ہری بھری کھیتی پر پڑتی ہیں، اور جب جنوب کی جانب مُنھ کریں تو میری کشتِ زار پر برق خرمن سوز بن کر پڑتی ہیں — پھر ہزار وحشی سہی پانچ سال سے کسی شکاری نے بال بیکا بھی نہیں کیا ہے۔ لہٰذا ان میں وحشت بھی کم ہو گئی ہے۔ ڈھول بجانے اور آگ جلانے سے بہت کم ڈرتی ہیں اور جب بھاگتی ہیں تو ایک چک سے بھاگ کر دوسرے چک میں جا پڑتی ہیں۔ جنگلی گھاس اور بناسپتی پر بدرجہ مجبوری دو چار مُنہ مار لے تو مار لے ورنہ گلّے کے گلّے کہیں نہ کہیں کشتِ دہقان پر پڑتے ہیں اور جب غریب کسان ہنکاتے ہنکاتے عاجز ہو جاتے ہیں تو یہاں تک مجبور ہوتے ہیں کہ گاؤں خالی کر دیتے ہیں اور کھیتی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اور میرے اور سنگھ بابو کے کھیت مزدوروں کو تمام تمام دن ساری

ساری رات ہنکاتے ہی گذرتا تھا اور پھر بھی ہفتہ میں ایک آدھ چک کی تباہی کی خبر کان میں آتی رہتی۔ اور ہم دونوں اس گتھی کو سلجھانے میں ہمہ وقت سوچ میں رہتے تھے کہ ایک روز سنگھ بابو اپنی چینی گھوڑی پر سوار میرے بنگلہ پر پہنچے۔ ہمارے فارموں کے بیچوں بیچ ہمارے وسیع صحن والے بنگلے بنے ہوئے تھے جن کو ہم اپنے شکاری پروگراموں کے دوران میں اپنے ریسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال کرتے تھے اور سال کے ہر حصّہ میں یہ مکانات ہمارے فارم کے آلات اور ملازمین اور پیداوار رکھنے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ مگر سال میں چھ سات مہینے تو ہم دونوں کے شکاری پروگراموں کے سلسلہ میں یہیں کٹتے تھے کیوں کہ دو سال سے ہمارا شکاری مشغلہ بھی تو بشرح صدر لکھا جارہا تھا اور وہ بھی کاشت کاری کا اہم ترین جزو بن کر معاشی مشغلہ بن گیا تھا۔

اور آج سنگھ بابو معمول کے مطابق مجھ سے ملنے آئے تھے مگر خلافِ معمول گھوڑی پر سوار اور بغیر کوئی بھی ہتھیار لیے ایک ریشم کی باگ ڈور سیدھے ہاتھ میں، راسیں اُلٹے ہاتھ میں، اور وہ میرے مویشی خانہ کا صحن پار کر کے گھوڑی پر چڑھے ہی چڑھے ڈھال پر چڑھاتے ہوئے بنگلہ کے چبوترے پر معہ گھوڑی کے پہنچ گئے اور میں نے کہا۔

"کیوں خیر تو ہے! آج کیسے، کیا پگ اسٹکنگ کا پروگرام سوچ رہے ہو؟" اور یہ کہتے ہوئے میں نے محبّت اور اشتیاق بھری نگاہوں سے ان کی تھرکتی گھوڑی کو اشارہ کیا۔

"جی ہاں — وہ — آں — پ، پگ اسٹکنگ — کہاں! — بھلا!! — مگر یار ہے آج کچھ اسی قسم کا موقع —!" اور یہ کہہ کر ہاتھ میں سے خاکی رسی بڑھائی۔

سنگھ بابو ایک بدانند قسم کا اسپورٹس مین ہے اور اس کا دماغ ہمیشہ تجدید کی جانب رہتا تھا اور اس کی بعض تجدیدیں شکار میں نہایت ہی مضحکہ خیز ہوتی تھیں۔ میں نے کہا —

"کیوں یہ پیراشوٹ کی رسّی! اس کی شانِ نزول کچھ شکاری سلسلہ میں ہے — کیا —؟"

اور ان کے چہرے پر نہایت ہی استادانہ قسم کی نشانیاں اُبھر آئیں۔ انھوں نے نہایت ہی خوداعتمادانہ انداز میں ایک گھونٹ سا لیا۔ ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر اپنے

مخصوص انداز میں اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ایک منٹ سکوت اختیار کیا اور میں نے گھوڑی کا اضطراب دیکھ کر کہا۔

" اچھا تو اُتر تو لو، اطمینان سے بیٹھ کر بات کرو۔"

اور میرے کہتے ہی ایک ملازم گھوڑی لینے دوڑا مگر سنگھ بابو نے کہا۔

" نہیں نہیں، ٹھیک ہوں۔"

اور میں نے اندازہ کیا کہ آج کنور صاحب پر گھوڑ سواری کا بے پناہ بھوت سوار ہے۔ میں نے کہا۔

" کیوں کیا یہیں سے سوار، ایسے ہی چلو گے کہیں، آخر زین سے اترتے کیوں نہیں ؟ مفت میں گھوڑی پریشان ہے اور یہ ہاتھ میں رسی کیسی ہے آج ؟ یار معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نئی سوچ کر لائے ہو !"

" ہاں یار نئی ہے اور دیکھو بلا سوچے سمجھے مذاق میں مت ڈال دینا۔ یہ دیکھو یہ پیراشوٹ کی رسی ہے بڑی مضبوط !" اور انھوں نے سبزی مائل خاکی ڈوری میری جانب پھینکی۔ " بس بھائی یہ کمند سمجھو۔ کمند ! پرانے زمانے میں کمند سے " بہ بست والا کام نکالا جاتا تھا۔"

" ہوں ! لائے کوئی نئی اُپج "۔ میں نے کہا۔ اور مذاقیہ تیوروں سے سنگھ بابو کی طرف دیکھا۔

" دیکھو یار نہیں تو پہلے !" انھوں نے متحرک گھوڑی پر جھومتے ہوئے کہا۔" میں آدمی IDEAL قسم کا ہوں۔ بہت سوچنے کے بعد یہ اختراع کر کے لایا ہوں۔ ہر صورت سے قابلِ عمل اور لائق صد تحسین، جو وہ تمہارے محکمہ غذائیات والے بھی سُنیں تو انعام دیں۔ اور بھئی یہ دیکھو کہ کسی کھونٹ ڈھیلی تو نہیں ہے میری ایجاد، دیکھو اس ریشمی رسی کا بڑا اچھا پھندا بنتا ہے اور تم ہی بتاؤ کہ اس پھندے سے کیا کام لے سکتے ہو۔"

اور میں نے تمسخرانہ کہا۔

" ظاہر بات ہے کہ پھندے سے پھانسی کا کام لیا جاتا ہے اور تمہاری ایجاد و اختراع

کبھی سوائے تنگ کے ڈھیلی بھی ہوئی ہے آج تک ؟"

"نہیں یار پھر وہی، دیکھو مذاق نہیں — یہ دیکھو اس کے سرے پر سیسے کا گول لٹو بندھا ہوا ہے — اور بس اسی کا پھندا بنا کر پھینکو اور بھاگتے بچھڑوں کو باندھ لو — !"

"یعنی بھاگتے ہیل کے بچھڑوں کو نا — !" میں نے کہا۔

"جی ہاں — ! اور پھندا نہایت اعلیٰ درجے کا میں بنا کر دکھا دوں — جو چھو بھی جائے تو مکڑی کے جالے کی طرح جہاں کا تہاں پھنس کر رہ جائے !"

"پھر وہ تو اس کے اثرات امرت دھارا والے ویسے ہی ہوں گے۔ کیوں کہ یہ کنور کشپال سنگھ کی ایجاد ہے !" میں نے کہا۔

"دیکھو یار میں مذاق نہیں کر رہا ہوں، مجھے دو۔" یہ کہہ کر انھوں نے گھوڑی سے نیچے جست لگائی اور میرے قریب کرسی پر بیٹھ گئے۔ "ادھر لاؤ رسی" انھوں نے کہا اور میرے ہاتھ سے رسی لے کر اس میں عجیب بلوں کے ساتھ تین چھوٹے بڑے پھندوں کا گچھ بنایا۔ ایسے پھندے جو ذرا سا کھینچنے پر کس جائیں اور انھیں پھندوں کے بیچوں بیچ وہ لٹو آگیا اور کہا — "یہ دیکھو بس اس کے وزن کے ذریعہ یہ پھندا پھینکا جائے گا اور ذرا سا تناؤ پڑتے ہی بچھڑا اس میں اس طرح پھنس جائے گا جیسے جالے میں مکھی اور بس بھئی اس کے ذریعہ ہم سب مسئلے حل کریں گے اور زیادہ نہیں سال سال بھر کے بچھڑوں کو پھانسیں گے۔"

میں نیم سنجیدہ ہو گیا اور میں نے کہا — "یعنی تمہارا مطلب یہ ہے کہ پگ اسٹکنگ کی طرح گھوڑا ڈال کر پھندا پھینکو گے نا — !"

"ہاں بالکل جس وقت ہم سؤر کے برچھا مارتے ہیں، اس وقت ہم بچھڑے پر پھندا پھینکیں گے۔ اور پھر دیکھو ان بچھڑوں کو پال کر کھیتی کے کام پر لگائیں گے !"

"بات تو ٹھیک ہے، آخر کچھ تو فصلوں کا نقصان برابر ہو گا" میں نے کہا۔

"اجی آپ سمجھے بھی کچھ فصلوں کا کتنا نقصان پورا کریں گے آپ اس میں شک نہیں کہ جب پرورش ہو جائیں گے تو خاصے بیل بنیں گے مگر اس کا دوسرا پہلو تو یار تم نے دیکھا

ہی نہیں۔" سنگھ بابو نے کہا اور مدبرانہ انداز بنا کر ایک منٹ سکوت کیا۔ جیسے ملک کی اہم سے پرابلم انھوں نے حل کر لی۔" اجی صاحب پھڑک جائیں گے پھڑک آپ کے وزیر صاحب تک جب سُنیں گے میری تجویز، اور دیکھیں گے یاروں کی عملی کوشش۔" اور وہ پھر سکوت کر گئے جیسے میرے اشتیاق پر اپنی خاموشی سے ایک ضرب ہی لگاتے ہیں۔ اور پھر پہلو بدل کر بیٹھ گئے اور فرمایا" دیکھو بھئی یہ جنگلی جانور، یہ سب ہیلیں وغیرہ، ان میں کوئی ہیضہ طاعون تو پھیلتا نہیں، وہ تو جب تک زندہ رہیں گے جاری کھیتی سے پیٹ بھریں گے۔ خیر صاحب! وہ اور تو سب جانور آپ نے مار کھائے مگر یہ وہ گڑ نہیں جسے چیونٹا کھائے خیر پچھلے زمانہ میں تم سال دو سال پیچھے دس بیس مار بھگاتے تھے مگر صاحب اب تو یہ بلا جیتی زندگی کے ساتھ بھیّا جیتی دنیا کے ساتھ تک ہے اور اس جنگل میں یہ ایک دو نہیں، سو پچاس نہیں ہزاروں ہیں ہزاروں اور بھائی میں نے وہ ترکیب سوچی ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

" ہاں یار چاہے لاٹھی سالی ٹوٹ جائے مگر تم وہ ترکیب بتاؤ کہ سانپ ضرور مر جائے۔ بچھڑے پھانسنے سے ان سے نجات کیسے ممکن ہے، یعنی تم سمجھتے ہو جنگل چھوڑ جائیں گی یہ ڈر کے مارے؟"

"اتنی سیدھی سادی اور موٹی بات نہیں سمجھتے تم یار" سنگھ بابو نے کہا اور پھر ایک مدبرانہ گھونٹ لیا جیسے ملک کی خوراک کے مسئلہ کا واحد حل بیان کرنے والا ہے۔" دیکھو۔ ایک گائے ایک سال میں ایک بچہ پیدا کرتی ہے جبکہ ایک سانڈ ساٹھ سے ستر بچے تک پیدا کر سکتا ہے بس سمجھ لو جب ہم چھانٹ چھانٹ کر بچھڑوں کو ہی پکڑیں گے اور انھیں بھی آختہ کر کے کھیتی میں لگا لیں گے تو ایک وقتِ خاص پہ جا کر نری گائیں ہی گائیں رہ جائیں گی اور بیل بالکل غائب ہو جائیں گے اور جو سانڈ اس وقت موجود ہیں ان میں بھی چار پانچ سال بعد تناسل کی صلاحت نہ رہے گی۔ اور ایک وقت آئے گا کہ یہ نئے بچھڑے ہمارے باڑھے میں پہنچ کر کھیتی کے بہترین بیل بن چکے ہوں گے اور پرانے سانڈ بیکار ہو چکے ہوں گے اور نری ہیلوں ہی کے غول باقی رہ جائیں گے۔"

"اور بس سب ہو گئیں پھریں گی ماری ماری، مگر ہے بہت دور کی کوڑی یار۔"

"دور کی کوڑی ضرور ہے مگر آج کل کی جتنی اسکیمیں ہیں سب اس سے بھی زیادہ دور کی کوڑی ہوتی ہیں۔ اور بنیادی کام تو وقت طلب اور صبر آزما ہوتے ہی ہیں لیکن نتائج یقینی ہوتے ہیں اور دیرپا بشرطیکہ اصول صحیح اور سائنٹیفک ہو۔"

"نہیں بات قاعدہ کی ہے اور کاغذ پر لکھ کر رکھنے کی نہایت عمدہ تجویز ہے جو پیداوار خوراک میں معاون ہے، اس کے علاوہ کہ یہ ہر سال ایک کی دو اور دو کی چار بن کر ہماری روزی میں شریک ہوتی جاتی ہیں۔ یعنی دن دونی رات چوگنی کے حساب سے بڑھ بڑھ کر جو ہماری روزی کو گھٹا رہی ہیں کم سے کم یہ سلسلہ کچھ گھٹے گا اور اس کے علاوہ کہ ان کے مفت خورے بچھڑے ہمارے گھر میں کما کر خود بھی کھائیں گے اور ہم کو بھی کھلائیں گے۔ پیارے سنگھ بابو تمہاری تجویز بڑے زور کی ہے۔ شکاری پوائنٹ آف ویو سے۔ اگر ہمارا پھندا کامیاب پھانستا ہے تو کم سے کم ایک مرتبہ تو بھاگ دوڑ میں وقت اچھا کٹے گا۔"

"اجی وقت اچھا کٹے گا اور یہ نہیں کہتے کہ گھر بھر جائے گا۔ ایک سے ایک چھٹا ہوا بچھڑا — جو بازار لینے جاؤ تو قیمت کے مارے پٹھے پر ہاتھ بھی نہ دھرنے دے۔"

"اونہہ۔ یار سنگھ یہ کیسی باتیں کرتا ہے تو راجپوت ہو کر بنئے بچے کی سی اسپرٹ میں ہوتے ہوئے شکار کی قیمت لگاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر تمہارا پھندا کامیاب بیٹھ [illegible] س شکار کے لطف و انبساط کی بھی کوئی اہمیت ہو سکتی ہے۔ اور اصول وہی ہیں ہمارے پِگ اسٹکنگ والے، اور ہماری گھوڑیاں بھی اس پر ہمیشہ سے خوب لگی ہوئی ہیں۔" میں نے سنجیدہ ہو کر اور اس کے ساتھ شکار میں اشتراک کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی یہ بھی پانچ ہزار سالہ پرانا طریقۂ شکار ہے جب درحقیقت شکار ہی انسان کا ذریعہ معاش تھا۔ جب آدمی نے گھوڑا تسخیر کر کے اس سے سواری لی تھی تو اس کی تیز رفتاری سے وہ جنگلی چرندوں سے دوڑ کی بازی لگاتا تھا اور اپنی ملکیت کے لیے دوسرے چرندوں کو زیر کرتا تھا اور اپنے نیزہ کے پھل کی نوک کے زور پر وہ جنگلی سوڑ اور شیر سے جا بھڑتا تھا اور اس سے کہیں زیادہ لطف اندوز اور کامیاب ہوتا تھا جتنا آج ہم ہائی ولائتی

رائفل پڑ کر کامیابی کے نیتجے میں سرشار ہو کر کھیلتے ہیں :

"ارے یار تم نے تو ساری نوعِ انسانی کی تاریخ بیان کر ڈالی' یہ تو پہلے ہی کہہ چکا کہ تمہاری ترکیب پگ اسٹکنگ جیسی ہے' بھاگتی ہوئی ہیلوں کا پیچھا تو بالکل اسی طور سے کیا جائے گا جس طرح سؤر کا۔ سؤر کے قریب پہنچ کر اوور سائڈ اور پوائنٹ سے کر ترچھا برچھا مارا جاتا ہے اور گھوڑے کو کاشن دے کر غپ سے TOP SHOULDER میں گھسیڑ دیا جاتا ہے جو بالعموم سؤر کے قلب کو چھید دیتا ہے ..... "

"جی بالکل بالکل" سنگر بابو نے میرے منہ سے بات لے کر کہا۔" اور ہیلوں کے غول میں پہنچ کر پہلے بچھڑا اپ ندر کیا جائے گا اور پھر اس پر نہایت چابک دستی سے پھندا پھینکا جائیگا اور یہ تو COMMON SENSE کی چیز ہے۔ اور تم اس پھندے کے پھینکنے والی صلاحیت اور پھیلنے کے بعد اس کی تیز قوت بندش کو سمجھ گئے نا؟ ہوں ہوں بالکل وہی گھوڑے کی حرکت اور طاقت، جو سؤر کے جسم میں برچھا گھونپتی ہے۔ وہی اس کو بھی تناؤ کے ساتھ باندھے گی اور کسے گی :"

"تو آگیا کچھ تمہاری سمجھ میں؟"

"ہاں آتا تو ہے — مگر پھنس جائیں جبھی تو یار!"

"میاں تم نے چھپاڑ کیا ہے، کل تین پھانسے، بڑی اچھی نسل کے بچھڑے ہیں اور تندرستی کی کیا پوچھتے ہو — سب کا سب دودھ پشتوں سے پیتے چلے آرہے ہیں۔ رنگ کے ضرور کالے کھورے ہیں مگر کھیتی میں ایسا کام دیں گے کہ اللہ دے بندہ لے!"

"لیکن وحشت اور تیزی رہے گی تھوڑی بہت :"

"وہ تو رہے گی۔ اور اس میں کیا حرج ہے، بلکہ بہتر ہے مٹھیا بیل تو کسی کام کا نہیں ہوتا اور سواری کے مطلب کا تو ہوتا ہی نہیں، جانور کی تیزی تو اس کا جوہر ہے :"

"خیر یار تو پھر تم نے بسم اللہ کر دی ہے، کل سے ہم بھی شریک ہوں گے۔ مگر یہ رسیاں منگانی پڑیں گی :"

"سب منگالیں ہیں نے، آج میرا آدمی گیا یہ سب سامان لینے اور شام تک سب

کچھ تیار ہو جائے گا مگر اکیلے نہ تو مزہ ہی آیا اور جب تک دونوں جانب سے نہ گھرے کام نہیں بنتا لہٰذا تمہاری کسر تھی بس د ہی کر و اُدھر، چار چھ سال پہلے۔"

"ہوں مگر دیکھو ایک بات پر غور کر لو پگ اسٹکنگ تو ہم نے اور تم نے بہت کیا ہے جوڑ بنا بنا کر ساتھ ساتھ، یاد کرو، اُدھر، چار چھ سال پہلے ـــــ اور اس کے کچھ علیٰحدہ قواعد اور اصول ہیں جو تجربہ کار و ماہر شکاریوں نے مقرر کیے ہیں۔ وہی تمام و کمال قواعد و ضوابط اس پر بھی APPLY کرتے چلو ـــ مگر سنگھ بابو تم نے تو "ہیل" کا شکار شاید دیکھا ہی نہیں ہے اور بھئی میں کر چکا ہوں ـــ یہ امر تو مسلمہ ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق جدھر کو ہم چاہیں گے انھیں میدان میں کھید کر لے جائیں گے۔ اور یہ گھوڑے کی نسبت بہت کم رفتار بھی ہوتی ہیں۔ ایک پوری پٹی بھی نہ ہوگی کہ گھوڑیاں انھیں جالیں گی اور بچھڑا پھنس بھی جائے گا آپ کی ایجاد کردہ کمندمیں، مگر سؤر کی طرح ان کے بھی پلٹ پڑنے کا اندیشہ ہے یاد رکھو۔ اور سؤر تو بہت کم پلٹتا ہے، اور ایک اکیلا پلٹتا ہے اور جس وقت ہیل پلٹتی ہے تو پوری جماعت کے ساتھ پلٹتی ہے جیسے عزرائیل کا پورا گلہ پلٹ پڑا۔ اور پھر اس وقت ان کا انتقامی حملہ! ـــ آدمی تو بیچارہ کس شمار قطار میں ہے شیر کے گوشت کے پرزے اور پوست کی دھجیاں ان کے سینگوں میں لپٹی نظر آتی ہیں۔ اور مشہور بات ہے کہ اکثر نا تجربہ کار نوجوان شیر ہرنوں اور بارہ سنگھوں کے غول کی طرح اپنی جبلت کے مطابق جب چرتی ہوئی گایوں پر جا پڑتا ہے۔ اور دوسرے جنگلی چرندے کی طرح ایک گائے کو دبا لیتا ہے تو گائیں حصار کر کے اور یک دم گول دائرہ بنا کر چاروں طرف سے بڑھتی ہیں، اس میں تو شک نہیں کہ شیر خاں صاحب دو تین گایوں کو اور غیظ و انتقام کے جذبہ میں مار گراتے ہیں مگر اس کے بعد وہاں پر اتنی روئی دُھنی جاتی ہے کہ شیر کی ہڈی پسلی تو درکنار بال کا بھی وجود باقی نہیں رہتا۔ بس انتقام کے وقت تو یہ چھڑی ہوئی بھڑوں کے پورے چھتے کی طرح لپٹتی ہیں۔ اور خیر تم تو ساتھ بھی نہیں رہے، اب سے پانچ سال پیشتر تک ہم بے کھٹکے ان کا شکار کرتے رہے لیکن اصول یہ تھا کہ ہمیشہ شکار میں دو بندوقچی ہوتے چاہئیں، ایک شکار کرے اور دوسرا شکاری کا باڈی گارڈ بن کر اس کی حفاظت کے لیے اس کے دوش بدوش اپنی بندوق بھرے

تیار کھڑا رہے۔ استاد رضا خاں نے اپنا ایک چشم دید واقعہ بیان کیا اور سُنے ہوئے بہت سے ایسے قصّے بتائے کہ ہیلوں کے گلے پر شکاری نے فیر کیا اور ایک ہیل زخمی ہو کر گری اور بقیہ سب بجائے دھماکے سے ڈر کر بھاگنے کے انتقاماً شکاری پر حملہ آور ہو گئیں' بس اسی وقت ان کے حملہ کو روکنے کے لیے احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"دیکھو بھئی یہ پرانی چال کی بات ہے کچھ، پھر تُو ٹوپی دار بندوقوں کے زمانہ والی' اور اب تو میگزین رائفل ہاتھ میں ہوتا ہے اور ایک دو فیر کرنے کے بعد بھی چار پانچ راؤنڈ باقی ہوتے ہیں بالکل تیار شکاری کے اپنے ہاتھ ہیں۔ چیتھڑے اڑا دے گا پہنچتے پہنچتے۔"

"جی مگر میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ہیلوں کا گلہ حملہ آور ہو گا تو بھئی وہ ایک میگزین تو درکنار پوری والی سے بھی ایک مرتبہ کو نہیں رُکے گا۔"

"تو پھر وہ آپ کا استاد رضا خاں والا اصول تو بے کار سا ہوا۔"

"ہوں' بظاہر بے کار سا ہی ہے۔ تاہم' ہم اس احتیاط سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں کہ ایک میگزین سے شکار کھیلیں اور دوسرا میگزین ہاتھ میں حفاظت کے لیے رکھیں۔ اور بھئی ہم نے یہ اصول یہاں کے شکار میں برقرار رکھا ہمیشہ' تم جانتے ہو کہ میں اپنا وہی ۳۰ اسپرنگ فیلڈ چلاتا ہوں۔ دو سو پچاس گرین کی سالڈ بُلٹ سے لے کر ایک سو دس گرین کے شیل تک ہر گولی سے چھوٹی بڑی ہیل اور بُل مار چکا ہوں۔ میری میگزین میں ایک یا دو راؤنڈ چلنے کے بعد' چار پانچ باقی رہتے ہی ہیں اور جو میرا باڈی گارڈ بنتا تھا اس کی تو پوری کی پوری میگزین بھری ہوتی تھی لہٰذا اس حساب سے چھ اس کے' چار پانچ میرے' دس گیارہ راؤنڈ حفاظت کے لیے فیر کرنے کے بعد ہمارے ہاتھوں میں باقی ہوتے تھے۔"

"ہوں! ــــ کبھی کر دیا ہو گا کسی گلے نے حملہ۔ اور بس آنک پھڈرے کا سا نام نکل گیا ورنہ بالعموم چرندے اور چرندے ہی کیا ہاتھی اور شیر بھی آدمی سے بھاگتے ہی ہیں اور فیر کرنے کے بعد تو کبھی دیکھا نہیں کہ حملہ تو درکنار پیچھے مڑ کر بھی دیکھیے یہ بھی حد سے بڑھی ہوئی احتیاط ہے کہ ایک شکاری حفاظت کے لیے دوش بدوش ہو!"

"ہاں! بظاہر تو حد سے بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے مگر یہ تو تم تسلیم کرو گے

کہ ہیلیں شیر پر حملہ کر دیتی ہیں۔ مشہور بات ہے کہ تجربہ کار شیر ان کے گلہ سے ہمیشہ بچ کر نکلتا ہے اور پھر بھئی انسانی جان کی قیمت پر نظر کرتے ہوئے جو احتیاطیں بھی کی جائیں کم ہیں۔ آج کل دنیا کا بڑا حصہ امن امن پکار رہا ہے اور کسی قیمت پر بھی جنگ کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ جاپان پر ایٹم بم پھینکنے کے بعد دوبارہ کوریا میں پھینکنے کی امریکہ کی ہمت نہیں پڑتی کہ ساری دنیا میں امریکہ اپنے اسلحہ سازی کے کارخانوں کی وجہ سے بدنام ہو گیا کہ ان کی بقائے حیات کے لیے ایک مرتبہ کرّہ ارض کو پھر جنگ کا ایندھن بنانا چاہتا ہے اور عوامی جمہوریت کے ممالک بیچارے امن کا نعرہ بھی مارتے ہیں۔ لڑائی کو ہر صورت سے بچانے کے لیے طرح بھی دیتے ہیں اور طرح طرح سے جنگ کے خلاف پروپیگنڈے بھی کرتے ہیں۔ یہ سب کاہے کے لیے، صرف ہر فرد کی زندگی برقرار رکھنے کے لیے، تو بھئی انسانی جان کی بڑی قیمت ہے اور اس کے معیار سے اس کی حفاظت ہوتی ہے۔"

"ارے بھئی تم کہاں جا پڑے امریکہ اور روس کی پالیٹکس میں! ہاں تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ اگر گلّہ مشتعل ہو کر پلٹ پڑے تو کیا بچاؤ ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ گھوڑے سے تعاقب کر کے بچھڑا پھلسنے میں اس کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ میں تو تجربہ کر کے دیکھ چکا۔ وہ تو انھیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ کب اور کس وقت بچھڑا پھنس گیا۔ وہ تو گھوڑے سے بھڑک کر بے تحاشا نوک دُم بھاگی چلی جاتی ہیں اپنے سامنے کو، جیساکہ ہر جنگلی جانور کا طرز ہوتا ہے اور انھیں کوئی سُدھ بُدھ نہیں ہوتی۔ ان کی کھوپڑی پر تو سور سوار ہوتا ہے بھاگتے وقت، اور بھئی میں تو عملی تجربہ کر کے آیا ہوں، دن بھر میں جتنا چاہو پھانس لو شکار! اور بھئی اس جنگل کی پٹی میں میرا ایک پرانا باڑھا پتاجی کے زمانہ کا ویران پڑا ہے، میں نے اس کی مرمت کا حکم دے دیا ہے، ایک منشی رکھیں گے اور پانچ چھ نوکر جو صرف بچھڑوں کی دیکھ بھال پر رہیں گے۔ اگر تم شریک ہو جاؤ تو نصف تنخواہ تمہاری جانب سے اور نصف میری جانب سے اور بھئی، بچھڑے آدھے آدھے کر لو۔"

۳

کئی سال سے ہیلیں آزاد تھیں اور بلا نوکِ خار سے آشنا ہوئے گُل چینیاں کر رہی تھیں اور اب تو اس ہمارے جنگل میں اور سب مٹ گئے تھے، وہی وہ رہ گئی تھیں فصلوں کی SOLE MONARCH بنی۔ سینکڑوں ایسی تھیں جن کے کان بندوق کے دھماکے سے بھی آشنا نہ ہوئے تھے، اور ایک بہاری صبح کو جب آفتاب مشرقی افق میں شہاب پاشیاں اور طلاء کاریاں کرتا ہوا اپنا پیامِ زندگی سُناتا برآمد ہو رہا تھا ہم نے ایک بڑے بھاری گلہ پر اپنی گھوڑیاں ڈالیں۔ تقریباً پانچ سو گز کے فاصلہ سے ہم نے ہیلوں پر چارج کیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو گز تک وہ سب کی سب کھڑی دیکھتی رہیں۔ اور شاندار سانڈ اپنی گردنیں جھٹک جھٹک کر ایک شاہانہ انداز میں غور کرتے رہے کہ آخر یہ گھوڑیوں کو ہمارے اوپر کس غرض سے ریلا جا رہا ہے۔ اور جب ہم سو گز کے اندر پہنچ گئے تو پورے گلے نے بھاگنا شروع کر دیا۔ میدان میں دھول کے غبارے اٹھنے لگے اور ہم نے انھیں ایک ہی سرپٹ میں جا لیا۔ اب ہم ان کے گلے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور میں نے ان کے درمیان پہنچ کر دیکھا دمیں بڑی خوب صورتی سے ہوا میں لہراتی ہوئیں اور لہرا لہرا کر پیٹھ پر لوٹتی ہوئیں اور ہمارے اتنے قریب پہنچنے سے وہ کچھ پھیلیں اور قدرے منتشر سی ہوئیں۔ اور ہم نے غور کیا کہ ہیلوں پر وحشت انتہا سے زیادہ طاری ہے۔ سانڈوں کے فرعونی تیور اختہ بیلوں کے سے جیسے ہو رہے ہیں اور سات سات آٹھ آٹھ من کی لاش اتنی سبک رفتاری سے پھینک کر چل رہی ہے جیسے ہلکا پھلکا ہرن، ٹینس کی گیند کی طرح بچھڑے "ٹپے" کھاتے چلے جا رہے ہیں اور ہم نے بھاگتے ہوئے گلہ کے درمیان اٹھتے ہوئے بگولوں میں اپنی گھوڑیاں ریل دیں۔ اب ہم اور وہ ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ ہمارے دائیں بائیں اور کچھ آگے پیچھے، گردمیں کچھ اندازہ نہ تھا البتہ سنگھ بابو کا مجھ کو اندازہ تھا اور انھیں میرا ایک گھمسان کا عالم تھا، بھاگ دوڑ، گرد، دھمدماہٹ سرسراہٹ سب مل کر ایک عجیب صوتی کیفیت کا احساس ہمارے شعور پر طاری کر رہے تھے اور کچھ دور اسی رستخیز میں دوڑنے کے بعد گرد میں اٹے ہی اٹے میں نے اندازہ کیا کہ سنگھ بابو نے ایک بچھڑے پر پھندا پھینکا اور اک

ذرا کی ذرا گھوڑی کی رفتار دھیمی ہوئی اور جیسے بجلی کے شاک نے بچھڑے کو بھاگتے ہی بھاگتے بیچ دبا اور جب میں نے ایک چھلتی ہوئی نگاہ پلٹ کر ڈالی تو بچھڑا جکڑا ہوا پڑا دیکھا اور سنگھ بابو نے اپنی رفتار بدستور تیز کر لی اور مجھ سے مخاطب ہو کر مخصوص شکاری اصطلاح میں کہا۔ "ڈانٹے چلو! ڈانٹے چلو!!" اور اتنے میں ہلیں ہم سے پچاس ساٹھ گز بڑھ گئی تھیں اور سنگھ بابو نے رکابوں میں زور دے کر ایک اچکتے ہوئے تیز چلنے کی مخصوص اصطلاح میں پھر کہا۔ "دبائے ہوئے! دبائے ہوئے!!" اور ہم دونوں ایک ہی مہمیز میں پھر گلے کے اندر گھس پڑے۔ اور پھر فلک پیما بگولوں کے درمیان دوڑ ہوئی۔ گرد، دائیں بائیں، اوپر نیچے گرد ہی گرد اور گرد ہی میں بے تحاشا بھاگ دوڑ، جیسے گھوڑیوں کے ساتھ ہیلوں اور سانڈوں کی بھی باگیں ہمارے ہاتھ میں آگئیں۔ ہمارے دباؤ کے مطابق وہ دوڑ رہے تھے، اور عین موقع پر پہنچ کر پھر سنگھ بابو نے پھندا پھینکا اور ان کے ساتھ ہی دوسرے ہی لمحے میں نے بھی ایک ریشمی بچھڑے پر، جیسے بھرے فیر کی بندوق کا جھٹکا ایک پُر سرور لپک کندھے اور بازو میں پیدا کرتا ہے، بس وہی لپک پیسے کا بھاری لٹو پھینکتے وقت میرے ہاتھ نے محسوس کی اور ایک عجیب سرور! بندوق کے فیر سے گرنے والے شکار سے بالکل جداگانہ قسم کا۔ اس انتشار سے بالکل مبرّا جو گرنے اور دھما کا ہونے سے پیدا ہوتا ہے، ایک نیا لطف عجیب EXITEMENT اور میرا بچھڑا میرے دائیں جانب اور سنگھ بابو کا ان کے داہنے ہاتھ پر مکڑی کے جالے میں پھنسا پڑا تھا اور ہم نے پھر اک ذرا راسیں تنگ کر کے اور رفتار پر قابو پاتے ہوئے نئے پھندے خورجیوں سے نکالے "بہت اچھے! بہت اچھے!!" بے اختیار ان کے منہ سے نکلا اور پھر شکاری زبان میں کہا "ڈانٹے رہو، ڈانٹے رہو!!" اور ان کی آواز میں فخر کا انداز اور استادانہ شان تھی، جیسے وہ اپنی کامیابی سے زیادہ میری کامیابی پر خوش تھے اور آناً فاناً میں ہم سخت زمین میں پہنچ گئے تھے۔ گرد کے غبار سے پیچھے چھوٹ گئے تھے، بندھے ہوئے بچھڑے پیچھے رہ گئے تھے۔ اور اب ہماری گھوڑیاں صاف میدان میں دوڑ رہی تھیں۔ سورج کی کرنیں عمودی ہو ہو کر پڑ رہی تھیں اور ہم پچھم کی جانب دوڑ رہے تھے اور گایوں ہیلوں کے اور ہماری گھوڑیوں کے سائے

ہمارے آگے آگے لمبے لمبے ہو کر دوڑ رہے تھے۔ اور ہم نے پھر بدستور پہلی مہمیز میں جالیا۔ میرے ہاتھ میں دوسرا پھندا تھا اور سنگھ بابو کے ہاتھ میں تیسرا، اور اب ہم دونوں خوب واضح ہو کر ہیلوں کے گلہ کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے چل رہے تھے، گھوڑیوں کی رفتار پر بھی قابو تھا اور انھیں بھی بعد مدت کے پگ اسٹکنگ کا مزہ آرہا تھا۔ اور ہم دونوں نے پھر دو خوب صورت بچھڑوں پر پھندے پھینکے اور میں نے آواز لگائی۔

"SURE SHOT" -

اور اب کی مرتبہ پھنسے ہوئے بچھڑوں کو جب ہم نے پیچھے چھوڑا تو غور کیا کہ رفتار میں کوئی زیادہ فرق نہ آیا تھا اور سرپٹ دوڑتے ہی دوڑتے ہم نے نئے پھندے نکال لیے۔ اب تک ہم پانچ بچھڑوں کو پیچھے باندھ کر چھوڑ چکے تھے۔ شکار کی کامیابی کا سرور مجھ پر طاری ہو چکا تھا۔ گھوڑیاں خوب کھل چکی تھیں اور رفتار میں طاقت اور استقامت پیدا ہو چکی تھی۔ اور ادھر ہیلیں بھی کچھ پُراطمینان ہو چکی تھیں، کیوں کہ گھنے جنگل کی پٹی کا کنارا سامنے تھا۔ انھیں اپنے بچوں کی گرفتاری کا مطلق علم نہ تھا اور ان کی رفتار کا بے تحاشا پن رفع ہو چکا تھا۔ پناہ گاہ سامنے تھی، اور وحشی چرندے کی جبلت کے مطابق پناہ گاہ دیکھ کر چال میں سُستی نہ سہی اطمینان تو ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ اور کنارے پر پہنچتے پہنچتے ہم نے انھیں پھر دبا لیا اور گھستے گھستے دو بچھڑے اور پھانس لیے۔

۴

اور ہیلیں جنگل میں غائب ہو چکی تھیں۔ اور ہم دونوں اپنی گھوڑیاں قریب لا کر اپنی ناپی ہوئی شکار گاہ کا نقشہ اپنے ذہن میں قائم کر کے اس پر بحث کر رہے تھے۔

"EXCELLENT! ___ دو گھنٹہ اور سات بچھڑے!" میں نے کہا۔ اور گھڑی دیکھی ___

"ابھی وہ تو میدان اچھا نہیں ملا۔ نہیں تو نہ معلوم کتنے پھانستے۔"

"ارے یار اور کتنا میدان چاہتے تھے۔ کیا گھوڑیوں کو مارنے کی فکر تھی۔ دیکھ

رہے ہو سُم پر پسینہ ہے، اور پھر آج پہلا ہی دن تو تھا۔"

"ہاں تو گھوڑیاں بھی تو بندھی ہوئی ہیں مہینوں کی، کس کہاں سے لائیں بے چاریاں، اور ہماری چینی تو آج چالیس دن سے تھان پر پانی پی رہی ہے، پرسوں لگائی تھی ریس پر۔"

"اجی دیکھو کس بل بھی پیدا ہو جائیں گے اور آج تو ہم بھی اس سے زیادہ نہیں چل سکتے تھے۔ مگر مزہ آگیا۔ پورے استاد ہو، مانتا ہوں دوست!"

"ہوں! بولو، اب تم ہی جانو! مذاق اڑاتے تھے، بدانند بتاتے تھے ہمیں، اور یاروں کو تو جو سُوجھے گی ایسی ہی سُوجھے گی، ہم خرما و ہم ثواب!" سنگھ بابو نے سینہ پھلا کر کہا۔

"اس سے بہت اچھے رہے اس پگ اسٹکنگ سے!"

"خیر یہ ایک علیحدہ چیز ہے، اس سے اور اُس سے کیا مناسبت، لاحول ولا قوۃ۔"

"بھئی ہمیں تو اس میں زندگی کے شکاروں کا یکجائی لُطف آگیا آج ہی یک دم۔"

"اجی ابھی کیا لُطف آیا ہے، چودھری صاحب بچھڑے دیکھو گے تو مزہ آجائے گا کھیتی کرنے کا۔ ایسے ایسے بیل بیٹھیں گے کہ ایک مرتبہ کو تھان سج جائے گا۔ اور پھر کہو گے کہ ایسی کہتا ہے ٹھاکر بچہ ہو کر بنجاروں جیسی، لیکن جو ایک ایک بچھڑا پان پان سو سے کم کا ہو۔ آج بھی چاہیں کہیں پونچھ پکڑ بٹھا دو نخاسہ میں لے جا کر اور ہم باتیں کرتے اپنے راستہ پر پلٹ رہے تھے اور ہمارے بچھڑے بدستور جکڑے پڑے تھے اور دور میدان میں ہمارے ملازم سب سے پہلے والے بچھڑے کو بدستور اسی طرح جکڑا ہوا اٹھا کر چھکڑے پر لاد رہے تھے۔ گھوڑیوں میں عجیب جوش و خروش تھا اور میری گھوڑی تو پگ اسٹکنگ سے کہیں زیادہ محظوظ ہو رہی تھی کیوں کہ برچھا لگ کر سوٗر کے مرنے کے بعد میری گھوڑی اکثر خون کی بو سے پریشان ہو کر مکدّر ہو جایا کرتی تھی اور کبھی کبھی جب اس کے دماغ کو خون کی بو زیادہ چڑھ جایا کرتی تھی تو خشمناک ہو کر سب کچھ اُلٹ کر پھینک جانے پر تل جایا کرتی اور رالف ہو ہو کر گریز و فرار کی کوشش کیا کرتی تھی۔ اور یہ بغیر "دریدو بریدو شکست" کے صرف "بہ بست" والا شکار عجیب پُر لطف غضب کا مسحور کن تھا۔ پگ اسٹکنگ میں گھوڑی کی رفتار کے ساتھ سوٗر کی رفتار کو ریگولیٹ کر کے اور برچھا

سوٗر کے شانے پر ٹیک کر گھوڑی کو کاشن دینا پڑتا ہے اور کبھی کبھی ڈھائی ڈھائی تین تین من وزن کا سوٗر برچھے کی نوک پر اچھل اس طرح آگے جا گرتا ہے جیسے شٹل کارک، مگر یہ پھندا پھینک کر بچھڑا پھانسنے والا شکار بھی کتنا EXITING تھا، کتنا دل چسپ اور کتنا عجیب اور در حقیقت جب میں نے اس شکار کو شکاری والی نگاہ سے ہٹ کر BUSINESS POINT سے دیکھا تو نہایت پر منافع! در حقیقت یہ بھی پرانا شکار تھا جب آدمی کا تمدن شکار ہی شکار تھا اور جب وہ جنگلی سوٗر کی چٹان سے لے کر وحشی بھینسے کے پہاڑ تک سے جا ٹکراتا تھا اور جب وہ شکاری سے گلہ بان والے ترقی یافتہ دور میں پہنچا تو اس نے گلے پکڑ کر جمع کرنے کے لیے گھوڑے اور پھندے سے کام لیا اور ہم اور سنگھ بابو اس وقت کچھ اسی ابتدائے آفرینش والے ماورا ما التاریخی دور سے گذر رہے تھے اور آج ہمارے اس ارتقائی دور کا پہلا کامیاب دن تھا گویا۔

۵

اور اسی طرح جنگل میں کمند بازیاں کرتے ہوئے ہم کو ایک مہینہ ہوگیا۔ کھُروں اور ٹاپوں سے گرد اڑ اڑ کر آسمان سے ٹکراتی رہی، بگولے سنسناتے رہے اور ہم دونوں سال سال ڈیڑھ ڈیڑھ سال کے بچھڑے چھانٹتے رہے، جو دودھ چھوڑ چکے ہوتے ہیں اور چرائی پر لگ چکے ہوتے ہیں۔ اور پرانے باڑھے میں آبادی بڑھتی رہی۔ جو بچھڑا پکڑا جاتا وہ اڑتالیس گھنٹے تک قید میں اچھلتا کودتا، پھر ساتھیوں میں مل کر "قفس کو آشیاں" سمجھنے لگتا اور راہِ راست پر آ کر چارہ کھانے لگتا۔ باڑھا اپنی جگہ پر ایک جنگل کے ٹکڑے سے کم نہ تھا۔ تقریباً میل بھر لمبی اور اتنی ہی چوڑی جنگل کی آراضی پر بلند چہار دیواری کھنچی ہوئی تھی جس کے اندر گھنے اور بلند درخت ایستادہ تھے۔ دو جانب آہنی پھاٹک لگے ہوئے تھے اور ان درختوں کے نیچے جگہ جگہ کھپریل کے شیڈ بنے ہوئے تھے اور ایک جانب کی دیوار سے دو منزلی بارکیں بنی ہوئی تھیں جس میں نیچے کی منزل کی کوٹھریوں میں بچھڑوں کا چارہ اور دانہ وغیرہ ذخیرہ کیا جاتا تھا اور اوپر کی کوٹھریاں محافظوں کے رہنے کے لیے تھیں۔ غرض اب تو یہ پورا جیل خانہ تھا۔ کچھ (جیوونائل جیل)
JUVENILE JAIL کے قسم کی چیز، جہاں پر بچھڑوں کی اصلاح کی جاتی تھی جو جنگل

میں برص کی وبا کی طرح پھیلے ہوئے تھے اور صحیح معنوں میں بھگوان کی دولت تھے اور یہ تو جنگل میں آزاد و بے لگام تھے اور آبادیوں میں بھی یہ تو کسی کی ذاتی ملکیت نہیں سمجھے جاتے بڑے بڑے شہروں میں ان کا ایک ایک رونگٹا وقف ہے جس کی حفاظت ولایتی سنگینوں کے زیرِ سایہ ہوتی ہے اور پھانسی کا پھندا جن کی زندگی کا ضامن ہے اور گائے بیل کا پلّہ انصاف کی ترازو میں آدمی کے پلّہ سے کہیں بھاری رہتا ہے۔

اور وہ پھاگن کی ایک نم ناک خوشبودار صبح تھی جب گیہوں کے خوشوں میں دودھ دہی کے مدارج طے ہو کر نشاستہ کی قلب ماہیت تکمیل پاتی ہے اور ہری ہری بالیوں میں آہستہ آہستہ دھوپ کا سونا دوڑنے لگتا ہے۔ اور کرنیں بھینی بھینی حیات آفریں خوشبو چھوڑ کر بہار کی آمد کا پیغام عام کرنے لگتی ہیں اور برجِ حمل کے آفتاب کی زندگی آمیز و حیات پرور گرمی آدمیوں میں وہ قوت اچھال دیتی ہیں جس کا ناپ گھوڑے کی طاقت سے ہوا کرتا ہے اور ہم نے اپنا مشغلہ جاری کیا جو اب نیم معاشی و نصف شکار قسم کا بن کر رہ گیا تھا۔ یہ ہمارے شکار کا چالیسواں روز تھا اور اس سے پچھلے انتالیس روز کتنے بھرے، کیسے یقینی اور کس قدر پُر ہنگامہ قسم کے دل چسپ گذرے تھے۔ دوپہر تک ہم نے دو کمندیں پھینکیں اور اب تو ہیلیں بھی ہوشیار ہو چکی تھیں اور کم از کم انھیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہ دونوں سر پھرے گھوڑ سوار ہمارے پیچھے اس وقت تک دوڑتے ہی رہتے ہیں جس وقت تک کہ وہ جنگل کے گھنے درختوں اور جھاڑیوں میں پناہ نہ لے لیں۔ لہٰذا وہ پہلی ہی دوڑ پر کسی نہ کسی جنگل کے گھنے حصّہ کی جانب رُخ کر لیتیں اور ہم دونوں بمشکل انھیں گھیر گھیر کر روکے رہتے اور بچھڑوں پر پھندے پھینکتے رہتے۔ تاہم ہماری کامیابی کا جو ریکارڈ شروع میں رہا تھا وہ اب نہ تھا۔ دوپہر کے قریب جب ہیلیں بالکل ہی جنگل میں گھس چکی تھیں، ایک پیچھے رہ جانے والے بچھڑے پر سنگھ بابو نے تیسرا پھندا ڈالا۔ دیکھنے میں تو بچھڑا سال ڈیڑھ سال کے بچھڑے سے کسی طرح کم نہ تھا۔

"ہے تو خوب تگڑا مگر ابھی دودھ نہیں چھوٹا ہے، زیادہ سے زیادہ پانچ چھ مہینہ کا ہو گا" میں نے اسے رسی میں پھڑکتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"ہوں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈیڑھ سال کا ہے لیکن یہ تو ابھی چارہ بھی پکڑنا نہیں جانتا۔"
سنگھ بابو نے کہا۔ "ہوں اسی کا تنک کا بیانت ہے۔"

"ہاں ۔ لیکن، ہوں ۔ تو ۔ آں ۔ یہ پلے گا کیسے واں باڑھے ہیں اوروں کے ساتھ بہت چھوٹا ہے یہ تو۔"

"ہوں ـــــ دودھ کا انتظام کرنا پڑے گا پوری ایک گائے کا۔" سنگھ بابو نے کہا۔

"آں ۔ ہاں خیر ۔ تو اب دودھ کا انتظام کرتے پھروگے ایک اکیلے بچھڑے کے لیے ہیں!" میں نے کہا۔

"تو اس میں کیا بات ہے بیل نہیں بنے گا ہزار میں ایک ـــ دیکھتے نہیں ہو ہاتھ پاؤں ابھی سے اور رنگ ڈھنگ اور ابھی کیا چھٹے مہینے دیکھنا سب بچھڑوں میں الگ چھٹ جائے گا الگ۔" سنگھ بابو نے کہا۔

"نہیں میں نے یوں کہا کہ ابھی تک شیر خوار بچھڑے پھانسے نہیں تھے اور یہ تو اتفاق سے پھنس گیا دھوکے ہیں۔ اب اگر چاہو تو اسے رہنے دو لیکن شیر خواری کا دھندا شروع کرنا پڑے گا۔ کیسے دودھ پیے گا۔ کون پلائے گا۔ ویسے یہ ہے کہ جائے گا کہاں۔ آج نہیں تو کل چھٹے مہینے پھنس ہی جائے گا۔ ابھی تو نرا رینٹ ہے۔ ڈھیلا ڈھالا۔ چھ مہینے بعد ڈیڑھ ڈیڑھ سال والوں سے دوگنا بیٹھے گا۔ جا کر بس چھ مہینے اور پی لے ماں کا دودھ!"

اور سنگھ بابو نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر کہا ـــ "یعنی کیا کہتے ہو یار! تمہارا مطلب یہ ہے کہ اسے پکڑا پکڑا یا چھوڑ دیں بھلا ایسی UNSPORTS MAN LIKE بات اور تم جیسے پرانے کھلاڑی کے منہ سے!"

"نہیں جی وہ میں نے ویسے ہی کہا تھا کہ جائے گا کہاں، اور پکڑ لیا ہے تو اب کچھ چھوڑا ابھی نہیں جائے گا خیر، تھوڑا دردِ سر معلوم ہوتا ہے۔ پہلے کپڑے کی بتی سے دودھ پر لگایا جائے گا اور پھر ہفتہ عشرہ میں ایسے ہی بالٹی سامنے کر دی جائے گی اور غٹا غٹ پی جایا

کرے گا میں جانتا ہوں سرکاری فارموں میں گایوں کے بچے ایسے ہی پلتے ہیں اور کبھی ماں کی شکل بھی دیکھنی نصیب نہیں ہوتی اور ماں کو بچوں کی، مگر ابھی ماں کے دودھ پر جو جیتے نہ پلتے تو کہنے ہی کیا تھے۔"

"نہیں جو ہم پالیں گے یہ اتنے درجنوں آدمی کیا کرتے ہیں، یہ دیکھ بھال رکھیں گے۔ دو چار جیتنے کیا ایک تئے کا پورا دودھ نہیں پلا سکتے۔ ہم ایسے اچھے اٹھان کے بچھڑے کو۔"

"ہوں وہ کوئی بات نہیں ذرا منشی اور گوالوں کو خاص ہدایت دینی پڑے گی اور پل جائے گا!"

اور میں اور سنگھ بابو ایک چوراہے پر علیحدہ ہو گئے، وہ اپنے بنگلہ چلے گئے میں اپنے بنگلہ کی جانب مڑ گیا۔ میں نے کپڑے اتار کر غسل کیا اور ابھی کھانا کھانے بیٹھا ہی تھا کہ یک دم باہر باڑھے کا ایک گوالا بڑے زور سے صحن میں چلاتا سنائی دیا۔

"سرکار باڑھے پر ہیلوں نے ہلّہ بول دیا۔"

اور میں نے جلدی جلدی چند لقمے اتارے اور بغیر بستر پر ایک لوٹ لگائے سیدھا سگریٹ سلگاتا نکلا۔ گھوڑی تیار تھی۔ میں نے فارم کے چک پار کر کے جنگل میں سیدھا باڑھے کا رُخ کیا۔ چند گوالے بے تحاشا بدحواس بھاگتے نظر آئے اور انھوں نے کہا۔

"سرکار سارے جنگل سے ہیلوں کے گلّے کے گلّے چلے آ رہے ہیں اور پورے باڑھے کا گھیرا کر لیا ہے۔ آپ ادھر سے نہ جائیں، اُدھر ہو کر جائیں گاؤں کے قریب۔ ندی کے کنارے کنارے چکر کاٹ کر!"

اور دوسرے گوالے نے جو ذرا سن رسیدہ تھا کہا۔ "اور پھر سرکار وہاں جا کر بھی کیا کریں گے۔ وہ تو کوؤں کی طرح جمع ہو رہی ہیں اور وہ سرکار ایک بچھڑے نے۔ بس ایک بچھڑے نے ڈکرا ڈکرا کر سب جمع کر لیں۔"

اور میں نے راس موڑ دی، اور میل بھر چلنے کے بعد معلوم ہوا کہ گاؤں سے میل بھر پچھم کی طرف جو ٹیلا ہے اس کی آڑ آڑ سنگھ بابو پہنچ گئے ہیں اور اس ٹیلے پر بیٹھے ہوئے

ہیں۔ اور یہ ٹیلا باڑھے سے نصف میل کے اندر ہے بلکہ ایسے ہی ایک ٹیلے کے لگاؤ پر یہ باڑھا بھی بنا ہوا ہے، اور جنگل میں ایسے ٹیلے جگہ جگہ موجود ہیں۔ میں ہیلوں کی یورش بچاتا بستی میں ہوتا چکر کھا کر اسی راستہ پر جس پر ہو کر سنگھ بابو پہنچے تھے، چھپا چرا ٹیلے پر پہنچ گیا۔ سنگھ بابو پہلے سے تقریباً تیس چالیس آدمیوں کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ آج ان کے ایک ملازم کے ہاتھ میں پگ اسٹکنگ کا برچھا تھا۔ دوسرا آدمی ان کا ۴۰۴ بور ویسلی رچرڈ ہائی ولاسٹی میگزین رائفل پکڑے ہوئے تھا۔ باڑھا انھیں کا تھا اور پھر چڑھائی بھی انھیں کے ممالکِ محروسہ پر تھی۔ اگرچہ باڑے میں سراپا مشترک تھا اور جب میں نے اس کے بشرے پر غور کیا تو بہت ہی سنجیدہ پایا۔ الامان والحفیظ! آج سنگھ بابو کے تیور قرونِ وسطیٰ کے روایاتی راجپوت جیسے ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھیں سحر و اعجاز کا اسکرین تھیں، چہرہ عقیدت و انتقام، بہادری و مجبوری کا مثبت منفی مرقع تھا۔ مجھے دیکھتے ہی جیسے اس کے اندر مدوجزر پیدا ہو گیا۔ جیسے وہ میرا ہی منتظر تھا۔

"خیر تو ہے؟" میں نے کہا۔

"جی خیر کہاں، دیکھ نہیں رہے ہو یہ چڑھائی!" جیسے سامنتی دور کا کوئی راجپوت جذبات کو روکے ہوئے دشمن کی زیادتی اور چیرہ دستی کی شکایت مدد کو آنے والے دوست سے کرتا ہو۔ "مجال نہیں جو پرندہ پَر مار جائے باڑھے کی جانب، پورا باڑھا حصار میں لے لیا ہے اور ابھی آمد بند نہیں ہے، برابر تانتا لگا ہوا ہے!"

"یار بس وہی بات! ہم تو پہلے ہی کہتے رہے تھے کہ چھوڑ بھی دو سالے کو، وہ ذرا سا بچھڑا۔" میں نے کہا۔

اور سنگھ بابو نے کہا۔ "لیکن بھئی کیا معلوم تھا کہ یہ پریشانی سامنے آئے گی اور وہ ہیل بُو لے کر پہنچ جائے گی۔"

"لیکن۔ یار یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ گائے اپنے شیر خوار بچے سے کتنی محبت کرتی ہے۔"

"مگر یہ کون جانتا تھا کہ یہ کم بخت بُو لے کر سراغ لگا لے گی اور یہ سب کو جمع کر لے گی یہاں پر!"

اور میں نے دور بین لگا کر جائزہ لیا تو ہزاروں ہی چاروں طرف سے حصار کیے ہوئے تھیں اور سلسلہ آمد جاری تھا۔ میں نے دور بین لگائے لگائے کہا۔

" یار سنگھ بابو واقعی گوا ریر پڑ گئی ہے۔ غضب ہو گیا تھا دوست! معلوم ہوتا ہے کہ جنگل میں ایک بھی باقی نہیں رہ گئی ہے۔"

" اور ہاں یار ستم بالائے ستم یہ ہے کہ دو گوالے اور ایک منشی، ہمارے تین آدمی اندر مکان میں اوپر والی بارک میں پھنسے ہوئے ہیں۔" سنگھ بابو نے کہا۔

" ارے خوب!" میں نے کہا۔ " یعنی آدمی گھر گئے ہیں اندر۔ پھر!؟"

اور یہ کہہ کر میں نے ذرا آگے بڑھ کر دوسرے زاویہ سے جائزہ لیا۔ گائے بھری ٹرنی ہو رہی تھی، بوٹی بوٹی پھڑکتی ہوئی، غصہ کے مارے آنکھوں سے خون سا برستا ہوا، سخت اضطراب اور بے چینی! بس جیسے دیواریں تو دیواریں باڑھے کی زمین اُلٹ دینے پر تلی ہوئی ہیں۔ بپھر بپھر کر دشمن کو تلاش کر رہی ہیں۔ بڑے بڑے دیو قامت شاندار سانڈ بیل کمانڈروں کی طرح سنجیدگی سے پوسٹ لیے ہوئے، گائیں باہر سے محبت بھری آوازیں نکالتیں " توکاں آں" اور اندر سے بچھڑا جواب دیتا " ماں آں" اور باہر سے بچھڑوں کی آواز پر ہر گائے اس طرح اُچھل کر جا پڑتی جیسے بس یہی خاص اس کا بچہ تھا۔ اور پھر جب اک ذرا سکوت ہوتا تو پھر سارا مجمع ڈکرانے لگتا۔ دیو پیکر سانڈ بیل غصہ میں آواز نکالتے " ہوم ہوم!" اور پھر کوئی گائے چلا پڑتی " توکاں آں!" اور اندر سے کئی جواب ملتے " ماں آں"۔ پھر مدوجزر کی کیفیت پیدا ہو جاتی اور گایوں کی کالی کیسری ندی میں طوفان کی سی لہریں اٹھتیں اور بچھڑوں کی آوازیں بجلی کی رو کی طرح دوڑ جاتیں۔ ہر گائے جھنجھنا اُٹھتی، ہر سانڈ غصہ میں جھوم جاتا اور جیسے یہ جنگل، یہ طبقہ یہ سارا نظام اُلٹ کر پھینک دیں گے۔

" اللہ اکبر! — سنگھ بابو!! — سارے جنگل کی ہیلیں صورتِ جلال مرنے مارنے پر تلی ہوئی ہیں۔ دیکھتے ہو غیظ کی کیفیت! دُھن کر ہی پھینک دیں جو ہوا بھی مل جائے انھیں کسی آدمی کی اس وقت' اور سوال و جواب کیسے ہو رہے ہیں' اندر سے باہر' باہر سے اندر، اتحادِ جنسی اور حفاظتِ خود اختیاری کے بہترین جذبہ اور قوت کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ دیوانی ہو ہو کر

ایک ایک !!"

اور میں نے غور کیا کہ سنگھ بابو بہت زیادہ جذبات سے مغلوب ہو رہا تھا۔ جیسے میرا یہ جملہ اس پر تازیانہ سا ہو کر پڑا۔ وہ کیسا ہی تعلیم یافتہ سہی، کتنا ہی سوسائٹی اٹینڈ کیے ہوئے سہی، پھر بھی نجیب الطرفین راجپوت خون تھا۔ اور دیہاتی راجپوت بچہ، علمِ جہالت، 'لٹھ کرامت' پر بڑی جلدی آجاتا ہے اور READY JUSTICE کے فلسفہ قانون پر فوراً اتر آتا ہے۔ اب تک تو میں اس تمام سین اور مہم کو ایک غیر اہم نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ البتہ معلوم کر کے کہ ہمارے تین آدمی اندر محصور ہیں، مجھے یک گونہ اہمیت محسوس ہوئی تھی مگر جب میں نے غور کیا کہ جوں جوں وقت گذرتا جارہا ہے سنگھ بابو کا غیظ بڑھتا جارہا ہے اور سہ پہر کے بعد تو میں نے غور کیا کہ جتنا غصّہ تمام ہیلوں اور سانڈوں میں ہے بالکل اتنا ہی مجموعی طور پر سنگھ بابو کے سینے میں ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اس کی سنجیدگی تلخی اور تلخی سمیت میں تبدیل ہوگئی۔ اس نے بار بار اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مونچھوں کو چبانا شروع کر دیا۔

اور دیکھتے دیکھتے شام ہونے لگی۔ دیواروں پر پیلی پیلی دھوپ درختوں کے سائے لمبے لمبے پھینکنے لگی۔ اور باڑھے کے درختوں پر بسیرا لینے والے پرندے آج اپنی پناہ گاہ کی جانب بھی نہ پھٹکے۔ جیسے زمین سے لے کر آسمان تک آج انھیں کی حکومت تھی۔ اور میں نے کہا۔

"بھئی سنگھ بابو! کچھ سوچو بھئی۔ یہاں اس طرح کھڑے رہنے سے تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا اور یوں تو پرندہ کوئی پر نہیں مار سکتا ادھر!"

"بھئی میری تو عقل حیران ہے تم ہی سوچو۔ دیکھو صورتِ حال یہ ہے کہ دونوں پھاٹک باہر سے مقفّل ہیں اور اندر وہ تین بدنصیب گھرے ہوئے ہیں۔ پچھیت کے دروازے بھی رُکے ہوئے ہیں ان کے کوارٹروں کے اور وہ بھی تو چاروں طرف دیکھ ہی رہے ہوں گے اندر سے کہ نکاس ناممکن ہے!"

"ہوں بفرضِ اگر ہم ان کے بچھڑوں کو آزاد کر کے ان کو محاصرے سے ہٹانا بھی چاہیں تو یہ بھی ہمارے امکان میں نہیں آخر پھاٹکوں کے قفل کیسے کھلیں، پچھیت کے کوارٹروں والے دروازوں سے ہمارے تینوں آدمی نہیں نکل سکتے!"

"اماں یار کیسی باتیں کرتے ہو تم — وہاں پہنچنا کارے دارد۔ بلّی کے گلے میں گھنٹی کون سا دلاور چوہا باندھے گا! کوئی چلے جاؤ موت ہے، اب تو ان کو یہیں سے منتشر کر کے بھگانے کا سوال ہے۔"

"بھئی ہماری تو عقل حیران ہے۔ اچھا چلو بنگلے چلیں، چلو تمہاری جانب چلیں ذرا چائے پئیں، پھر کچھ سوچیں سہی۔"

"نہیں، میں نہیں جاؤں گا۔ میں یہیں رہوں گا، دیکھوں یہ کب تک گھیرا ڈالے رہتی ہیں۔" سنگھ بابو نے قدرے ضد کے انداز میں کہا۔

"تو یہاں بیٹھے کیا کرو گے؟" میں نے کہا۔

"نہ، نہیں —، میں — میں یہیں بیٹھا رہوں گا —" انھوں نے پھر اسی انداز میں مجھے جواب دیا۔

"لیکن اماں۔ مگر بھئی وہ تم مجھے یہ تو بتاؤ کہ یہاں بیٹھے رہنے سے فائدہ! ؟ آخر کچھ سوچ، سر جوڑ کر مشورہ کریں۔ گاؤں والوں سے بھی اس مسئلہ پر بات چیت کریں۔ آخر یہ تین آدمیوں کا بھی تو مسئلہ اہم ہے۔"

اور ہمارے ملازمین اور دوسرے گاؤں والے بول پڑے۔

"چاروں طرف سے گھیرا ہے۔ کوئی مدد ممکن نہیں، ڈھول تاشوں سے یہ میدان چھوڑنے والی نہیں — دھجیاں اڑا دیں گی جو کوئی آدمی ہتھے چڑھ گیا ان کے۔"

۶

اور آدھا دن گذر کر شام گزری۔ شام کا سورج غروب ہوا اور رات کا چاند نکلا۔ درختوں سے چاندنی چھن چھن کر ہیلیوں کے گلہ کو اور بھی زیادہ کیسری بنانے لگی۔ جیسے ان کا سارا ماحول اور بھی زیادہ برص کے داغوں سے چمک اٹھا۔ شام کی چائے سے گئے اور رات کے کھانے کا وقت آگیا۔ اور میں بہت دیر سے بنگلہ چلنے کی تجویز پیش کر رہا تھا۔ لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا ان کا غصہ بڑھتا گیا۔

"کیوں آخر کیا مطلب ہے؟" میں نے ان کے جذبات کا اندازہ کر کے کہا۔

" مطلب کیا ہوتا میری توہین ہے اور بہت بڑی توہین کہ یہ اس طرح میرے باڑھے پر حملہ کریں اور میں دیکھتا رہوں۔" اس نے بدستور مونچھ چباتے ہوئے کہا۔

" تو پھر! اور توہین کیا ہوئی اس میں —" میں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

" توہین نہیں تو پھر کیا ہے — چودھری صاحب میں نے بھی عمر بھر شکار کھیلا ہے اور آپ نے بھی، ذرا غور کیجیے ان جنگلی چرندوں کی ہمت پر، اور پھر ستم بالائے ستم ہمارے تین آدمی پھانس لیے ہیں۔" سنگھ بابو نے اس طرح کہا جیسے کسی برابر والے سردار نے ان پر فوج کشی کر دی ہے۔

"یہی تو میں کہتا تھا سنگھ بابو — اس میں غصہ یا جذبات سے کام لینے کا موقع نہیں ہے پھر کہتا ہوں، اس کا حل سوچو — مسئلہ بہت نازک ہے، اور یہاں جھاڑیوں میں بیٹھے بیٹھے حل نہیں ہو گا جناب!"

" دیکھو بھائی، یہاں سے ہٹانے پر تم کیوں مصر ہو —— قضیۂ زمین برسرِ زمین، یہاں سے کل SITUATION سامنے ہے اور یہاں بیٹھ کر ہم بہترین مشورہ کر سکتے ہیں!"

" اچھا چاء لگاؤ" میں نے کہا اور چاء آگئی تھی، لگ گئی۔ ہم دونوں نے دو دو پیالی چاء پی اور سنگھ بابو نے کہا —

"مشورہ کیا اب جو کچھ ہے سامنے ہے — یہ اس وقت تک ہٹنے والی نہیں جب تک کہ ان کا ایک ایک بچھڑا انھیں نہ مل جائے۔ اس میں شک نہیں کہ جمع اسی چھوٹے بچھڑے کے پیچھے ہوئی ہیں مگر بھائی کیا ایک اسپورٹس مین کی غیرت اسے گوارا کر سکتی ہے کہ بیلوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنا شکار چھوڑ بیٹھے؟"

میں نے کہا " لیکن بفرضِ محال تم تیار بھی ہو جاؤ اس پر تو چھوڑنے کی عملی شکل کون سی ہو سکتی ہے —— پھاٹک دونوں باہر سے مقفل ہیں وہ تینوں البتہ اندر سے اپنے کوارٹروں کو کھول کر چھپت کے دروازے سے باہر نکل سکتے ہیں مگر خواہ کوئی اندر سے نکلے خواہ باہر سے

جائے منہ پھاڑے موت کھڑی ہے۔ ڈھول تاشے سے یہ بھڑکتی نہیں۔ سب کچھ بجوا چھوڑے۔"

"اور یہاں پر تو ان کے کانوں میں کوئی آواز نہیں جا رہی ہے بجز۔ اپنے بچوں کی آوازوں کے!"

"مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ کب تک نہیں ہٹتی ہیں۔" میں نے کہا۔

اور ایک تجربہ کار گوالے نے کہا۔

"سرکار ایک ایک نہیں پر مر جائے گی، بھوکی پیاسی۔ ہٹنا کیسا اب یہ گئوئیں ہیں گئوئیں، اور سب کی سب جمع ہیں۔"

"اور اندر وہ سب بچے، بھوکے پیاسے۔" سنگھ بابو نے کہا۔

"جی صاحب بچھڑے، بچھڑے!! چھوڑیئے۔ وہ ہمارے تین بدنصیب۔ یہ تو گرم دودھ ہو گئیں، اُگلنے کی نہ نگلنے کی!"

اور میرے جملہ کے آخری الفاظ پر سنگھ بابو اچھل سا پڑا —— "نہیں! کیا یہاں بیلوں اور سانڈوں کی حکومت ہے؟ جو بچھڑوں کے پیچھے آدمی چوہے کی طرح پھنس پھنس کر مریں!" اور اس نے ایک گہری سانس لی۔ سینہ پورے تناؤ تک پھیلا، اور بار بار مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ اور ترچھا ہو کر بیلوں کے حصار کو دیکھا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"TWO CRACKS AND THEY DISPERSE"

"اور میں نے اچھل کر کہا۔" سنگھ بابو کہاں سے بولے؟"

"بالکل وہیں سے جہاں سے بولنا چاہیے —— اور تم دیکھو گے بالکل یہی کروں گا۔"

"لیکن تم جانتے ہو یہ آج کل کے قانون میں CAPITAL OFFENCE میں آتا ہے۔"

"وہ آتا ہو گا ان کسانوں اور زمینداروں کے لیے جو چار مرتبہ دودھ پینے کے عوض عمر بھر مفت کھلانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ تم ہی بتاؤ اگر اتنے آدمی تمہارا گھر گھیر لیتے تو تم ان پر گولی نہ چلاتے!"

"لیکن آدمیوں کی اور بات ہے، اور SELF DFFENCE کا حق تم کو

آدمیوں کے مقابلہ میں پیدا ہوتا ہے، اور یہ تو قانون میں بھی دیوی دیوتا لکھی ہوئی ہیں۔
اور پھر قانون چھوڑو اس کے سماجی پس منظر پر غور کرو" میں نے سنگھ بابو کا غصہ ٹھنڈا
کرنے کی غرض سے کہا۔ کیوں کہ میں اس کی بے باک طبیعت اور غصہ کے وقت اس کی
ناعاقبت اندیشی سے خوب واقف تھا۔ میں جانتا تھا کہ ذرا سی شہ پاتے پر وہ حق و ناحق پر
فیصلہ کرنے کو تل جائے گا اور اپنا بڑا میگزین رائفل تڑتڑانے لگے گا۔ اس میں شک نہیں
کہ میدان تو ذرا دیر میں صاف کر دے گا مگر پھر اس کو جو سماجی اور قانونی پنجہ پکڑے گا
تو اس میں اس گیہوں کے ساتھ میں غریب گھن بھی پس جاؤں گا۔ اور میرے لوک نشتر قسم
کے جملے پر جیسے وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ اس کے اندر جو بہادر اسپورٹس مین، پُر تقدس کرشن
بھگت بیٹھے ہوئے تھے ان میں کشتی ہونے لگی۔ اور میں نے اس کی داخلی کیفیت کا اندازہ
کرکے برجستہ کہا " چہ چہ چہ سنگھ بابو، راجپوت ہو کر ایسی باتیں کرتے ہو، بچھڑے مریں یا منشی گوالے
ہم کیوں مریں؟ "

" بس راجپوت مریں نہ بچھڑے مریں نہ منشی گوالے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ بھائی بجز اس
کے کہ میں اپنا بڑا میگزین چلاؤں اور ان میں دس پانچ ہر طرف لوٹ پوٹ ہوں، اور کوئی شکل
گلو خلاصی کی نہیں۔"

اور گلو خلاصی نہیں مجھے اپنی گلو بندی نظر آ رہی تھی۔ یہ معاملہ ماں بیٹے کے درمیان
تھا۔ چاہے بندوق چلتی چاہے جوتے تیر بہتی، لیکن اس خانہ جنگی میں مجھے اپنی موت معلوم
ہو رہی تھی۔ میں شروع سے سنگھ بابو کا شریک کار رہا تھا۔ یہ باڑھا میرے اور ان کے ساجھے کے
شکار سے بھرا ہوا تھا اور ہیلوں کا یہ حملہ مجھ پر اور ان پر مشترک تھا اور وہ شکست تو درکنار
گابیوں سے راضی نامہ پر بھی تیار نہ تھے۔ اور میں تو پانچ سال سے ہتھیار ڈالے اور شکست
کھائے ہوئے تھا۔ لیکن آج شکست تسلیم کرنے کی بھی عملی صورت نہ تھی۔ فاش سے فاش شکست
ہم یہ کھا سکتے تھے کہ بچھڑوں کو آزاد کر دیں مگر طریقہ آزادی عقلِ انسانی سے باہر تھا۔ پھاٹک کا
قفل کھولنا بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنا اور باندھ کر پھر کھول لانا تھا۔ تمام رات میرا دماغ بنگو
کی طرح ناچتا رہا۔ میں ہٹ کر یوں نہیں جا سکتا تھا کہ مبادا شیر بپھر بیٹھے تو ہاتھ پکڑنے کی ہمت ان

ملازمین اور حاضرین ہیں تو کسی کی ہے نہیں۔ ساتھ یہ چلتے نہیں۔ اگر کہیں غصہ میں ایک میگزین بھی جھاڑ دی تو میری موجودگی ہی یہاں پر مجھے مجرم ثابت کر دینے کے لیے کافی ہے۔ خیریوں ہی رہنے دو اور جالیٹو اپنے اپنے بنگلوں ہیں' یہ ہیلیں تو چربی کے تودے اور گوشت کے پہاڑ ہیں۔ تھوڑی بہت گھل لیں گی ابھی شروع شروع میں ماستا کے زور میں بھوکی پیاسی کھڑی رہیں۔ آخران کے اندر بچھڑے ہیں' ان کا بھی چارہ پانی تھوڑا بہت چار چھ روز کی خوراک کے قابل گودام میں ہے' وہ منشی اور گوالا کھلاتے رہیں گے مگر وہ تینوں خود تو اندر بھوکے پیاسے مر رہیں گے۔ غریب چکنم میں گرفتار تھا۔ اور ایمانی بات تو یہ ہے کہ بجز سنگھ بابو والی ترکیب کے انھیں ہٹانے کی کوئی ترکیب بھی نہ تھی کہ تڑاتڑ پیہم دو تین والیاں ماری جائیں اور سب سے بڑے قانونی' سیاسی' سماجی اور معاشی جُرم کا ارتکاب کیا جائے اور قانونی' سیاسی' سماجی اور معاشی احتساب کے پھندے کے لیے اپنی گردن پیش کی جائے۔

تمام رات ہم دونوں اپنے حالی موالی سمیت اس ٹیلے پر بیٹھے رہے اور سنگھ بابو کا خانساماں ہر گھنٹہ بھر چار پیش کرتا رہا۔ شکار کے قواعد وضوابط کے خلاف تھا کہ میں سنگھ بابو کو چھوڑ کر چلا جاتا اور صبح ہونے تک میں نے تین بار سنگھ بابو کا رائفل پکڑا اور سنگھ بابو نے غصہ میں آ آ کر تین مرتبہ اٹھایا۔

"بیس گھنٹے! — اور یہ پھاگن چیت کا موسم! بغیر ایک بوند پانی کے!! " میں نے کہا اور صبح صادق کے وقت بہاریں ہوا کا ایک جھونکا میرے دل و دماغ کو تازہ کرتا نکلا چلا گیا اور جیسے میرے دماغ ہیں ان ماں بیٹوں کے درمیان بیچ بچاؤ کی ترکیب بجلی کی طرح کوند گئی اور میں نے ایک معتمد دیہاتی کو بلا کر اس کے کان میں کہہ دیا۔ اور وہ روانہ ہو گیا۔

۷

اور صبح سے دوپہر ہو گئی۔ اکھڑ راجپوت کو میں نے اس دوران میں تقریباً ہر گھنٹہ میں ایک مرتبہ رائفل سیدھا کرنے سے بمشکل باز رکھا۔ رات یوں ہی گزر گئی تھی' ہم دونوں نے کچھ نہ کھایا تھا اور صبح سے ایک مرتبہ چاء اور ہلکے ناشتہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ سنگھ بابو سگریٹ پر سگریٹ جلا رہا تھا۔ اور ایک دو کش لے کر پھینک دیتا اور بوٹ سے کچل کر دوسرا سُلگاتا۔ اس پر غصہ طاری تھا اور مجھ پر خوف! اور بارہ بجے کے قریب ہمارے ٹیلے کے نیچے دو جیپ کاریں اور دو پک اپ آ کر ٹھہریں۔ مجسٹریٹ ضلع اور سپرنٹنڈنٹ پولیس پورے

بارہ دربن آرم گارڈ کے جوانوں کے ساتھ پہنچ چکے تھے اور ہم ان کا استقبال کر رہے تھے۔ اور ان کے پہنچنے کے ساتھ ہی ساتھ گھوڑ سوار پولیس کا ایک دستہ آپہنچا۔

مجسٹریٹ ضلع نے آتے ہی سنگھ بابو کا بیان قلمبند کیا اور تمام صورتِ حال کا معائنہ کیا۔ اور پھر کہا۔ "لیکن آپ کہتے ہیں کہ آپ پانچ چھ مہینے سے برابر ان بچھڑوں کو پکڑ پکڑ کر اس باڑھے میں بند کر رہے ہیں!"

"جی!" سنگھ بابو نے کہا۔ "شکار! اور شکار سے زیادہ فصلوں کے بچاؤ کی غرض سے اور ساتھ ہی ساتھ انھیں پال کر اور بیل بنا کر کھیتی کے کام میں لگانے کی اسکیم کے پیشِ نظر! اور اس صورت سے زیادہ اور اچھی فصل پیدا کرنا وغیرہ" جیسے GROW MORE FOOD SCHEME کا سارا مفروضہ دو ہی لفظوں میں بیان کر دیا۔

"لیکن آپ کو معلوم ہے کہ گاؤکشی CAPITAL OFFENCE ہے۔"

"لیکن اس چیز سے اور گاؤکشی سے مطلب!؟ اور ابھی تو میں نے حفاظتِ خود اختیاری کا فطری اور قانونی حق بھی استعمال نہیں کیا ہے۔ دو دن ایک رات انھیں اسی طرح بیت گیا میرا گھر گھیرے ہوئے اور حملہ برابر جاری ہے آپ کے سامنے بھی!"

"اچھا! RIGHT OF SELF DEFENCE کا ذکر کر رہے ہیں آپ! مگر وہ تو آپ کو آدمی کے مقابلہ میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اور یہ تو گائیں ہیں۔ بالکل معصوم، جیسے ناسمجھ بچہ یا مخبوط الحواس آدمی سے آپ اپنا بچاؤ مدافعت کے ذریعہ نہیں کر سکتے بلکہ فرار ہو کر کر سکتے ہیں، اسی طرح ان کے مقابلہ میں بھی آپ FORCE استعمال نہیں کر سکتے!"

"مگر یہ تو کوئی JURIS PRUDANCE نہیں۔"

"مگر بیلوں کا یہی JURIS PRUDENCE ہے اور بیل گایوں اور آدمیوں میں جب مقابلہ ہو گا تو بیلوں کا جیورس پروڈنس چلے گا!"

"لیکن قانون تو بیلوں نے نہیں بنایا ہے، کیا آدمیوں نے بیلوں کے لیے قانون بنایا ہے؟"

"اب چاہیے آپ یہ سمجھیں کہ بیلوں نے آدمیوں کے لیے قانون بنایا ہے یا آدمیوں

نے بیلوں کے حق میں قانون بنایا ہے مگر ایسے موقع پر قانون بیلوں کی مدد کرتا ہے اور آپ پر جُرم عائد کیا جاتا ہے۔"

"کون سا جُرم؟"

اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے کہا۔" CALF NAPPING بچھڑوں کے اغوا کرنے کا جُرم۔"

" KID NAPPING کہیئے!" سنگھ بابو نے کہا۔

"جی یہ اصطلاح تو آدمی کے بچہ کے اغوا کرنے کے جُرم میں استعمال ہوتی ہے اور یہ جُرم نسبتاً ہلکا ہے۔ کیوں کہ بکری کے بچے کا ذبح کرنا جُرم نہیں ہے مگر CALF NAPPING تو بہت سنگین جُرم ہے، اس لیے کہ گائے کے بچے کا ذبح کرنا بھی تو جُرم ہے۔ یہ تو آدمی کے بچے کے اغوا سے بہت زیادہ شدید جُرم ہوا۔ کیوں کہ آدمی کے بچے کے اغوا کے لیے KID NAPPING جیسی TERM استعمال ہوتی ہے۔"

" اور میمنے ہزاروں لاکھوں روزانہ ذبح کیے جاتے ہیں لہٰذا آدمی کے بچے کا اغوا کرنا بکری کے بچے سے کچھ زیادہ جُرم نہیں ہے۔"

"ہوں تو آپ اس جُرم کے مرتکب ہیں کہ آپ نے بچھڑوں کو بالجبر اغوا کیا اور پھر حبس بے جا میں رکھا۔ لہٰذا آپ UNDER ARREST ہیں۔" سپرنٹنڈنٹ پولیس نے کہا اور ایک سب انسپکٹر نے اتنا سُنتے ہی ہتھکڑی بڑھائی، اور سنگھ بابو آنِ واحد میں بچھڑوں کو پھانستے پھانستے خود پھنسے کھڑے تھے۔

سب مجمع خاموش تھا۔ ہیلوں اور بیلوں کا انصاف ہو رہا تھا اور سنگھ بابو کو ہتھکڑیاں پہنا چکے تھے۔ کسی کی ہمت آواز نکالنے کی نہ تھی۔ مگر گایوں میں بدستور انتشار تھا۔ میں سٹپٹا رہا تھا اور میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"تو پھر ان کی ضمانت لے لیجیے!"

" ضمانت تو سیشن جج ہی میں ہو گی۔ اور آپ پر تو صرف اعانتِ مجرمانہ کا الزام ہے آپ البتہ اپنی ضمانت پیش کر سکتے ہیں اگر سپرنٹنڈنٹ صاحب چاہیں تو!"

میں بہت گھبرایا۔۔۔ ع

اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی

اچھی اسکیم لائے۔تھے سنگھ بابو بنا کر، اور میں نے لڑکھڑاتی زبان میں کہا۔

"لیکن دیکھیئے تو وہ۔آ۔اد۔ادں اور مَ مَ میں نے تو بر وقت پولیس اسٹیشن میں اطلاع دے کر یہاں پر کشت و خون بچالیا اور اگر آپ میری ضمانت لینا چاہتے ہیں تو اور تو کوئی نہیں یہاں پر یہ سب مزدور کسان ہیں، البتہ باڑھے کا منشی ہے جو وہاں محصور ہے باڑھے کے کوارٹروں میں، پہلے اس کی جان بچائیے اور پھر میرا ضمانت نامہ یہاں تو وہی بھر سکتا ہے، دو دن کا بھوکا پیاسا ہے، دو آدمیوں سمیت!"

"ارے صاحب! اور اس سے پہلے ہم اتنے بچھڑوں کو آزاد کریں گے۔ ہم نے تو چوکیدار سے کل نقشہ معلوم کر لیا تھا پہلے ہی اور ہم تو سب انتظام کر کے لائے ہیں اور جب پھاٹک کھلیں گے تو وہ بھی نکل ہی آئیں گے۔اور یہ باہر، یہ اتنی گئوئیں بھوک ہڑتال کیے پڑی ہیں اور اندر وہ بچھڑے قید میں بھوکے پیاسے ہوں گے۔وہ تو ایک منشی اور دو گوالے تین آدمی ہی ہیں"

اور مجسٹریٹ ضلع نے پولیس کے جوانوں کو اشارہ کیا اور انھوں نے گھوڑوں پر سوار ہو کر بیلوں اور سانڈوں پر چاروں طرف سے گھوڑے ربد ربد کر TEAR GASS پھینکی۔گایوں نے گھوڑوں کو دیکھ کر یوں بھی کان کھڑے کیے تھے اور ایک نہ دو یہ اتنے بہت سے، اور وہ تو جانتی تھیں کہ دو گھوڑوں نے تو یہ غضب ڈھایا، یہ اتنے بہت سے نہ معلوم کیا حشر بپا کر دیں گے۔کچھ مدافعت کے لیے تیار ہوئیں، سوار ایک محفوظ فاصلے سے اپنی جان بچاتے ہوئے نہایت فن کارانہ انداز میں TEAR GASS پھینکتے رہے۔سواروں کا پلٹ پلٹ کر حملہ کرنا۔گایوں اور سانڈوں کا اچھلنا کودنا اور مدافعت کی کوشش کرنا اور بار بار TEAR GASS سے منتشر ہونا۔ایک رستخیز کا عالم پیش کر رہا تھا۔اور نمونۂ قیامت تھا۔ گھمسان میں بے باک سوار گھس گھس کر پھاٹکوں تک قفل کھولنے کی کوشش میں پہنچنے کا اقدام کر رہے تھے اور انھوں نے گیس پاشی کا دباؤ دونوں پھاٹکوں پر بڑھا دیا۔اوپر درختوں کی

چوٹیوں سے بڑا بھاری گرد کا غبار اٹھا جیسے آندھی آگئی، سورج ماند پڑ گیا، ہزاروں آوازوں کی ایک عجیب گڑگڑاہٹ جیسی صوتی کیفیت تسلسل کے ساتھ کانوں میں آرہی تھی۔ اور سوار دباؤ بڑھاتے بڑھاتے ایک مرتبہ کو سر ہتھیلی پر رکھ کر کنجیاں لیے پھاٹکوں پر پہنچ گئے۔ زمین قلابازی کھا گئی، آسمان الٹ گیا ۔ الٹ گیا اور اُلٹ کر دودھ بھرا پیالہ تن کر سیدھا ہو گیا۔ دنیا بیلوں کی ہو گئی، جنگل ہیلوں کا ہو گیا۔ اندر سے جیسے دونوں جانب بچھڑوں کی نہر کا پھاٹک کھُل گیا اور نہریں ماتا ممتا کی ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر سے مل گئیں اور ہزاروں گائیں جنگل کو مراجعت کر رہی تھیں ـــــ باڑھے کے اندر خاموشی تھی، باڑھے سے باہر پر امن مراجعت! جنگل تمدن تھا اور تمدن جنگل! اور اک آن کی آن میں مطلع صاف تھا۔ باڑھا ویران اور ماحول بالکل خالی! اور جب مکمل سناٹا ہو گیا تو تینوں بدنصیب آدمی افتاں و خیزاں ڈرتے ڈرتے پچھلے دروازے سے نکل کر ہماری جانب آئے۔ جہاں اس ٹیلے کے اوپر میزانِ انصاف لگی ہوئی تھی جس کے نیچے مٹی میں راجہ بیر بکرماجیت کا تخت دفن تھا ـــــ اور آتے ہی بغیر پانی کا ایک قطرہ بھی پئے ہوئے ہتھکڑیاں پیش ہوئیں۔ انھوں نے اپنے مقتدر آقا بندھے دیکھے اور خود ہاتھ بڑھا دیئے، حیرت و استعجاب کے پتلے بنے ہوئے اور انھیں اس درجہ بدحواس دیکھ کر مجسٹریٹ ضلع نے آہستہ سے کچھ کہتے ہوئے اس سب انسپکٹر کو روکا اور کہا۔

"تم لوگوں کو دس منٹ کی مہلت دی جاتی ہے۔ تم تینوں UNDER ARREST ہو۔" اور پھر ہم دونوں سے مخاطب ہو کر کہا "اور آپ کی وہ، وہ گھوڑیاں، وہ گھوڑیاں بھی۔ وہ بھی ساتھ جائیں گی، جن سے تعاقب کر کے آپ نے ان بچھڑوں کو پکڑا تھا۔ اور وہ پیراشوٹ کی رسیاں وغیرہ، جو کچھ اور EXHIBITS ہوں وہ بھی حوالے کیجیے!"

"مگر کیوں نہ ہم خانہ تلاشی لے لیں" سپرنٹنڈنٹ پولیس نے کہا۔

"لیکن اگر ملزم اقبالِ جرم کرتا ہے تو پھر کیوں تلاشی میں وقت ضائع کریں؟"

"اور آپ کی ضمانت بھی وہیں ہو گی کوتوالی جا کر"ـــ اور یہ کہہ کر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ایک سب انسپکٹر کو اشارہ کیا اور میں نے بھی ہتھکڑی پہن لی۔

"اچھا ـــ تو پھر آپ کو کچھ اور ہدائتیں دینی ہوں تو پھر" مجسٹریٹ ضلع نے ہم سے

مخاطب ہو کر کہا۔

"ہدایتیں — ہدایتوں کے لیے یہاں کون ہے؟" سنگھ بالو بڑبڑایا۔ "دونوں کو تو آپ نے باندھ لیا۔"

"اچھا تو پھر چلیے۔" انھوں نے کہا اور بچھڑے قیدِ رسن سے آزاد ہو کر ماؤں کے ساتھ کلیلیں کرتے جنگل کو سدھار رہے تھے اور ہم دونوں ہتھکڑیاں پہنے باگ ڈوروں میں کسے لال پگڑی والوں کے حلقہ میں بیٹھے جیپ کار پر شہر کی جانب اڑے چلے جا رہے تھے۔ شام ہو چلی تھی، جیپ پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ درختوں کے لمبے لمبے سائے، جیپ کے پہیوں کی گردش کے ساتھ نچے سے بن کر ناچ رہے تھے۔ اور درخت جیپ کی رفتار کے ساتھ دوڑ رہے تھے۔ پورا جنگل جلو میں چل رہا تھا، جیسے آج ساری نمو جیپ کی رفتار سے بازی لگا رہی ہے اور جیپ کے ساتھ ساتھ شہر میں گھسی چلی جائے گی . . . .

۱۹۵۲ء

چھلانگ

درّاب نگر، لوچن پور، کیلی فقیر آباد، اعظم گنج چودھری کے پانچوں گاؤں ہم سوانہ اور قریب قریب آباد تھے، سب کے سب ایک دائرہ نما صورت میں، درّاب نگر گویا پرکار کا مرکز اور لوچن پور، کیلی فقیر آباد دائرہ کا خط۔ درّاب نگر چودھری کا ہیڈ کوارٹر تھا، جہاں قدیم آبائی ڈیرہ تھا، سواری، ساز وسامان، نوکر چاکر تھے، اور جونری بھونرا تھے، جونری "تین ہزاری" تھی اور بھونرا "چار ہزار"۔ اور چودھری کے پرکھوں نے اپنے وقت کی پیداوار کے دانہ دانہ کا حساب لگا کر یہ سات ہزار من اناج کے کھتی کھتّے کے برتن درّاب نگر کی آبادی کے ایک کنارے پر کھدوائے ہوں گے۔ جہاں پر سب گاؤں کے کھلیانوں کا راستہ آکر ملتا تھا۔ چودھری کے وقت میں آکر پیداوار زمین تو گھٹی مگر جونری بھونرا کے ذرائع آمدنی بڑھے، اور جب پانچوں گاؤں کی جونری بھونرا کے پیٹوں میں سمائی نہ رہی تو چودھری بچارہ کو ڈیرہ کے اندر نجاریاں تعمیر کرانی پڑیں۔ چونکہ پانچوں گاؤں دستور دیہی شد آمد قدیم کے آئین کی روسے "بٹائی نصفی" کے ضمن میں درج چلے آرہے تھے۔ لہٰذا علاقہ بھر میں کہیں پر خواہ کسی پہلو سے چودھری کا نام آتا تو کہنے اور سننے والے کے شعور میں خواہ چودھری کی شکل تو نہ پھرتی مگر غلّہ ضرور رہتا اور جتنی دیر ذکر چلتا غلّہ کے بڑے بڑے انبار اور وسیع وعمیق جونرا بھونرا اور بلند و شاندار نجاریاں ضرور تصوّر میں رہتیں۔ جیسے دُور دُور تک چودھری اور غلّہ اور غلّہ اور چودھرا یک ہی چیز کے دو نام تھے۔

اور چودھری نہایت دیانت دار آدمی تھا، اور پھر اس کی رعایا کیوں نہ ایمان دار ہوتی

نیت ثابت منزل آسان، وہ باپ کی طرح اپنی رعایا کو پالتا، اور اس کی رعایا کماؤ پوت کی طرح اس کا گھر بھرتی، اور اس کے یہاں سود، بیاج، بٹہ، لابھ تو ہمیشہ سے سور سمجھتے آئے تھے، اور صرف نرخ کے سہارے پر چودہری اپنا ہزاروں من غلہ اللہ توکلی بکھیر دیتا، اور پھر اللہ میاں کا بھی اس پر خاص کرم تھا۔ اور طاقتوں کے ساتھ اپنی مخصوص قوت یعنی بھاؤ کا تعین کرنے کے دیہی راز سے بھی چودہری ہی کی زبان کو سرفراز کیا تھا۔ اور اساڑھ سے لے کر جیٹھ تک ان پانچوں گاؤں کے اندر تو نرخ چودہری کا مونہہ بولا چلتا، البتہ چودہری کے دادا جب کربلاء معلیٰ اور نجف اشرف وغیرہ مقدس مقامات کا حج کر کے پلٹے تھے اور خاص متبرک "حج کی بٹیا" ساتھ لائے تھے، اس وقت سے مونہہ بولے بھاؤ کے ساتھ یہ گویا بغیر ہی بولے شریک ہو گئی تھی، اور "حج کی بٹیا" کو ہر کاشت کار لیتے دیتے وقت ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر ڈنڈوت کرتا اور پھر عقیدت کے ساتھ لیتے وقت غلہ والے پلّے میں اور دیتے وقت باٹوں والے پلّے میں اپنے ہاتھ سے چڑھا دیتا۔ اور اس طرح یہ مقدس حج کی بٹیا بیساکھ، اساڑھ، کنوار کاتک ڈنڈی کے تلے وقت وقت پر دونوں پلّوں میں ذقندیں لگا لگا کر چڑھتی اترتی رہتی، وصول کرتے وقت چودہری کے پلّے میں اور دیتے وقت بھی چودہری کے پلّے میں، اور پھر سال تمام پر جب چودہری جونری بھونرا کے غلہ کے فروخت کے بعد ان کے اصلی وزن اور وزن مندرجہ کاغذ کا ملان کرتا تو کسی سال جونری بھونرا "پینتالیس سیرے" اور کبھی "پچاسیرے" "بڑھوترا"[1] ہو جاتے، اور پانچوں گاؤں اور پندرھوں نوکروں میں تو اتنی کسی کی مجال نہ تھی کہ کبھی بھولے سے بھی دل کے اندر حج کی بٹیا کے وزن کو کوتنے کا خیال بھی لا سکے۔ اور یہ چیز چودہری اور اللہ میاں ہی کے درمیان چلی آرہی تھی اور چودہری کو اپنے باپ سے وقت نرخ کے راز میں پہنچی تھی۔ اور انہیں اپنے باپ کی توریث میں جو حج سے خاص راز نہ مطلق سے معلوم کر کے لائے تھے، اور اس بڑھوترا کو چودہری تو چپکے سے حج کی بٹیا کا وزن وضع کر کے اور نہ معلوم کن کن برکتوں کا طفیل سمجھتا تھا مگر سب نوکر ادھالی موالی غلہ کی فروخت کے وقت وزن کشی ہونے پر اس کو "بھگوان بھرے کو بھرتے ہیں" "چودہری کی نیت کا پھل ہے" بتاتے اور سمجھتے اور

---

[1] "بڑھوترا" کھیتوں اور نجاریوں پر غلے کا بھرے ہی بھرے INCREAMENT۔

جگ کی بٹیا۔ کے معجزہ کے ساتھ ساتھ نہ معلوم اور کتنی کرامتوں کے ذریعہ خدائے رزاق چودھری کو ہر پانچ سال بعد "دہ در دنیا" دیتے رہتے اور "ہفتاد در عاقبت اس کے نامہ اعمال میں لکھتے رہتے، اور کیوں نہ کرتے، چودھری بڑا نمازی، متقی پرہیزگار تھا، اور جب پنج وقتہ نماز کے بعد دعا رفروئی رزق پڑھ کر گڑگڑاتے ہوئے نیم وا آنکھیں کیے ہاتھ اوپر اٹھا دیتا تو شاید اسے اپنی آنکھوں دکھائی دے جاتا کہ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ حضرت میکائیل علیہ السلام کے بازوؤں سے جا ملتے ہیں۔ اور پھر چودھری دعا ختم کرتے ہوئے تین مرتبہ حصار کھینچتا، نورانی چہرے اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتا، مصلے سے اُتر کر انگلیوں پر وظیفہ پڑھتا رہتا اور ظہر، عصر کے درمیان مسلسل تسبیح کا دانہ چلتا ہی رہتا اب یہ دوسری بات ہے کہ چودھری کے ہونٹ پھسل کر کسی کسی وقت جونری بھونرا کے چنے، گیہوں میں ادھر دھاں سے بہی کھاتہ، لین دین کے ہندسوں میں سرک جاتے، اور وہ وظیفہ پڑھتے ہی پڑھتے محاسبے اور استفسار کرتا رہتا، اور احکامات دیتا رہتا، جو کرام الکاتبین وظیفہ کے ہی حساب میں تسبیح کے دانوں کی حرکت کے ساتھ شمار کرتے رہتے، اور فجر کی نماز کے بعد نور ظہور کے وقت جب گناہوں کی معافی مانگ کر روتی ہوئی سی لے میں درد کے ساتھ مناجات مقبول کا ورد کرتا تو شجر و حجر پہ رقت کا عالم طاری ہو جاتا۔ زمین کے اندر بیج کا دانہ دانہ پھڑک اٹھتا، جونری کا ہر چنا سائیکل کے پہیہ کی گولیوں کی طرح گھومنے لگتا۔ بھونرا کے گیہوں گیہوں میں جان سی پڑ کر انگڑائیاں سی لہرانے لگتیں، اور تمام دن چودھری کے چہرہ پر نور ہی نور برستا رہتا، اور گھر میں برکت ہی برکت کا ظہور رہتا۔

"بٹائی نصفی" کے دستور میں آراضی کی پیداوار کا نصف تو زمیندار کے حصہ میں بطور لگان کے جاتا اور بقیہ نصف پیداوار کاشت کار کی ہوتی ہے۔ اور کاشت کی محنت اور کل لاگت کاشت کار کے ذمہ ہوتی ہے، اور زمیندار اپنی ملکیت کے محصول کے عوض تیار پیداوار میں نصف کا حق دار ہوتا ہے۔ اور چودھری کا کل ڈھیر میں سے پہلے اپنا دھرم کا آدھا باٹوں کے ساتھ جگ کی بٹیا چڑھا کر تلواتا پھر کاشت کے بقیہ نصف میں سے چودھری کا قرضہ ادا ہوتا جو بیج اور "کھات"[1] کی شکل

---

[1] "کھات" جو قرضہ کی شکل میں زمیندار ساہوکار کسانوں کو اگلی فصل کی ادائیگی کے وعدہ پر دیتے ہیں۔

میں کاشت کار تیاری فصل کے دوران میں لیتا رہتا۔ اور یہ سب قضیے خریف و ربیع کھلیان میں طے ہوتے اور کاشت کار کھلیان سے لے کر کھیتوں تک پہنچانے کا ذمہ دار ہوتا اور خاص طور پر ربیع کی تیاری کے وقت کام زیادہ ہوتا کیونکہ پانچوں گاؤں کی خاص پیداوار ربیع کی اجناس تھیں، لہٰذا اس کے لیے پھاگن اترتے ہی چودھری کو اپنا بھنگیوں کا اسٹاف بڑھانا پڑتا، ویسے علاوہ اور نوکروں کے چار بھنگی "بلہاری" چوکیداری پر بارہوں مہینے چلتے، اور فصلوں کی تیاری سے وصولیٔ غلّہ تک مجال کیا جو پرندہ پر مار جائے۔ درجن بھر بل ڈاگ سے بھنگی کھیت کھیت کھلیان کھلیان غراتے پھرتے، اور کھڑے کھیت بھرے کھلیان کسی کسان کی مجال نہ تھی جو "مٹھے دو مٹھے" ہولے یا دو چار، پھنکے چینے کے لگالے، اور بالی بھینٹا چمکتے ہی جیسے دانہ دانہ میں مہر ہوجاتی۔ پہلے تو "آدھیت" چودھری ہوتا اور بقیہ آدھے پر چودھری کے قرضہ کا بار ہوتا، اور چودھری کا نیا قرضہ جیٹھ کے دسہرے کی پہلی بھرن پڑتے ہی شروع ہوجاتا اور آدھے بیساکھ سے آدھے جیٹھ تک ایک مہینہ گاؤں میں اناج گھوروں گلیاروں بٹا بٹا پھرتا ہے، کھیت کھیت سِلا[1] اڑتا ہے۔ ایک ایک بیل منوں گیہوں، چنا گوبر میں مسلّم نکال دیتا ہے اور یہ تین چار اٹھوارے گاؤں والے کچھ تو کھیتوں میں سے مرغیوں کی طرح گرا پڑا دانہ بین بین کر اور کچھ بیلوں کے گوبر میں سے نیاریوں کی طرح دھو دھو کر کھاتے ہیں اور یہ مہینہ کسان تمام سال کے تھکے ہارے بیلوں کی پرخوری اور بدہضمی کے طفیل اور کچھ نئی نئی اکھڑی موسم گرما کی تندہوا کی خیر خیرات بغیر قرضہ لیے پیٹ بھرتے رہتے ہیں اور ان پانچوں گاؤں میں تو برسات کی پہلی بارش پر چودھری ان کی خیالی فصلیں اور پیداوار کھلانا شروع کر دیتا اور وہ سال میں گیارہ مہینے چودھری کی نجاریوں سے اور ایک مہینہ بیلوں کے فضلہ اور کھیتوں کے کوڑہ سے سوروں اور مرغیوں کی طرح پیٹ بھر لیتے۔

اور چودھری کو پانچوں کے چولہوں کی فہرست اس نظام کے ساتھ علم سینہ میں ہاتھ آئی

---

[1] "سِلا" وہ بالیاں اور دانے جو فصل کاٹتے وقت ہوا اور دھوپ سے ٹوٹ کر کھیت میں گر جاتے ہیں۔

تھی اور "فوتی پیدائش" کے ساتھ فہرست تو ترمیم تنسیخ ہوتی چلتی مگر نظام تو اٹل تھا اور کھلا حساب تھا، نہ ایک سال میں کھیت دو سال کی پیداوار دے سکتے تھے اور نہ کسان پچھلا کھایا ادا کر کے اگلے سال ادھار کھانے سے بچ سکتے تھے اور بھوک تو پیچھے پیچھے بھاگتی اور سال بچارہ تو صبح سے شام اور شام سے صبح کی رفتار اپنی گردش وقت پر ہی پورا کر پاتا اور وہ سال پکڑنے سے پہلے بھوک کے ہاتھوں صبح شام کی گردش میں پورا سال پیشگی کھا بیٹھتے اور چودھری کے باپ دادا کھیت کھیت کی مٹی پرکھ کر اور چپہ چپہ کی قوت پیداوار کے ساتھ ہر گاؤں والے کے پیٹ کا ناپ بھی چودھری کو علم سینہ میں دے گئے تھے اور مجال کیا کوئی چالاک سے چالاک خوشامدی کسان تیس دن کھانے سے زیادہ کھات کے نام سے ایک دانہ تو زیادہ لے جائے۔ اور کسی کے کھیت کی پیداوار سے کھات تخم وغیرہ ایک دانہ زیادہ ہو تو جائے اور وہ تو کچھ ایسا ماشینی قسم کا نپا تلا رہتا کہ جیسے سچ مچ چودھری کا میکائیل سے ساز باز ہے۔ کیونکہ پھر پیداوار بھی تو ایک دانہ نہ بڑھ سکتی تھی۔ چولہے چولہے کے چھوٹے بڑے کھانے والے، فرداً فرداً روٹیوں کی گنتی، خاندان خاندان کا مزاج اشتہا چودھری کو ایسا معلوم تھا، پکا کر کھلانے والی ماؤں اور جوروؤں کو نہ معلوم تھا۔ وہ تو مویشیوں سے ایک سال کی کل پیداوار دانہ دانہ سمیٹتے۔ اسی طرح اس سال اگلے سال کی کھلاتا چلا آرہا تھا۔ جس وقت وہ سنہ فصلی سال کے اس سرے پر ہوتے تو چودھری اختتام پر ہوتا۔ اور یہاں تک کہ اس دوڑ کی عادی ہو کر پانچوں گاؤں کی مردم شماری اس لین دین کو نظام قدرت اور اس قرض کو شیر مادر سا سمجھنے لگی تھی اور اگلا کھا کر پچھلا بٹنا ان کے شعور میں عین اپنا کھانا سا بن گیا تھا۔ اور قرض کی تعریف میں نہ رہا تھا۔ اور اساڑھ کی پہلی بارش پر ان کے کھیتوں میں قوت نامیہ حرکت میں آتی اور پہلی تحریک پر ہی وہ اس کی پیداوار کھانا شروع کر دیتے اور اساڑھ، ساون، بھادوں، کنوار کاتک، اگھن پوس ماہ پھاگن، چیت، بیساکھ ہر مہینہ پیشگی لے لے کر پیٹ بھرتے رہتے اور فصل کے فصل پیداوار قیمت ہو کر سیاہ ہو جاتی اور ہر مہینہ قرضہ بھاؤ کے مطابق بہی کھاتہ میں پڑتا رہتا۔

ویسے سُنتے ہیں کہ چودھری کے باپ تک تو جوزی بھونرا سے ہی کھات تقسیم ہوتی رہی مگر زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ چودھری نے اس کو کچھ شیڈولڈ قسم کی ترمیم تنسیخ دے دی

تھی۔ اپنے باپ دادا کی طرح وہ جونری بھونرا میں غلّہ اندھا دھند نہ جھونک دیتا۔ بلکہ ڈالنے سے پیشتر چھنوا پھٹوا کر دانہ دانہ صاف کراتا اور فصل بھر صبح سے شام تک گیہوں، چنے کی گاڑیاں کھلیانوں سے بھر بھر کر آتی رہتیں اور جونرا بھونرا کے میدان میں بیگار میں پکڑی ہوئی عورتوں اور بچوں کے غول چھانتے پھٹکتے صاف کرتے رہتے۔ چنے میں سے کسا، اور مٹرا در گیہوں میں سے جو چھانٹ کر علیحدہ کیا جاتا اور جو چنے اور گیہوں کی حیثیت کو گرا کر قیمت کم کر دیتے ہیں اور ہر فصل کھیت کے اندر سے خود رو ہو کر شامل ہوتے رہتے ہیں اور چودھری جونری میں صاف کیا ہوا چنا اور بھونرا میں پھٹا ہوا گیہوں بھرواتا اور چھٹے ہوئے کسے، مٹر، جَو وغیرہ کے ست نجے کو ملا کر ڈیرہ والی نجاریوں میں بھر لیتا اور یہ مکسچر پانچوں گاؤں کو جیٹھ کے دسہرے سے کاتک کی دیوتھ تک کھلاتا، ادھر کاتک میں یہ نجاریاں ست نجے سے خالی ہو جاتیں۔ ادھر اس کی جگہ موٹا دھان، جوار، باجرہ، لوبیہ، موٹھ وغیرہ خریف کے اناج لے لیتے اور چودھری خریف کی فصل کے اجناس اعلیٰ ماش، مونگ، تل اور باسمتی وغیرہ دوسری نجاریوں میں جو ان کے لیے مخصوص تھیں سال بھر کے لیے آسودہ کر دیتا۔ اور انہیں حرکت میں لا کر اپنی پانچوں گاؤں کی رعایا کو پالتا بھی رہتا۔ اور ان کی مقناطیسی قوتوں سے جونری بھونرا میں پڑنے والا چنا، گیہوں کھینچتا رہتا اور مہینہ کے مہینہ ماضی حال اور مستقبل کے بھاؤں پر شاطرانہ نگاہیں ڈال ڈال کر اپنا بھاؤ نکالتا رہتا اور ربیع و خریف کے ست نجے اور بجھڑ[1] کی قیمت بہی کھاتہ میں اندراج کرتا رہتا اور ہر مہینہ کھات لے جانے والی آسامی کے ہاتھ میں غلّہ کے ساتھ ایک پرچہ کاٹ دیتا جس میں غلّہ کا وزن، قیمت اور مہینہ لکھا ہوتا اور اس کا ایک مثنیٰ چودھری کی اپنی کتاب میں رہ جاتا اور ہر پرچہ میں پچھلے مہینہ کا میزان مطالبہ کے ساتھ ساتھ درج ہوتا چلتا۔ اور جب جیٹھ کاتک وصولیابی کا وقت آتا اور چودھری وصولی کا بھاڑ کھول دیتا تو اخیر پرچے پر پوری میزان لگی ہوتی اور چودھری کے

---

[1] یوپی کے دیہات میں کئی قسم کے گھٹیا خریف کے ملے ہوئے غلّہ کو بجھڑ کہتے ہیں اور ربیع کے موٹے غلوں کے مکسچر کو ست نجا!

یہاں اخیر پرچے کا منشی اور کاشت کار کے ہاتھ میں اخیر پرچہ پوری چھ ماہی کا مکمل حساب ہوتا۔ اور بھاؤ کے مطابق وصولی غلّہ کا وزن لگ جاتا۔

جو نزری بھونزا کی جنس اعلیٰ نخود و گندم تو کسانوں کو تخم کی تقسیم کے وقت سال میں پہلی مرتبہ کنوار کا نگ دیکھنے کو ملتی جب وہ اپنے کھیتوں میں ربیع کی تخم ریزی کے لیے چودھری سے بیج قرض لینے آتے اور دوسری مرتبہ جب وہ چیت میں کل غلّہ اپنی بیگاری گاڑیوں میں بھر کر شہر فروخت کرانے لے جاتے اور خوش قسمتی سے انہیں دونوں موقعوں پر ہولی، دیوالی کے تیوہار پڑتے اور بالعموم جس وقت وہ تخم اور کنوار کی کھات، ساتھ ساتھ لینے آتے تو ست نجے کی نجاریوں کی "تلی جھاڑ" ہوتی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ چودھری ست نجے کے ساتھ دیوالی کے پکوان کے لیے گھر گھر کے خرچ کے مطابق گیہوں چنا بھی دیتا اور سرسوں بھی۔ اور دیوالی پر چولہے چولہے کڑھائیاں چڑھ جاتیں۔ ادھر چیت میں نئی فصل آنے والی ہوتی اور بازار کا بھاؤ بھی اپنی پوری سرخی پر ہوتا۔ اور بس چیت کے اندر ہی اندر نئی فصل میں ہنلا پڑنے سے پیشتر جو نزری بھونزا کا مُنہ کھول دینا بھی ضروری ہوتا لہٰذا چودھری ایک ہی دن میں سب گاؤں کی باربرداری کی گاڑیاں بیگار پکڑ کر کل چنا، گیہوں بھر لیتا۔ اور بازار لے جا کر کسی بڑے آڑھتی کے ہاتھ یک مشت سودا کر کے پشتینی شیر مادر اور انٹی میں لگا لاتا۔ اور خوش نصیبی سے اسی کے ارد گرد ہولی کا تیوہار پڑتا اور چودھری پھاگن چیت کی کھات کے ساتھ ہولی کی پوریوں کچوریوں کے لیے گیہوں چنا اور تل تقسیم کرتا ویسے کسان تو یہ خیال کرتے ہوں گے کہ چودھری ان کے تیوہار کی خاطر یہ کرتا ہے۔ مگر دراصل چودھری کو چونکہ تخم ریزی اور فروخت کے لیے جنس اعلیٰ منظر عام پر لانی پڑتی تھی لہٰذا کچھ شرما حضوری یہ کرنا ہی پڑتا تھا۔ اور پھر بات بھی کون سی تھی۔ ست نجے کی قیمت ست نجے کے بھاؤ اور گیہوں چنے کی گیہوں چنے کے نرخ درج ہوا کرتی تھی اور پھر یہ بھی چودھری کے دادا پر دادا پشتوں سے کرتے چلے آرہے ہیں۔

برسات بھر مٹر کی دال اور کسے جَو کی روٹی کھا کھا کر عورتیں ملہاریں گاتیں، مرد آہا اودل کے کڑکے الاپتے جن میں جگہ جگہ ردمیں تن ہیرو ملکھاں اور صاحب رائے مدبر کا توسید کی بجائے اپنے چودھری کا نام لگاتے جاتے اور جاڑوں بھر باجرے اور ساٹھی کی کھچڑی کھا کھا کر لمبی

راتوں میں چوپال الاؤدں کے گرد ٹکریوں ٹکریوں دیہاتی داستان گو راجہ اندر، راجہ بھوج اور بیر بکرماجیت کی کہانیوں میں ان کی فیاضی ورعایا پروری اور شان وشوکت۔کے تذکروں کے ساتھ اپنے چودہری کی مناسبت لگاتے جاتے۔اور اس طرح سامعین کے کانوں میں داستان کا لطف دو بالا ہو کر پڑتا۔ادر عورتیں دیوالی کے پکوان کے بیچے تیل کی چومکھ جلا کر اپنے راجہ کے اور چھمی کے بھوترے ڈالتے کے مذاقیہ گیت گاتیں،ادر ہولی کے پھاگ میں تو پراتے گیہوں کی پوریاں کھا کھا کر سب کے سب دیوانے ہو جاتے اور چوپائیوں میں جمع ہو ہو کر اور ڈیرہ۔کے سامنے ناچ ناچ کر اور کود کود کر پھاگوں میں بھوانی دیوی کو فہمائش کرتے کہ ہمارے راجہ سے پانسے نہ پھینکے۔

غرض سالو بھرچین کی بنسی بجتی۔گرمیوں میں اظہار تشکر میں گما ڈیوٹ پر جل چڑھایا جاتا۔ جاڑوں میں اُپلوں کے دیے جلائے جاتے۔اور برسات بھر ڈھول بجا بجا کر اندر بھگوان کی پوجا ہوتی ـــــ وہ صرف "ہالی" تھے اور جوتری، بھونرا پُر کرنے کے لیے ہل جوتتے۔اور گاؤں کی پرانی مثل ہے "سکھ سووے ہالی کی جوئے (جورو) بیج کھات کی چنتا (فکر) نہ ہوئے ـــــ اور وہ تو جوتنے بونے والے تھے اور کاٹنے والا تو چودہری تھا مگر" جیسا بوئے ویسا کاٹے" والی قسم کا کاٹنے والا نہیں بلکہ جو بو کر گیہوں کاٹنے والا ـــــ ہنسلا درانتی چودہری کا اور سب اوزار کسانوں کے ـــــ اور لہلہاتے کھیتوں میں ان کے نام کی جنس وار بھری جاتی مگر گیہوں پکتے ہی ان کی تقدیریں پیلی پڑ جاتیں، اور سنہرے سنہرے کھیتوں سے چودہری کی تقدیر زور مارتی دانہ دانہ جوتری بھونرا میں کو گھسیٹ لاتی۔

اور چودہری تو بڑا باخبر تھا اور اپنی رعایا کا سچّا مصلح اور پکا ہمدرد ـــــ جب کسی کسان کا کھیت پوس ماگھ میں ذرا غیر معمولی ہر سال سے اچھا اٹھتا نظر آتا اور گاؤں کے پریت جی اس کو اسی پھاگن چیت میں اس کے لونڈے لونڈیا کی بیاہ کی لگن بتا دیتے تو وہ بے چارہ آئی لگن نہ لوٹانے کے خیال سے چودہری کے پاس دوڑا ہوا آتا۔اور کھات سے اوپر شادی کے لیے طلب کرتا۔ اور ادائیگی کی ضمانت میں غیر معمولی زور کے ساتھ اٹھتی ہوئی فصل دکھاتا اور چودہری اچھی طرح کنکوت کرالیتا کہ کھیت کی پیداوار کا تخمینہ اتنا ہے کہ وہ جج کی بٹیا، مُنہ بولے بھاؤ، اور جوتری بھونرا

کی بڑھوتر اوغیرہ وغیرہ سب دیواریں پھاند کر اوپر نکل جائے گی تو اساڑھ سے لے کر چیت تک کسی وقت بھی اس کی نجاریوں کی کھڑکی کھات کے علاوہ بھی کھلی رہتی تھی۔ اور کچھ نجاریوں کی کھڑکی پر ہی منحصر نہیں جو نرسی بھونرا کے "مونڈھے" بھی بشرط گنجائش کھل سکتے تھے اور پھر جی کھول کر بیاہ رچایا جاتا۔ مگر کھیت کی مینڈھوں کی چوحدی کے تخمینہ کے اندر ہی اندر۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ پربت جی کے حساب میں آج کی تاریخ تک ان پانچوں گاؤں کے اندر کسی لونڈیا یا لونڈے کے بیاہ کی لگن ادھر اساڑھ ساون، اور ادھر ماہ پھاگن چیت کے سوا جیٹھ بیساکھ یا کاتک اگھن نہ پڑتی تھی جو کوئی کسان اپنی لونڈیا لونڈے اس زوردار کھیت کی پیداوار کی بیشی اپنے ہاتھ میں لے کر بیاہ لیتا، اور وہ تو مالک کی مرضی ہی یہ تھی کہ ہر کام چودھری ہی کے ہاتھ سے سپھل ہونا لکھے تھے، تو لگن فصل کٹنے کے بعد کیسے پڑ جاتی۔ یہاں تک کہ پنڈت جی کا دان پن بھی وہیں ہے۔ اور چودھری بڑا مخیّر تھا۔ ویسے بھی بڑی خیرات بانٹتا اور گاؤں کے پربت جی کا تو اس کے پرانے کاغذات میں بھاری وزن کا فصلانہ لکھا چلا آرہا تھا۔ ویسے پنڈت جی چودھری کا تو کوئی کام کرتے ہی نہ تھے۔ اور یہ خرچ بھی وہ اپنی رعایا ہی کی خاطر کرتا۔ پنڈت جی اس کی رعایا کے بیاہ کی لگنیں بتایا کرتے اور جب کوئی ایسا کاشت کار ہوتا جس کے سر لونڈیا لونڈا بیاہ کے لیے نہ ہوتا۔ اور اس کے کھیت میں فصل اچھی اٹھتی ہوتی تو پنڈت جی کتھا کیرتن تجویز کر دیتے، اور چودھری تو خود بڑا خدا پرست اور با مذہب آدمی تھا۔ اور وہ پنڈت جی کی اس مذہبی رہنمائی میں کاشت کار کو اسی طرح دل کھول کر کتھا کیرتن پڑھوانے اور خوب خوب پیٹ بھر کر دُور دُور کے برہمن بلا بلا کر کھلانے کی ہمت افزائی کرتا اور جو نرسی بھونرا کی مہربے وقت توڑ کر پوریوں کے لیے گیہوں اور لڈوؤں لے چنا پیش کرتا اور اگر تخمینہ میں گنجائش ہوتی اور کسان بالکل ہی ہاتھ خالی ہوتا تو شکر اور گھی کے لیے جتنی ضرورت ہو اتنا غلّہ اور دے دیتا۔ اور پھر بڑے زور کی کتھا کیرتن ہوتی، سنکھ پھنکتے اور دُور دُور کے موٹے موٹے بامن جمع ہو کر دو دو تین تین روز کھاتے، اور سال تمام پر جا کر چودھری حساب کر دیتا۔ مگر موت کی لگن کا حساب نہ تو پنڈت جی کو یاد تھا اور نہ مرنے والے کے گھر والوں کو کہ کب آپڑے اور بیاہ کی لگن تو آپڑے ٹال دو پھر آجائے گی۔ مگر یہ تو ٹالے ٹلتی بھی نہیں ہے اور مرے

ہی مارے ٹلتی ہے اور نہ اچھی فصل دیکھ کر پڑتی ہے اور نہ وقت اور گھڑی دیکھتی ہے اور نہ کنکوت کا ہی موقع اطمینان کے ساتھ دیتی۔ بہرحال ایسے موقع پر چودھری فوراً کنکوت کراتا اور اگر تخمینہ میں پیداوار کا اندازہ اتنا ہوتا کہ سب وجوب و مطالبات پورے ہونے کے بعد کفن نکل سکے تو بقدر قیمت کفن اس کو غلّہ دے دیتا۔ اور اگر اس سے بھی زیادہ اُمید ہوتی تو تیرہویں اور اس سے بھی آگے تک کے لیے بہ حدِ گنجائش اور اگر حساب پورا ہوتا اور تو معمولی خرچ و آمد کھیت کی چو حدی کے اندر ہی اندر سمجھ میں آتا تو بکمال شفقت چودھری اپنے باغ میں کیلے کا پتہ بتا دیتا۔ اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے کسی آسامی پر بار پڑے۔ اور بس ہرا ہرا کیلے کا پتہ نخرچی کفن پوشی کرتا۔ اور دو لکڑی اُپلے تو گھر گھر ہوتے ہی ہیں۔

اور پھر تمام جاڑوں الاؤوں اور گرمیوں میں چوپالوں پر تذکرے ہوتے۔" اِیسوں (امسال) سَوبرنی، پر حدام، کڈھو کو کپھن (کفن) ناہیں پڑو۔"

"ارے بھیا کپھن (کفن) تو پرالبد (تقدیر) کے ہاتھ بات ہے۔"

"ہوں۔ تو چودھری بے چارہ کیا کرے! جب پرالبد میں کپھن لکھا ہوتا تو کھیت ہی اچھا اٹھتا۔"

"اور اب بھوت بن کے اگلی پھسل (فصل) تک کیلا کے درنے (درخت) پہ چڑھے راہن گے۔"

اور ان میں دبی دبی پھنسی پھنسی خائف آوازوں میں بات ہوتی اور وہ سب کے سب "پرالبد" کی لاعلمی اور بھوت بننے کے خوف میں چپ ہو جاتے۔

البتہ چودھری کھیت کی پیداوار میں سے ایک چیز کو بالکل نہ چھوتا۔ اور وہ تھی بھی اس کے لیے بے کار، صرف سواری کے دو بیل اور گھوڑی، اور ان کے لیے وہ کھلیان سے فصل کے وقت ہی ہل پیچھے ایک ایک پانسی چنے گیہوں کا بھوسہ جمع کرالیتا۔ اور سال بھر کے خرچ کے لیے اپنا "بونگا" بھر لیتا۔ اور پھر برسات میں کھیت پیچھے دو دو۔ گٹھے ہری چری اور گوار، موٹھ کٹ کٹ کے آتی رہتی۔ اور یہی بچ رہتا۔ چنے کے دلیل اور گیہوں کے دلئے پر لگے جانوریوں بھی چارہ پر مُنہ کم ڈالتے۔ اور پھر چودھری بچارہ آدمی تھا، کچھ ساری مخلوق خدا کا

روزی رساں تھوڑی تھا۔ جو پانچ گاؤں کے آدمیوں کے ساتھ جانوروں کے کھلانے کا بار بھی اپنے سر دھر لیتا۔ اور پانچوں گاؤں کے آدمی تو اس کی رعایا تھے اور مویشی تو ان کے تھے۔ لہٰذا پانچوں گاؤں کے اندر چارہ کھلیان سے تنکا تنکا کسان خود بٹور کر لے جاتے اور اپنے ہاتھ سے اپنے مویشیوں کو سال بھر کھلاتے پالتے، کھیتی کسٹی کا روزگار کرتے۔

علاقہ بھر میں مشہور تھا کہ چودھری کی ترازو کی ڈنڈی سونے کی ہے اور سونا تو بڑا نرم ہوتا ہے، اور سونے کی ڈنڈی تو بھاری پلّے کی طرف جھکے گی اور چودھری کا پلّہ بھاری تھا۔

نہ معلوم کب سے پانچوں گاؤں فکر روزگار سے بے غم، اور غم دوراں سے بے نیاز اپنی تقدیر اور چودھری کی تدبیر کا کھا کر پاؤں پھیلائے سو رہے تھے کہ قحط پڑا! — قحط پڑا اور ایسا کہ دنیا چیخ اٹھی۔

اور چودھری غریب کا کیا قصور، تقدیری معاملات! ورنہ وہ تو ہمیشہ جیٹھ کے دسہرے کی پہلی بھرن پر ہی، اپنی نجاری کا دروازہ کھول دیتا تھا، مگر جیٹھ کا دسہرا چھوڑا ساڑھ کی پہلی نکشٹ مرگ سیں[1] اور پھر آدوڑا خالی نکل گئیں، پھر ساون کی پکھ[2] بنرڑوا سوکھی گئیں، اور رہی سہی بھادوں کی اسلیکھا[3] مینگھا[4] تک نوبت پہنچی اور زمین جیٹھ کی تپا[5] کی طرح تپتی رہی —— اور یہ برا وقت کسانوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور نہ اس کے متعلق چودھری ہی نے کبھی سوچا تھا۔ کھیت سوکھے پڑے تھے۔ اور سوکھتے سوکھتے چیخ اٹھے، دنیا "العطش" پکار اٹھی، اور انسان حیوان "الجوع!" اور جب راندر بھگوان نے اتنے شدید امساک کا مظاہرہ کیا تو چودھری کس برتے پر نجاری کا تالا کھولتا۔ اور مخلوق خدا بھوکی مر رہی تھی۔ اور ان پانچوں گاؤں کا رازق تو یہی چودھری تھا——

---

[1] لغایت [4] برسات کے مختلف ہفتے جن میں خریف کی مختلف اجناس کی تخم ریزی اور ربیع کی تیاری میں مختلف طریقوں سے زمین کی جوتائیاں کی جاتی ہیں۔

[5] گرمی کا وہ ہفتہ جس میں تپش انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور پھر اس کے بعد برسات شروع ہوتی ہے۔

اور جب اندر بھگوان کالے کالے بادلوں کے عکس سے دھرتی کے کاجل سالگاتے اور چھاتی بھر دیتے تو کیا زمیندار کیا ساہوکار سبھی اس دودھ بھری تھالی کی جانب رجوع ہوتے ہیں اور آس لگا کر ہیرا موتی سا اناج بکھیر دیتے ہیں ــــ کسان ہل پھالے لے کر جھپٹ پڑتے ہیں۔ اب کسان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے، تو کس برتے پر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے اور زمین پر تو دھول اُڑ رہی تھی ــــ روڑہی روڑہی، مردہ بڑھیا کی پیشانی کی طرح، مٹیالی جھری دار! ــــ جیسے جاڑوں میں کسی پرانے محنتی چمار کی ایڑیاں! بیائیاں سی پھٹی ہوئیں۔ جن تک برسوں سے خون دوڑ کر پہنچنے میں ناکام رہا ہو ــــ خشک اور شق! ــــ بس برسات کے دو ہی مہینہ کے اندر ہزاروں برس کی جوان دنیا بڑھیا سی گئی ــــ تینوں ترلوک تپ رہے تھے، تمام دن تیز پچھاڈ ہوکتا اور روز ایک نئی قسط زمین کی روح قبض کرتا۔ سورج کی پہلی کرن سے شام کی اخیر شعاع تک دوپہر ہی دوپہر تپتی ــــ

اور دوپہری میں تو بھاڑ سے بھڑک اٹھتے۔ دھوئیں کی قد آدم لپٹیں سی کالے سایوں کی صورت پچھم سے پورب اور پورب سے پچھم دوڑتیں، جگہ جگہ دھوآں جمائیاں سی لیتا معلوم ہوتا۔ اور بارہ بجے تو بگولوں کے بھوت آسمان سے چوٹیاں ملائے دیوزاد ملک کے چلتے ستونوں کی طرح تاحد نظر میدان بھوتوں ہی کے رقص گاہ بن جاتے۔ اور جب بھرا بھرا اساڑھ ساون، بیساکھ جیٹھ ٹوٹ پڑے، تو چودھری کے نئے ناج کیسے کھل جاتے۔ مگر پھر بھی پانچوں گاؤں کے پنچ جمع ہوئے کیلی سے چچا دلگنجن سنگھ، لوچن پور سے حرمت ڈوکر، فقیر آباد سے گلابی مکھیا اور اعظم گنج سے ہنسی مقدم جمع ہو کر دراب نگر نتا لمبروار کے یہاں پہنچے، اور ان کی قیادت میں غذائی وفد بنا کر چودھری کے پاس گئے۔

اور گاؤں کی حالت دیکھ کر جانے کو تو وہ خیر چلے گئے مگر کہنے سننے کی تو کوئی گنجائش نہ تھی۔ پھر بھی کہا اور چاچا دلگنجن سنگھ اور حرمت ڈوکر اور نتا لمبردار نے تو کہنے کا حق ادا کر دیا اور ان کے باپ دادا کی پچھلے قحطوں کی اپنی آنکھوں دیکھی باتیں نظیروں میں پیش کر کر کے چودھری کو کھات بانٹنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ جب انہوں نے دو دو سال اپنی رعایا پالی تھی اور زمین دو سال اسی طرح تپتی تھی اور چودھری بھونرا کے منہ کھلے ہی رہے تھے اور بڈھے چچا دلگنجن سنگھ نے تو شگون

ڈال کر یہ تک بتایا کہ اگلے ہی مہینہ میں مینہ برسے گا اور بیساکھ، جیٹھ اناج گھوروں گلیاروں مارا مارا پھرے گا۔ مگر چودھری نہ پگھلا۔ چودھری خود کھیتی نہ کرتا تھا تو کیا تھا۔ ہر کسان سے زیادہ موسم اور زمین کے مزاج کا شناور تو تھا اور کسان تو خیر اپنے ہاتھ پاؤں سے ہی کرتے اور چودھری تو ہر سال گانٹھ کی رقم مٹی میں ملا کر نکالتا تھا اور فصل بونے سے بھی پہلے پیداوار تول لیتا تھا۔ اور سب پنچ چودھری کی ایک بات کے مقابلہ پر ہار کر اپنا سا منہ لیے چلے گئے۔

کیلی ٹھاکروں کا گاؤں تھا جس کی عسکریت کو چودھری کے جدِ امجد اب سے دو صدی قبل فتح کر کے مسخ کر چکے تھے اور اب تک یہ روایت چلی آ رہی تھی کہ جب چودھری کے پرکھوں نے کیلی پر حملہ کیا تو ٹھاکروں نے بڑا کڑا مقابلہ کیا مگر چودھری نے شکست دے کر قتل عام کرایا اور یہاں تک حاملہ عورتوں کے پیٹ تک چاک کر کے گرایا۔ بوڑھی کیلی تاراج کر کے نئی کیلی چماروں گڈریوں سے بسائی اور بوڑھی کیلی پر گدھوں کے ہل چلوا کر تمبا کو بوائی۔ مگر کوئی ایک حاملہ ٹھکرائن چماریوں میں مل ملا کر جان بچا گئی۔ اور چمار کے گھر میں چھپ کر بیٹا جنی۔ اور جب وہ بیٹا جوان ہو کر اور چمار کے گھر میں پرورش پا کر چمار کے روپ میں چودھری اوراب خاں سے سامنے پیش ہوا، اور چمار کی سفارش سے کاشت کے لیے زمین مانگی تو جہاں دیدہ چودھری اوراب خاں نے پہلی ہی نظر میں اس کی پیشانی کے اندر ٹھکرایت کے نقوش پڑھ لیے اور اس کے باپ دادا کے قصوروں کی معافی دیتے ہوئے اس کی اطاعت کے پیش نظر اس کے ہاتھ میں ہل کا مٹھیا تھما دیا۔ اور آئندہ اطاعت شعاری اور وفاداری کا "بردان" لے کر ایک معقول رقبہ پر بن کاٹ کر کاشت کرنے کی اجازت دے دی۔ اور جب سے اب تک ٹھاکر جواہر سنگھ کی نسل چودھری کے دیے ہوئے اس رقبہ پر اپنی خاندانی روایت کے مطابق اسی آن کے ساتھ کاشت کرتی چلی آ رہی تھی۔ اور اپنے پرکھوں کے بردان کی لاج سنبھالے چودھری کی اطاعت میں بھی بدستور تھی۔ بلکہ اپنی مسخ شدہ صورت میں بھنگیوں سے زیادہ وفادار اور چماروں سے زیادہ تابع دار ثابت ہو رہی تھی۔ جیسے وہ اپنی عزت کو ڈرتے اور شرافت اور بھرم پر مر جانے کو ترجیح دیتے کہ ذرا دیر میں کہیں پھر ٹھکرائیت چمار کے گھر میں پناہ نہ ڈھونڈھتی پھرے۔

لوچن پور گھوسیوں کی چھوٹی سی آبادی تھی۔ کھیتی کرتے، غلّہ سب جوتری بھونرا میں جھونک کر علاوہ کاشت کے بیلوں کے بھوسہ سے بھینسیں اور گائیں بھی پالتے اور فاضل وقت میں دودھ کھویا بازار میں لے جاکر بیچتے، کام کے زمانہ میں عورتیں دودھ بلوتیں، مٹھے مکئے کے سالن سے اور چودھری کی نجاری کی روٹیوں سے گھر پلتے، اور اٹھوارے کے اٹھوارے گھی بازار بیچ آتیں۔ اور کبھی کبھی اس گاؤں میں سکّہ کی جھنکار بھی سنائی پڑ جاتی۔ فقیر آباد اور اعظم گڑھ لودھوں کے گاؤں تھے، جنھیں مقامی اصطلاح میں کسان کہتے اور اچھوت تھے تو نہیں مگر کہے اچھوت جاتے اور تحقیر کی مثال پیش کرتے وقت "چمار کسان" ساتھ ساتھ ملاکر ایک ذلیل قوم جیسا نام پیش کیا جاتا اور یہ محاورہ انہیں ضرور چماروں کی صف میں کھڑا کرتا تھا، مگر دراصل وہ چماروں سے اونچے اور دوسری جینؤ پہننے والی قوموں سے کچھ پست خیال کیے جاتے۔ یہ دونوں گاؤں اپنی فرصت کے زمانہ میں مونجھ اور سنئی کی موٹی موٹی رسیوں کے جالوں سے جنگل میں شکار کھیلتے۔ سور، ہرن جو اس جنگل کی خاص پیداوار تھے۔ پھانس کر چودھری کے ست تجے میں ادھ کچرے گوشت اور چربی کے بوٹلوں کو لپیٹ لپیٹ کر چٹ کر جاتے۔ اس کے علاوہ اندھیری پاکھ میں جب موقع ملتا تو رات کا شکار بھی کھیلتے اور وہ ڈکیتی بھی کچھ اسی جذبہ کے تحت مارتے۔ جس کے تحت وہ شکار کھیلتے اور وہ فکر معاش سے تو آزاد تھے۔ مگر ڈکیتی کا سچا جذبہ بھی کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے جیسے شکار کا، اور پکے ڈاکو میں کسبِ زر کا لالچ تکمیل شوق سے بہت پیچھے ہوتا ہے اور بسا اوقات ایک ایک ڈاکو کے حصّہ میں دس دس بیس بیس روپیہ کا مال ہی آتا ہے اور کبھی کبھی دس دس پانچ پانچ سیر غلہ ہی پڑتا ہے۔

اور درا ب نگر ساتوں قوموں کا گاؤں تھا۔ جیسے چودھری کی نجاری، مراؤ، گڈریے چمار، جولاہے، تیلی، بھنگی اور بڑھئی، لوہار وغیرہ۔ کم وبیش برابر برابر گھروں میں آباد تھے۔ ہر جتھا اور کنبہ ایک سے ایک بڑھ کر لاغر، اور بے غیرت، سب کے سب جوع البقر اور جوع الکلب کے مرض میں گرفتار، کبھی ہولی، دیوالی کو ابھوں پر ثابت لنگوٹی دکھائی نہ دیتی۔ سات عجیب الطرفین مختلف نسل ہونے کے باوجود بھی صورتوں میں بلا کی یکسانیت، اور آواز کا یہ عالم کہ گاؤں کا فرد فرد بولے تو ایسا سنائی دیتا ہے کہ ایک ہی آدمی بول رہا ہے۔ مضبوطی کی یہ کیفیت کہ

مجال کہاکہ ایک دن سکون سے گزر تو جائے اور چودھری کو جوتا نہ گھموانا پڑے۔ چم چور ایسے کہ فصل کے وقت دو چار ڈیرہ کے اندر مرغے بنے ہی رہتے پھر بھی دانہ پڑتے ہی کھیت سے کھلیان تک جہاں ذرا بھنگی کی آنکھ بچتی اور سر مہ پوچھا! اور کھیت سے کھلیان تک اور کھلیان سے کھتوں نجاریوں تک وہ ایک رفتار دانہ کا پیچھا کرتے، چودھری صبح سے شام تک پکڑ دھکڑ اور جوتے کاری کراتا اور وہ گرد جھاڑ جھاڑ کر دانے! تھیرتی دیتے اور دسترخوانوں کی مکھیوں کی طرح منڈلاتے ہی رہتے۔ نمک مرچ کی چٹنی کی رسل کے گرد چودھری کے ست بجے کی اُپلاسی روٹیوں کو بڑے بڑے نوالوں میں کتوں کی طرح سپڑ سپڑ کر کے نگلتے اور مزہ کرتے۔

۳

اور کیلی والوں میں تو کوئی رگ باقی نہ رہی تھی اور بھرم پر مر جانے کو ترجیح دیتے تھے۔ اور بس ان کی دوڑ چاچا دلگنجن سنگھ تک تھی، جو وفد کے ساتھ چلے آئے اور کہنے کا حق ادا کر گئے اور خیر لاکھ مقروض سہی پھر بھی ٹھاکر تھے، گھر گھر تھوڑا بہت اندر خفیہ زیور برتن کی شکل میں تھا ہی لشتم پشتم دن کاٹنے لگے۔ دوسرے وقت نہ سہی تو دوسرے دن سہی، پورے پیٹ نہ سہی آدھے تہائی پیٹ سہی، پانی پینے کا سہارا ایک دن بیچ ایک دن ہو جائے۔ اور عزت شرافت بنی رہی۔ اور ویسے دھرم کی پوچھو جب کھیت خالی پڑے تھے تو چودھری کے سامنے ہاتھ پھیلانا بھیک مانگنا تھی۔ لوچن پور کے گھوسیوں کی رگوں میں بجائے خون کے دودھ دوڑ رہا تھا۔ نہ سہی کھیتوں میں کچھ، بونگوں میں چارہ تو تھا۔ اور ہزار برسات نہ ہونے سے گائیں بھینسیں سوکھ سی گئیں تھیں پھر بھی ان کو ۲ دو وقت میں ایک وقت پیٹ بھرنے کے قابل دے ہی دیتی تھیں۔ مگر دراب نگر تو بالکل ہی ننگا تھا۔ اندر سے باہر تک بالکل ننگا ہی ننگا! اور چودھری کا ہیڈ کوارٹر، جہاں ہزاروں من غلّہ کا اسٹاک تھا، ویسے گاؤں کی بھوک کا تو اس پر کوئی اثر نہ تھا۔ اور وہ تو بدستور صبح کو انڈے پراٹھے، دوپہر کو قورمہ قلیہ، اور رات کو کباب پسندے کھا کر سویا کرتا تھا۔ اور اس کے بیل بدستور دلیہ اور دیول پر منہ رکھتے تھے اور سب کے سب نوکر بھی، اور ڈیرہ میں تو کہیں بھوک کا ذکر بھی نہ تھا۔ مگر چودھری نے نہ معلوم، کیا سوچ کر ایک

روز رات کو چپکے سے بخاری کھولی اور دراب نگر میں گھر گھر سے ایک ایک آدمی بلوایا اور نہایت خفیہ طور پر بغیر کوئی بھاؤ کھولے چپکے سے پندرہ پندرہ روز کی کھات بانٹ دی۔ اور دوسرے ہی روز سے گاؤں میں روز افزوں بے چینی کم ہو گئی۔

اعظم گنج اور فقیر آباد والوں نے کچھ دنوں تو پانچ ہزار سال پیچھے ہٹ کر اپنا سفر شکم جاری کرنا چاہا۔ مگر سٹھ نہ سکی۔ اصلاً وہ پیدا کر کے اپنے مانگ مانگ کر کھانے کے اس حد تک عادی ہو چکے تھے کہ بغیر مانگ کر لائے ہوئے کام نہ چل سکتا تھا۔ وہ کسان سے شکاری کی طرف نہ پلٹ سکتے تھے، خیر یہ اور بات تھی کہ چودھری کے گھر کی دال میں شکار کے گوشت کا نمک تو ملا سکتے تھے اور خیر اگر چودھری نمک بھی دے دیتا تو دال کھا لیتے مگر جب نمک برابر بھی دال نہ ہو تو نرا نمک کیسے پیٹ بھرے۔ کچھ دنوں زندگی چلی تو مگر کٹ نہ سکی۔

اور مانگنے کے علاوہ پھانس کر کھانے کا فن تو پانچوں گاؤں میں فقیر آباد اور اعظم گنج ہی جانتے تھے۔ لونڈے چلت پھرت کے تھے۔ اندھیری رات کی مہک لے کر چلنے کے شوقین و دیوانے، ایک ایک رات میں بیس بیس کوس کا دھاوا مارنے والے، اور جس طرح شکار مار مار کر فقیر آباد، اعظم گنج میں بیٹھ کر کھاتے، اسی طرح دُور دُور کا ڈکیتی کا مال مار کر بے درنگ ہضم کر جاتے، اور چودھری کی پناہ میں خود اپنے ہی تھانہ کے تھانہ دار کی مجال نہ تھی کہ کسی پہ ہاتھ ڈالے، اور پھر وہ تو دور دوسرے تھانوں کے حلقہ سے مار مار کر لاتے، کبھی غیر تھانہ کا تھانہ دار سراغ لگاتا آ پہنچتا تو مقامی تھانہ کی پولیس چودھری کے ڈر کے مارے مدد نہ کرتی اور فقیر آباد اور اعظم گنج اور چودھری کے گاؤں تو درکنار دُور دُور بھی چودھری کے آسامیوں پر کسی کی ہمت گواہی ثبوت نہ دینے کی نہ تھی۔ اور چودھری بچارہ کچھ خود شریک ہونے تھوڑی جاتا تھا اور شرعاً قیمت سے تو ناپاک سے ناپاک مال حلال ہو جاتا ہے اور وہ تو اپنے بھاؤ پہ سنہرا روپہلا مال خوش خرید قیمت دے کر خرید سکتا تھا۔ اور فوراً ایک مخصوص سنار سے گلوا کر اسی حساب میں جمع کر سکتا تھا۔ جونری، بھونرا کی پیداوار کی قیمت کرتا۔ مگر شاید وہ ایسا کرتا نہ تھا۔ نہ معلوم کیوں ......

ویسے چودھری خوش اخلاق آدمی تھا اور پھر اس علاقہ کا بڑا آدمی، اور بڑے آدمیوں کے یہاں تو تھانے دار، انسپکٹر وغیرہ یوں بھی آتے جاتے کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ اور چودھری کے ڈیرے پہ

آئے دن پولیس کے چھوٹے بڑے افسران کا آنا جانا رہتا اور اپنے تھانیدار سے تو کبھی کبھی رات کی تاریک خاموشیوں میں "ڈیرہ کے اندر ہی مینہ" "مہینہ پیچھے" "موسیرے بھیا" (خالہ زاد بھائی) کی طرح راز و نیاز ہو جاتے اور حساب دوستاں در دل! — کر کے حصہ بانٹ کر لیتے۔

کہتے ہیں کہ بھوک میں قوت شامّہ تیز ہو جاتی ہے۔ لیکن نہ معلوم کیوں ان کی عاجزی ہو گئی اور پورس کے ہاتھی تو اپنی فوج کو کچلتے ہیں اور اعظم گنج اور فقیر آباد والوں نے گوشت خوری سے عاجز ہو کر سون کتوں کے غول کی طرح جوزی بھونرا پر ناک لگائی اور جیسے ان کے پیٹ کی ایک ایک رگ پھڑک اٹھی۔ نس نس میں چیونٹیاں سی دوڑ گئیں۔ اور خون میں خوف اور دلیری کے مثبت منفی جذبات کی سنسناہٹ سی پھیل گئی۔ کسی نے نفی میں سر ہلایا اور کسی نے اثبات میں سرگوشی کر کے ہاتھ ہلایا اور سازش مکمل ہو گئی۔

اور دراب نگر ہی میں کیا، قحط کی سنسناہٹ اور افواہوں کی حرکت تو ساری دنیا میں تھی۔ رات کو کالے کالے بھوت آسمان سے زمین تک جمناسٹکیں کرتے، صبح سے شام تک رنگا رنگ دھولیں اڑاتے، اور شام سے صبح تک کالک سی برستی، ایک چال دمے کے مریض کی سانس کی رفتار پچھاڑیاں پیٹتے پورا اساڑھ اور پھر ساون بیت گیا تھا۔ اور رزق کے کیڑوں میں دھول کے غلافوں پر غلاف چڑھتے، ڈھائی مہینہ ہو چکے تھے کہ آدھے بھادوں بلبلا کر یک دم غلافوں سے نکل پڑے اور اعظم گنج، فقیر آباد کے دل جلوں نے ہر پہلو سے ٹھونک بجا کر اسکیم بنائی۔

سر شام ہی سے پانچوں گاؤں کیا سارا علاقہ قبرستان بن جایا کرتا۔ بھوت جیسے خوف کے مارے سورج ڈوبتے ڈوبتے گھر گھر مران ہی پڑ جاتی۔ کھیت چٹیل میدان، تالاب اور جوہڑ سب سوکھی، سینے کھوکھلے، پیٹ خالی، سر خالی، اور خالی سر تو شیطان کا کارخانہ بن جاتا ہے اور اس بھائیں بھائیں اور سناٹے میں نانبائی تپتی زمین اور لوہے دہکتے آسمان کے درمیان پیٹ سے حلق تک بھرے جوزی، بھونرا اوپر کو گردنیں اٹھائے اندر بھگوان کا منہ سا چڑا رہے تھے اور شام کے دھندلکے میں جیسے ان کی گردنیں اور بھی زیادہ اٹھ جاتیں اور سر شام سے ہی گاؤں میں مران سی پڑ جاتی۔ کھانسی تو در کنار سانس تک کی آواز سنائی نہ دیتی، گلیوں میں کتے گم سم، کھیتوں میں گیدڑ دم بخود، اور کھیتوں سے لے کر بستی تک مرگھٹ کی سی ہُو! اور اس ہُو میں ایک شب

کا انہوں نے پروگرام بنایا۔ اعظم گنج سے منچلا رمپلا، اور فقیر آباد سے دل جلا بلدیو اسہ پہر کے وقت چلے اور بیچ کے چک میں کنوئیں پر بیٹھ کر پروگرام بنایا۔ اور اندھیرا پڑے دونوں اپنے اپنے گروہوں کو لے کر دراب نگر، فقیر آباد اور کیلی کے درمیان کے میدان میں آ گئے اور اندر بھگوان سے آج بجائے ہل پھالے کے لٹھ کے زور سے حق و ناحق کا فیصلہ کرنے پر تل گئے۔ مگر آج دونوں کا گروہ دو چند تھا۔ جیسے فقیر آباد، اعظم گنج میں ہر شخص آج ڈاکو ہی ڈاکو تھا۔ اور بلدیو اور رمپلا کے جھنڈے تلے ہر ایک جمع تھا۔ اور ڈکیتی کا جرم آج نئے پہلو سے آشنا ہو رہا تھا۔ رات اندھیری تھی بھی اور تیرہ بختوں کو تاریک تر معلوم ہو بھی رہی تھی، اور شاید اپنی تاریکی سے ان کے بخت کی سیاہیاں اور بھی زیادہ بڑھا رہی تھی۔ باطل نمی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ ماحول تو ان کی کھیتی تھا۔ اور آج یہی بازی گاہ! سات پشت سے اس میں مرتے جیتے چلے آ رہے تھے، اور وہ اپنی بنائی ہوئی سازش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ماحول کو پڑتال رہے تھے، اور اندر بھگوان نے ان کی کسب روزی کے ذرائع تو انہیں کھیتوں کے چاروں طرف جوں کے توں ابھی تک چھوڑ دیئے تھے، جن میں سے ان کی روزی ان کے پاؤں چل کر بیساکھ میں جو نری بھونرا کے اندر جا چھپتی تھی۔ اور آسمان سے تو ایک بوند بھی نہ پڑی تھی۔ اور ہر کھیت کی منڈیروں پر ببیل اور ببول کے کانٹوں کی باڑہیں جہاں کی تہاں ایستادہ تھیں۔ جو جنگلی جانوروں سے بچاؤ کی خاطر لگائی جاتی ہیں جنہیں برسات کا پانی گلا دیتا ہے۔

نہ سہی پھالے، کھرپیاں، چٹیل کھیتوں کے لامتناہی میدان میں تا حدِ نظر کنوارے اب تک کی سوکھے کانٹوں کی نوکیں تو ایستادہ ہیں، اور ضرورت تو ایجاد کی ماں ہے آج ایک ایک کانٹے کی نوک اپنی روزی میں نقب لگانے کے لیے ان کے حق میں ایک ایک "سانبل" (آلۂ نقب) بنی ہوئی تھی۔ اور رمپلا، بلدیو نے نظر کی کمندیں پھینک کر سب غول کو اشارہ سے دکھایا۔ دُور دُور تک کانٹوں کی باڑہیں بھوتوں کی قطاروں کی طرح بھیانک میدان میں کھڑی سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ اور ان کے درمیان میں وہ سب اپنی سازش کو عملی جامہ پہنانے کی صلاح کر رہے تھے۔ ڈکیتی کی مخصوص مقامی اصطلاحوں میں کانا پھوسی مکمل ہو چکی تھی۔ مگر ڈکیتی مارنے کے ہتھیار آج ان کے پاس نہ تھے اور نہ لوازم ہی سے وہ آراستہ تھے۔ ان کے

ہاتھوں میں صرف بانس کے لٹھ تھے۔ نہ رام پوری ساخت کی بھرتو بندوقیں نہ جے پوری طمنچے اور بھالے کٹاری اور گنڈاسے بھی نہیں۔ نہ باربرداری کے لیے بیل، تانگا اور نہ پیام رسانی اور مفروری کے لیے چمکتی ہوئی گھوڑی، وہ دھوتیاں کس کر چڑھائے ہوئے تھے، اور چہروں اور گردنوں کے گرد چادریں اور پلے پیٹے ہوئے تھے، اور بعض بعض کمروں کے گرد بھی۔ سینہ اور بازوؤں پر میلی ہنڈیاں چپکی ہوئی تھیں۔

اور ان کی قسمتوں میں تو ان کے کھیتوں میں آج کانٹے تھے اور وہ اسی کے جانب رجوع ہوئے، اور انہوں نے بیل اور ببول کے سوکھے کانٹوں کی رہنمائی میں اپنا کام شروع کر دیا۔

۴

اعداد وشمار پتہ دیتے ہیں کہ ہماری دھرتی ماتا کی غلہ کی پیداوار کا پانچ فی صدی حصہ چوہے اور گلہریاں کھا جاتے ہیں اور دس فی صدی وہ مقدس پالتو جانور جو ایک۔ دانہ بھی پیدا نہیں کر سکتے، اور اسی طرح جب یہ تقسیم متبرک جنگلی جانور بندروں، نیل گایوں اور کوؤں وغیرہ سے گزر کر رنگا رنگ آدمیوں سے ہوتی کسان تک پہنچتی ہے۔ تو تقریباً چونسٹھ دانوں میں دو دانہ رہ جاتی ہے۔ یعنی ذکوٰۃ کی شرح کے لگ بھگ جا پہنچتی ہے۔ اور ان کے تو یہ دو دانہ بھی جونری بھونرا کے خزانہ میں تھے اور وہ آج سچ مچ دو دو دانوں کو محتاج تھے۔

اور وہ آج سچ مچ اپنے کانٹوں کی باڑیں ہٹا کر اور چودھری کے راستہ میں بچھا کر اور چوہوں، گلہریں، بندروں، کوؤں اور مویشیوں وغیرہ سب کے حصے دینے کے بعد صرف اپنی دو دانے پھیرے جا رہے تھے۔

بھوک اور خوف کے غشوں میں بے ہوش دراب نگر کے اندر کو انہوں نے کانٹے جنگل سے گھسیٹنا شروع کیے اور سب سے پہلے چودھری کے ڈیرہ کے پھاٹک پر دہلیزے لے کر ڈاٹ تک اوپر تلے کٹیلی شاخیں چن کر کانٹوں کی چٹان پوری کر دی اور پھر چودھری کے

خاص خاص ہوا خواہوں اور اپنے گھر ہونے والے نوکروں کے دروازوں پر، اور پھر دو دو چار چار ہر دروازہ کی ٹیٹا کے آگے اور ہر چوپال کی سیڑھیوں پر اور نہایت فن کارانہ انداز میں جب انہوں نے ہر دروازہ بند کر دیا۔ تو پھر ایک جانب سے گاؤں کی ہر چھوٹی بڑی گلی میں، بچھاتے ہوئے جوزی بھونرا تک چلے آئے اور جوزی بھونرا گاؤں کے ایک کنارے پر کو تھے، اور وہاں سے فقیر آباد اور اعظم گنج پورب، پچھم چار چار چھ چھ فرلانگ تھے، اور جتنا راستہ گاؤں کے اندر ان دونوں گاؤں کو جانے کے لیے طے کرنا پڑتا تھا۔ وہ صاف رکھا اور اس پر پھپتیاں ضرور تھیں۔ کسی گھر کا دروازہ نہ کھلتا تھا اور اس طرح انہیں کانٹوں سے جن کے ذریعے وہ اپنے کھیتوں میں جنگلی جانوروں کی آمد روکتے تھے، انہوں نے چودھری کے کھیتوں کا رشتہ چودھری سے اور چودھری کے ساتھ دراب نگر سے منقطع کر کے جوزی بھونرا کی جڑیں توڑ ڈالیں۔

ساون بھادوں کی مخصوص نباتاتی خوشبو کے بجائے فضا میں مدتوں سے سوکھی مٹی کی عجیب بو رچی ہوئی تھی۔ جو کسانوں کی سانس سی گھٹتی رہتی اور اسے گاؤں میں "کال کی گند" کہتے، کھیتوں کے منہ کھلتے ہی بند غلہ کی مخصوص پھبکا سا چھوڑتی خوشبو اس میں آکر مل گئی۔ زمین قلا بازی کھا گئی۔ آسمان الٹ کر نیچے آگیا۔ موت اور کم زور بیاں زورِ زندگی بن گئیں، اور جوزی، بھونرا کا دانہ دانہ اپنی سائیکل کے پہیئے کی گولیوں جیسی چال بھول کر طوفان نوح کے چشمہ کی طرح ابل پڑا۔ الٹی گنگا بہنے لگی۔ اور بہتی گنگا میں کون ہاتھ نہ دھوتا۔ چہروں سے چادریں اور کمر ٹیکے کھول کھول کر فعطوٹے پل پڑے۔ مگر اس پل پڑنے میں بھی بلدیو اور رمپلا کی سرکردگی میں امداد باہمی کی تنظیم سی مدِ نظر رکھتے ہوئے جوزی، بھونرا کے اندر سے جیسے ماشینی انداز میں گیہوں چنے کے فوارے چھوٹ رہے تھے، اور وہ روانہ ہونے ہی والے تھے کہ جمی جولاہے کا بیل کھلا۔ اور باڑھے کے پچھواڑے جوزی بھونرا تھے، جمی جولاہی بیلوں کے پاس سو رہے تھے، جاگ کر بیل کے پیچھے پیچھے چلے اور بیل تو خیر دروازہ سے گزر گیا۔ مگر جمی جولاہے بلبلا پڑے اور انہوں نے اپنے پڑوسی نرائن تیلی کو آواز دی، اور نرائن تیلی نے ان کی پہلی ہی آواز پر نیند سے چونک کر گھر کے اندر ہی سے گاؤں کے اندر رات کے خطرہ کے وقت مخصوص

پُکار ہمت بندھائی آواز نکالی۔ "آپہنچا ہوں!" ادھر اپنی چوپال پر سے امراؤ گڈریے نے ڈانٹ بلند کی "آپہنچے ہیں!" ادھر چنن سکھ گڈریہ کے بیوی بچے گھگھیا پڑے اور پیتا مراڈ کا کتا بھونک پڑا۔ اور گڈریوں مراؤں اور جولاہوں میں گھر گھر ڈرے ہوئے بچے عورتیں گھگھیائیں دکھن سے اُتر تک جیسے پورا گاؤں سیاروں کی بستی بن گیا۔ مراؤں کے کتے جھپٹ کر گڈریوں کی جانب بھونکتے آئے اور گڈریوں کے کٹ کتے اچھل کر مراؤں کے گھروں کی جانب بھونکتے دوڑے اور سب گاؤں میں "جاگ ہو گئی" اور چودھری کی تقدیر بھی جاگ پڑی اور بڑے بڑے تگڑے جوان لنگ سنبھالتے کھٹیوں سے اُٹھ کر دوڑے اور دروازوں پر پہنچ کر چاروں خانہ چت جا پڑے اور کوئی سخت جان منچلا جوش میں بھراکتا چھدتا دروازہ یا چوپال کی سیڑھیاں پار کر آیا تو گلی میں پہنچتے ہی بجلی کے سے پھیلے ہوئے تاروں میں الجھ پڑا۔ ادھر جھانک دامن پکڑ کر گھسیٹ رہے ہیں اور ادھر قلا بازیوں پر قلا بازیاں پاؤں کے ساتھ ساتھ چہرہ تک لہولہان کر رہی ہیں۔ سارا دراب نگر کانٹوں پر گھسٹ کر رہ گیا، اور مفلوج سا ہو گیا۔

اور ڈیرہ کے اندر سے پہلے شور پر ہی چودھری کے چار چوکیدار غرا کر جھپٹے مگر بے چاروں کو پہلی ہی جھپٹ پر اندھیرے میں ہزار ہا بچھوؤں کی چٹان نے سر سے پاؤں تک ڈس کر پیچھے دھکیل دیا۔ ان کے واویلا مچانے پر اور سب لالٹینیں لے کر تیزی سے دوڑے تو پھاٹک کانٹوں کے پہاڑ سے بند پایا، نیند میں گھبرا کر پہلے تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ معاملہ کیا ہے۔ پہلے والے چاروں لہولہان شور مچا رہے تھے اور سارے گاؤں سے بھانت بھانت چیخیں پکاریں بلند ہو رہی تھیں۔ ڈیرہ کے اندر بھاگ دوڑ میں لالٹینیں بھی گل ہو گئی تھیں۔ چودھری گھبرا کر بیدار ہوا، اور بلند سے پھاٹک کی جانب لپکا جہاں نوکر شور مچا رہے تھے، اور نوکروں کی کیا ہے!؟ "کیا ہے!؟" میں ایک "کیا ہے؟" کا اضافہ کرتا ان میں جا کھڑا ہوا۔ ڈیرہ گاؤں کے بیچوں بیچ تھا اور چاروں طرف کی آوازیں یکساں آرہی تھیں اور سب سے زیادہ شور ڈیرہ سے بلند ہو رہا تھا۔ اور گھر گھر سے نمایاں شور سُنائی دے رہا تھا، اور چودھری پھاٹک پر کانٹوں کا اندازہ کر کے پلٹا۔ اور "مشعلیں لاؤ" کہہ کر رائفل ہاتھ میں لے کر ڈیرہ کی چھت پر چڑھ گیا۔ اور پیچھے پیچھے سب نوکر؛ مگر اندھیری اور گدلی رات میں بجز "ارے کیا ہے؟!" ——— "دیا رے دیا!" یا ——— "پھنس گئے!"

چھد گئے! چھد گئے!" کی مبہم آوازوں کے سوا اور کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اور کہیں گلیوں میں کراہتے چلاتے سائے سے دکھائی دیتے، اور جگہ جگہ چھپروں کی منگریوں پر مٹکاتے ہوئے بوڑھے مراؤ گڈریے، چمار، جولاہے، اور آواز نکال کر جلدی سے چھپر میں دبک جاتے کہ کہیں "کال (قحط) کا بھوت موڑ (سر) نہ کتر لے" آواز کے ساتھ کالا سایہ سا ابھرے غائب ہوتے ہوئے۔

اور اندھیرے میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے چودہری نے پھر چھت سے ڈانٹ کر کہا "مشعلیں لاؤ، جلدی"! ـــــ اور چار آدمی چار جلتی مشعلیں لے کر چھت پر آگئے۔ اوپر سے نیچے تک تمام ماحول جگمگا اٹھا۔ اور ڈیرہ کی بلند چھت سے انہوں نے سب کچھ پڑتال لیا۔ اور چودہری کا ایک نوجوان بھنگی جو اس کے برابر ایک ہاتھ میں برچھا دوسرے میں مشعل کا لمبا بانس لیے کھڑا تھا جوتری بھونرا سے چلتی ہوئی گٹھڑیوں کی لمبی قطار کو دیکھ کر جوش میں آگے بڑھا اور منڈیر پر پہنچ کر گلی میں پھاندنے کے لیے جھکا۔ اور اس کا جذباتی انداز دیکھ کر چودہری نے کہا "رک، الو کے پٹھے، ذرا نیچے تو دیکھ!!" اور جب اس نے مشعل کی لو ذرا نیچے کو جھکائی تو گلی میں کانٹوں کا جال بچھا دیکھا۔ اور ادھر ادھر جن جن گلیوں کا جتنا جتنا حصہ نظر آسکا اس میں بھی مسلسل جال پھیلا نظر آیا۔ اور انہوں نے جگہ جگہ دو دو ایک ایک پھنسے ہوئے گاؤں کے اور جوشیلے پٹھے بھی دیکھے نکلنے کی جدوجہد میں مکڑی کے جالے کی طرح اور بھی زیادہ پھنستے ہوئے اور چند منٹ میں سب گاؤں نے اندازہ کر لیا کہ کانٹوں نے رسد و رسائل بند کر کے جوتری بھونرا سے سلسلہ منقطع کر دیا ہے۔ بوڑھے تو پہلے ہی چھپر کی منگریوں سے چلا رہے تھے "دیکھ کے! دیکھ کے! لونڈو" اور اکثر نوجوان اپنے دروازوں کے سامنے اور چوپالوں کے نیچے پھنس پھنسا کر بہ ہزار خرابی بسیار الٹے پاؤں جہاں سے چلے تھے وہاں تک پہنچ سکے اور واپس کرنے میں جس جس گھر والے نے ان کی مدد کرنے کی کوشش کی وہ بھی دو چار داغ اور دس پانچ چر کے کھا کر دامن چھڑا سکا۔

اور اب تو ہر چیز نگاہ کے سامنے تھی۔ جوتری بھونرا کی لوٹ بھی، اور ہر لٹیرا بھی! دو متضاد قطاروں میں فقیر آباد اور اعظم گنج کے راستوں میں چنے گیہوں کی الٹی گنگا، جمنا بہ رہی تھیں اور سارادار اب نگر شیر قالین بنا گرج رہا تھا اور اب تو سب کے سب چھپروں کی منگریوں

اور منڈیروں پر چڑھ گئے تھے اور ڈیرہ کی چھت کے بلند ترین پوائنٹ سے چودھری کی مشعلوں کے چاروں شعلے اندھیری دھندیلی رات کو دن بنائے سب کچھ دکھا رہے تھے اور تو اور گاؤں میں اتنے تیل کا خرچ اٹھانے کے قابل کوئی نہ تھا مگر ڈیرہ کی چھت سے چار مشعلیں روشن دیکھ کر چودھری کے ان چار نوکروں نے اپنے چھپروں اور چھتوں سے ایک ایک مشعل اور روشن کرکے بلند کی جو رات کو اپنے گھروں میں سویا کرتے تھے۔ اور چار اور چار آٹھ موٹی موٹی سوسو چراغوں کی ایک ایک لوؤں نے سچ مچ رات کو دن بنا دیا اور چیخیں شدید تر ہوگئیں مگر وہ اس گیدڑوں کی ہو پر بغیر ذرا بھی کان دھرے بدستور مصروف رہے اور اب تو فقیر آباد اور اعظم گنج سے پھٹورے لونڈوں اور تنگڑی عورتوں تک نے یلغار کر دی تھی۔ اور سب کے سب بھرے پرے نہال چلے جا رہے تھے۔ اور اب کی مرتبہ چودھری کا دوسرا نوجوان "بلہار" جھنجنا پڑا۔ مشعل سے آگے کو اشارہ کرکے تڑپ کر بولا۔ "بس میاں! دو! دو ٹھناکے مار دو ادھر ادھر دونوں لبنوں میں کوا اور مانو ہر چڑیاں ہو جائیں گے۔ سب پھینک پھینک گٹھری، جو یہ باپ کا سامان باندھے لیے چلے جا رہے ہیں!" مگر ٹھناکے کرنا تو درکنار چودھری نے تو رائفل کا سیف بھی نہ چھوا۔ اور بدستور ڈھیلا لٹکائے چپ چاپ تماشے دیکھتا رہا اور اس کے ساتھ اس کے سب نوکر بھی ویسے ہی ڈھیلے کھڑے رہے۔ اور یہاں تک کہ پچھلی رات زوالِ ماہ کی چاندنی نے آہستہ آہستہ پسارلینا شروع کیا۔ اور غلیظ گرد آمیز بوجھل تاریکی میں باطل نمی کے ساتھ ٹھنڈی چاندنی کی کمزور شعاعیں زیر و زبر ہونے لگیں۔ اور میدان میں دوڑتے ہوئے آدمیوں کے لمبے لمبے سایوں سے تمام جنگل مرتعش سا ہو گیا اور دیکھتے دیکھتے چودھری کی مشعلیں ماند سی پڑنے لگیں اور پھر تو ہر چیز چاندنی میں مشعلوں کے ساتھ اور بھی واضح ہو گئی۔

جونری بھونرا بقدر ایک ایک تہائی کے خالی ہو گئے۔ اور فقیر آباد اور اعظم گنج کی پگ ڈنڈیوں پر ایک ایک دانہ ٹوٹی تسبیح کی طرح بکھرتا چلا گیا اور چودھری اور اس کے نوکر ڈیرہ کی چھت پر بلندیوں پر بلند ترین پوائنٹ پر جوں کے توں کھڑے صبر کے ساتھ دیکھتے رہے اور اندر ہی اندر سانپ کی طرح بل کھا کھا کر رہ گئے اور ہر لٹیرے کو فرداً فرداً شناخت کرکے

دانت کٹکٹاتے اور گھونسے تانتے رہے۔

آج رائٹ (RIGHT) رانگ (WRONG) تھا اور مائٹ (MIGHT) رائٹ (RIGHT) اور آج کی رات دراب نگر کے میدانوں میں بلدیوا، رمپلا کا سکہ چل رہا تھا۔ یہاں تک صبح نکل آئی۔ اور کھیتوں سے لے کر بستی تک ایک ایک کانٹا چمک اٹھا اور چودھری نے بہتیرا دبانا چاہا۔ دراب نگر میں جس نے کہا کہ جوزی بھونرا لٹ گئے۔ اس کا منہ سا نوچ لیا اور یہی کہلوایا کہ جوزی بھونرا "بٹ" گئے۔ مگر "لٹ" اور "بٹ" نہ گئے تھے تو جوزی بھونرا "بٹ" تو ضرور گئے تھے اور چودھری مائٹ کو رائٹ بنانے میں لٹنے کو "بٹنا" کہلوانا چاہتا تھا۔ مگر لٹنے کی خبر تو بجلی کی رو کی طرح پانچوں گاؤں سے اور پانچ پانچ گاؤں دُور تک دوڑ گئی۔ اور دن چڑھتے چڑھتے کیلی سے چاچا دلگنجن سنگھ، لوچن پور سے حرمت ڈوکر فقیر آباد سے گلابی مکھیا، اعظم گنج سے ہنسی مقدم پہلے تنّا لمبردار کی چوپال پر پہنچے اور وہاں سب روئداد سُن کر جمع ہو کر چودھری کے پاس آئے۔

چاچا دلگنجن سنگھ نے اپنے پانچوں بیٹے پچیسوں پوتے پیش کیے جو شام تک ان چمٹوں، کنٹوں کے حلق میں سے دانہ دانہ سونت لانے کا زور رکھتے تھے اور گلابی مکھیا نے تھانہ رپٹ دینے کی تجویز پیش کی اور ساتھ ہی کھیتوں سے لے کر ہر لٹیرے کے گھر تک تمام راستہ رہنمائی کرتا ہوا بکھرے دانوں کے زرّیں ثبوت پر توجہ دلائی۔ ہنسی مقدم پانی پانی تھے کہ جس آقا کی آراضی معافی خدمتی سے وہ سات پشت سے پلے تھے اس کے ساتھ آج ان کے گاؤں نے ایسی نمک حرامی کی، تنّا لمبردار قوم کے ضرور گڈریے تھے اور صورت بھی بھیڑ کی سی پائی تھی۔ مگر آج تو وہ شیر کی طرح مونچھیں اٹھا اٹھا کر بار بار بپھر پڑنا چاہتے تھے کہ یہ ادنیٰ "چمٹا" "کنٹا" یوں ہاتھ مار جائیں اور ان کے ایک چولہے پر چھ دھڑی پکا روز ٹھور رکھا کھا جانے والے بھائی بھتیجے بیٹے پوتے دو دو ہاتھ بھی نہ دکھا سکیں وہ کچھ چاچا دلگنجن سنگھ کے ہم خیال تھے۔ مگر چاچا دلگنجن سنگھ تو ٹھاکر تھے ڈنڈا ٹھونکی کہہ رہے تھے اور تنّا لمبردار بے چارے تو مالک کا رخ دیکھ کر بات کہتے تھے اور وہ مالک کا رنگ صبح ہی پہچان گئے تھے اور ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ چودھری اپنی لوٹ پر اسی ضرب المثل کے مطابق پردہ ڈال رہا ہے کہ "لٹا بنیا اور پٹا ٹھاکر

اپنی کس سے کہے" اور حرمت ڈو کر بے چارے دم بخود سب کی سُن رہے تھے۔ اور کندھے اُچکائے بوڑھے ہزار سالہ فلسفی گدھ کی طرح بار بار اپنی کینٹری کینٹری نظر کے تیر پھینک پھینک کر انداز سے کچھ ایسے معلوم ہو رہے تھے کہ جیسے ع محو حیرت ہیں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی ؟ مگر" چودھری کہاں نہیں ؟ راس کماری سے ہمالیہ تک اور رنگون سے پشاور تک ! اور ہر جگہ بولتا اور گرجتا تو تھانیدار کی طرح ہے مگر سوچتا اور لکھتا پٹواری کے قلم سے ہے۔ لیکن آج تو دراب نگر کا چودھری سوچ کر بولا بھی پٹواری کی طرح ! اور سب کی خاموشی کے ساتھ سُن کر جب چودھری نے آواز نکالی اور وہ بھی ان سے نہیں بلکہ اپنے ڈھنڈورے کو مخاطب کر کے کہ "پانچوں گاؤں میں منادی کر دو کہ کل سے اگلی پچھلی سب کھات بٹے گی۔" پوری مجلس شوریٰ اور نوکر چاکر ہوا خواہ دم بخود رہ گئے۔

نجاریاں سب پُر تھیں البتہ جوزی بھونرا بقدر ایک ایک تہائی کے خالی تھے۔ کھات بٹنے کا اعلان ہو گیا اور پرانے دستور کے مطابق تقسیم پہلے دو روز فقیر آباد اور اعظم گنج کی ہوا کرتی تھی۔ پھر لوچن پور، کیلی کے دو روز ہوتے اور پھر دراب نگر کے دو تین روز اور پورا ہفتہ بٹ کر ختم ہو جاتی مگر اعظم گنج، فقیر آباد کے دونوں دن کورے نکل گئے اور کوئی متنفس کھات لینے نہ آیا۔ اور تیسرے چوتھے روز کیلی، لوچن پور کی کھات بٹ گئی۔ اور پھر دراب نگر کی اور چودھری نے نئی پرچوں کی کتاب میں سے ایک تہائی پرچے شروع میں سادہ چھوڑ کر کیلی، لوچن پور، اور دراب نگر کی آسامیوں کے پرچے کاٹے تھے۔ لوچن پور، کیلی، دراب نگر تینوں گاؤں جیٹھ کے دسہرے سے بھادوں کی دیوچ تک کی کھات اور ترتیب وار پرچے یک مشت لے گئے اور چودھری نے پھر شروع سے کتاب کھولی وہ جوزی بھونرا بانس سے نپوا کر وزن کا تخمینہ کرا چکا تھا۔ اور اس سے گیہوں چنے کی قیمت نکال کر اس کا ست نکا اور پھر جوار، باجرا، ساٹھی بنائی اور ساتھ ہی ساتھ دیوالی، ہولی کی پوریاں، گجوریاں، اور بغیر جُتی ربیع کے تخم کا وزن بھی کنوار اور چیت کے مخصوص پرچوں میں شامل کیا اور سب پرچے ڈھنڈورے کو دے کر کہا کہ فقیر آباد اعظم گنج میں گھر گھر بانٹ آئے اور چودھری کا ڈھنڈھورا گھر گھر یہ اخیر ترپ کا پتہ لے کر پہنچا اور جوں کا توں لے کر پلٹ آیا اور چودھری کو آ کر بتا دیا کہ فقیر آباد اور اعظم گنج والے تو کہتے ہیں کہ

"اب ہم کو ترپ چال کھیلنا ہی نہیں ہے ..... ." اور جس وقت چودھری کے ڈھنڈھورے نے پرچوں کی تاش کے پتوں کی سی گڈی واپس دی اور چودھری نے یہ "کام اور وقت" کا سوال حل کیا اور کسانوں اور چماروں کے چودھری بنائے تو جواب میں ہر کسان اور چمار ایک ہی ضرب میں ایک چودھری آیا اور سوکھا ساون بھادوں ایک ہی رات میں سرسبز و شاداب ہو کر ایک چھلانگ میں سنہرا چیت بیساکھ بن گیا۔

۱۹۵۳ء

مفرداتِ خصوصی

نام نامی اسمِ گرامی تو معلوم ہے جبار الدین تھا، ویسے سبھی جانتے تھے روزِ اوّل سے "حکیم جی" کہلائے اور دمِ آخر تک "حکیم جی" پکارے گئے۔ گھٹنیوں چلنے تھیکلیوں بھرنے والا دور تو میں نے دیکھا نہیں مگر بچپن سے لے کر لڑکپن تک مکتب کے اندر ساٹھ سترسٹھ عمر والا سنجیدگی کا خول چڑھا پایا، جو کبھی کبھی چھوٹا منہ بڑی بات انمل بے جوڑ معلوم ہوتا اور جس کے ڈانڈے "حمق" سے جا ملتے ویسے یاد ہے مطب کے جلی بورڈ پر "جبار الدین" کے آگے پیچھے گوناگوں ڈگریوں کی دُمیں چوچیں لگی تھیں مگر ان کے مریضوں کے پڑھنے میں علاج اور شفا والا عقیدہ تھا اور ایک ایک خانہ ساز خود تصنیف خطاب ان کی ادویات خانہ ساز مجربات کی طرح سند اور تیر بہ ہدف تھا۔

ویسے عمر بھر حکیم جی نے خارجی سنجیدگی کا خول نہ اتارا، یہاں تک یہ بہروپ۔ ان کی عادتِ ثانیہ بن گیا۔ ہاں یاد ہے۔ مکتب میں دوپہر کے وقفہ میں حوض پر تختی دھوتے یا کسی دن شام کو چھٹی دھکم پیل، بھاگ دوڑ میں کسی چنچل ساتھی سے ہو پڑتی (جو بحمد اللہ مجھ سے کبھی نہ ہوئی، گو کہ کچھ زیادہ ہی چنچل واقع ہوا تھا) تو وہ "حکیم جی" کی مرکب ترکیبوں سے "جی" خارج کر کے منفرد بنا لیتا اور حکیم کی میم کے آگے لمبا سا کھڑا الف مذائیہ لگا لیتا اور حکیم جی کا حکیما بنا کر اپنی ٹکسالی اُردو بولی کا پیٹنٹ نسبتی رشتہ "سالا" لگا لیتا اور "ابے حکیما سالا" کی نسبتی ترکیب وضع کر کے خطاب کرتا تو حکیم جی غصہ میں بھر کر مغلظات لغت کا پٹارہ کھول دیتے اور جواب وجواب الجواب کی جانبین کے لب و دہن سے گوہرِ معنی کے دو آبشار جاری ہو جاتے جو شہر کے گندے نالے تک پہنچ کر طوفانِ بدتمیزی کا سیلاب اٹھا دیتے۔

ورنہ حکیم جی تو چٹنے کی رسم ہی سے کھیر کی طرح شستہ، میٹھی نرم سرسراتی مخصوص طبّی کتابوں والی

زبان بولتے چلے آرہے تھے۔ اصلی نسلی حکیم جو واقع ہوئے تھے۔ مکتب میں باوجود گہری سنجیدگی والے بردبار کے وہ ذہانت کے معاملے میں غبی نہ سہی توغبی سے ذرا ہی کم طالب علم ثابت ہوئے تھے۔ بڑے حکیم جی نے فارسی میں تھوڑی شُد بُد ہوتے ہی چپکے سے فارغ التحصیل سمجھ کر اٹھالیا۔ طبِ یونانی گھر کی لونڈی چلی آرہی تھی ، ان کے حوالے کردی۔ اس لونڈی کے پلو میں حکمت ، طبابت ، عطاری ، نباضی کی بازیاں اور باتیں بندھی ہوئی تھیں۔ پشتوں سے اس تالاب میں مچھلی کے بچے کو تیرنا کس نے سکھایا ، والا مصداق تھا۔ حکیم جی بھی باپ ، دادا ، پردادا سات اور سات چودہ پشت کی طرح آپوں آپ رواں ہوگئے۔ سال ڈیڑھ سال کے اندر علمِ طب بڑے حکیم جی نے گھونٹ گھانٹ چھان کر پلایا۔ حال سُن کر نبض ٹٹول کر سامعہ اور لامسہ کے ذریعہ چودہ طبق روشن کرادیئے۔ حکیم جی سال اندر پہلے چالو ہوئے پھر سرپٹ دوڑنے لگے۔ علم میں نہ سہی علمِ سینہ کا بحر ہاتھ آیا۔ ہتھ پھیریاں ازبر کرادیں۔ پشتینی مجربات کے ساتھ پشتینی روایات ، مفرداتِ خصوصی کے مرکبات ، مجرباتِ خاندانی ، خواص تشخیص پر عبور اور تجویزِ نسخہ ہدایت و پرہیز پر قدرت ، حکیم جی علم طب سے راتوں رات مالا مال ہونے کے راستے پر پڑ گئے۔ قرم بق کے بھیجے کی طرح مریضوں کی جیب سے بجائے عرق بادیان و عرق مکو اور عرق ماءاللحم کشید کرنے کے گُر سیکھ گئے۔

بڑے حکیم جی نے مطب میں بیٹھنے کے ساتھ ساتھ اپنا پرانا زنگ آلود بورڈ بھی رگڑوا کر صاف کرایا جس سے ان کی شہرت بالا تر تھی اور اس سے بھی اوپر نمایاں مطب کی پیشانی پر بیٹے کے نام کا جلی قلم سے چمکتا دمکتا بورڈ آویزاں کرادیا۔

"حکیم الحکماء ، فخرِ اطبائے یونان ، بقراطِ زماں ، مسیحِ دوراں ، محافظِ جانِ مریضاں ، سینائے بخت ، جالینوسِ وقت ، حاذقِ شہر ، علامہ دہر جناب حکیم جبارالدین مدظلہ ، قریشی والحنفی القادری ، جانشین صادق ، حضرت شیخ الرئیس رحمۃ اللہ علیہ ، الفاضل الطب والجراحت ماہر خصوصی امراضِ پوشیدہ ، مردانہ ، زنانہ و طفلانہ و گردہ مثانہ وغیرہ وغیرہ۔"

مطلب کی دکان اچھی طویل و عریض تھی۔ شاید کسی قدیم حویلی کا بیٹھک رہی ہوگی۔ بازار کے سرے پر اور کئی محلوں سے آنے والے چوراہے پر واقع تھی۔ بڑے حکیم جی نے چند فٹ کے فاصلے پر آمنے سامنے بیٹنے کا تختِ حکمت آراستہ کیا۔ اس ترتیب کے ساتھ کہ درمیان میں بڑے اور چھوٹے ہر دو حکما کے اپنے مریضوں مونڈھے تو پیٹھ سے پیٹھ ملے پڑے ہوتے۔ لیکن حکیم صاحبان دونوں ایک دوسرے سے آنکھیں ملائے

رکھتے۔ بڑے حکیم جی پورے مجمع میں کسی پیچیدہ مریض کے متعلق اپنی مخصوص زبان اور طبی اصطلاحوں میں وقفہ وقفہ سے چھوٹے حکیم جی سے مشورہ کرتے جاتے۔ اور مریضوں پر بیٹے کے مقابلے میں اپنی کم مائیگی کا سکہ بٹھاتے جاتے۔ خاص خاص ذہین مریضوں سے بیٹے کی ذہانت اور جدید علمیت کا تذکرہ کرکے واشگاف الفاظ میں اپنے سے بڑھا ہوا حکیم ثابت کرتے اور سب سے بڑی سعادت اور تائید غیبی یہ بیان کرتے کہ پروردگار جانِ آفریں نے اپنی قدرت کاملہ سے اس کے ہاتھ میں شفا دی ہے۔ جس کی بات گھوم پھر کر کرامت اور معجزے تک جا پہنچتی۔ وہی نسخہ وہ خود تجویز کرتے ہیں تو فائدہ نہیں ہوتا لیکن بیٹا تجویز کرتا ہے تو اللہ شافی، اللہ کافی شفا کلی ہوتی ہے۔ اس قبیل کے علاج کے تجربات سناتے جاتے۔

وہ مجسم یونانی دواخانہ تھے۔ ویسے ان سب مرکبات کے نام تو ان کے اپنے گڑھے ہوئے تھے جو مرتبانوں کی چٹوں اور حکیم جی کے نسخوں تک لکھے جاتے تھے۔ ویسے ایک میٹھی نوعیت کے حمق کی آمیزش کے ساتھ حکیم جی کے مزاج میں ہمیشہ سے دوالمسک معتدل جواہر دار کا بھاری پن، مفرح عنبریں بار دوالی کی فرحت، لبوب کبیر مشکی والی توانائی تھی۔ خمیرہ مروارید والا کیف اور خمیرہ ابریشم، شیرہ عناب والا، رنگ جھلکتا اور ان سب کی اپنی اپنی مٹھاسوں کے مرکب کا سراغ ملتا تھا۔ اور جوانی اتقا اور نقاہت کے خول میں معجونِ شباب زا والی تندی سے چڑھی کیا۔ اندر ہی اندر سنسنا کر کھڑی ہوئی تھی جو اس سفر میں ننگی ہو کر سامنے آئی اور کھل کر شوخ ترین کرشمہ دکھلا گئی۔ بچپن کے ایسے ساتھی جیسے میں اور وہ تھے، بڑے ہو کر بالعموم ایک دوسرے کو بھول جایا کرتے ہیں۔ پھر ہم تو داخلی و خارجی ہر صورت سے ایک دوسرے کی ضد تھے۔ میں پہلے دن سے روزانہ شیو کرنے والا، ان کی ریش مبارک استرا تو درکنار، جب تک یک مشت دوانگشت سے بات آگے نہ بڑھ گئی، قینچی تک کی دسترس سے باہر رہی۔ شاید سبزۂ آغاز ہی کے دور سے اس عقیدے کے تحت جو وہ بیان بھی کیا کرتے تھے کہ ان ریشمیں بالوں میں آسمان سے اتر اتر کر معصوم کروبیاں (فرشتے) جھولا جھولنے آیا کرتے ہیں۔ میں مکتب سے پڑھ کر اس زمانے کی کانونیٹ درس گاہوں میں تعلیم و تربیت کے لیے بھیجا گیا اور حکیم جی اسی مکتب کے منتہی ہو کر فارسی اردو میں ترجمہ طب کی کتابوں کے ہلکے پھلکے مطالعے پر لگا کر بھاری بھرکم حکیم بنا دیئے گئے۔ میر الباس اس زمانے کے فیشن کے مطابق تین پیس والا سوٹ، سخت کف اور سخت کالر والی قمیص، ہم رنگ ٹائی، رومال، موزہ اور سیاہ چمک دار بوٹ سر پر فیلٹ ہیٹ۔ ان کے جسم پر نیچی حیدر آبادی، شیروانی اچکن، سفید لٹھے کا کھڑکھڑاتا کلف دار پورے عرض کا ڈھیلا تمّان پائجامہ۔ پاؤں

میں ایک پھول والی دلّی کی جوتی اور زیر و نمبر کی مشین، گھومے ہوئے بال، سر پر گرمیوں میں کڑی جالی کی کھڑی ٹوپی، جاڑوں میں کبھی سمور کی ایرانی ٹوپی۔ اور منہ کے اندر صبح تڑکے سے سوتا پڑنے تک کے تہ بہ تہ پانوں کا خوشبودار ذخیرہ جو مرکب ہو کر خانہ ساز خمیرہ بن جایا کرتا۔ پیک رو کے ہونے کے سبب بات کرتے وقت اکثر لڑکھڑائی لڑکھڑائی آواز میں عربی کی غریب ترکیبیں، اصطلاحیں زردہ کی مشک، زعفرانی خوشبو کے بھبکوں کے ساتھ خارج ہوتیں اور زردہ قوام خمیرہ تمباکو کی خوشبو کو اور بھی زیادہ بھاری بنا دیتیں اور ان سے "کسب گرانی" کر کے یہ بھاری بھاری الفاظ بھری باتیں بھی گراں تر ہو جاتیں۔ اور "حکیم جی" کی ارفع قابلیت کا وزن بڑھا دیتیں۔ پھر میں نسلی زمیندار بچہ، پشتوں سے دنیا بھر کی "کروں" سے آزاد اور زبانی و عملی ہر نوعیت کے جھوٹ سے بے نیاز اور غلط بیانی سے بیزار۔ حکیم جی جھوٹ موٹ نبض پر انگلیاں دھر کر اور دور سے قارورے کے آر پار نگاہِ غلط انداز ڈال کر نجومی کی طرح اندھیرے میں تیر چلانے والے اور دن رات کوٹ کاٹ، گھونٹ گھانٹ کے ذریعے مسخ کر کے اپنے عطائی نام گڑھنے والے عطار، پھر میں پکا دیہاتی، وہ پورے کے پورے شہری مگر اس تمام میں اور کچھ نہیں تو مجھے اُن کے ساتھ شاید صنعت تضاد والی دل چسپی تھی۔ اور نہ وہ تھے نہ میں۔ لیکن شہر کے اندر وہ میرے دوست خیال کیے جاتے تھے۔ حالاں کہ اس دوستی کا دائرہ کبھی نزلے زکام میں ان کا تجویز کیا ہوا ایک جوشاندے کا نسخہ پینے تک بھی نہ پہنچا۔ مگر بچپن کی ہم مکتبی کا سہارا لے کر ان کی سنجیدگی پر ضرب لگانے کے لیے میں تفریحاً بے تکلفی سے پیش آتا۔ اور وہ جو میرے وار خالی دیتے تو اور بھی مزا آتا۔ وہ بچپن ہی سے حکیمانہ سنجیدگی اور وضع داری کا خول چڑھائے ہوئے تھے اور مجھے عمر بھر اس کو ان کے اوپر سے اتار تو نہ ملا تھا مگر کھینچنے میں لطف آتا رہا۔

مہینے دو مہینے پیچھے جب کبھی ادھر گذر ہوتا اور وہ وقت ایسا ہوتا کہ وہ مریضوں سے نبٹ چکے ہوتے تو میں یوں ہی مطب میں جا دھمکتا، مشک و عنبر و زعفران کی لپٹوں میں ابریشم و حریر میں لپٹی باتیں سر سراتیں، از سرتاپا تواضع۔ پہنچتے ہی وہ منبر سے اتر کر پہلے تو ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ اور پھر فوراً دواخانے کے اندر جاتے۔ جاڑا ہوتا تو اپنے ہاتھ سے مفرح مشکیں کی ایک خوراک مرتبان میں سے نکال کر مٹی کے کوزے میں بھرتے اور پانوں والی تھالی میں رکھ کر بڑے تکلّف کے ساتھ پیش کرتے اور میں چاٹتا ہی ہوتا کہ ان کا عطار گلاس میں ماءاللحم سہ آتشہ لے کر آ جاتا۔ اور حکیم جی اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر اسی انداز میں پیش کرتے۔ رگ رگ معطر ہو جاتی اور تمام بدن میں حرارت عزیزی متحرک محسوس ہوتی۔ گرمی ہوتی تو ان مرکبات کی جگہ

مفرح بارد اور عرق بید مشک، عرق کیوڑہ اپنے دواخانہ کا خاص مرکب شربت راحتِ روح شامل کرکے اور برف میں ٹھنڈا کرکے تواضع کرتے۔ جس کو کہتے ہیں "دُکھ درد کی" وہ تو ان جیسے خول چڑھے لوگوں سے ممکن ہی نہ تھی۔ اور وہ تو عمر بھر میں ایک مرتبہ ہوئی اُس سفر میں، بہر حال وہ اپنی زبان اور لہجہ میں تراش خراش کر مرصع بات کرتے اور میں اپنے شہر کی مخصوص مضافاتی نیم دیہاتی ڈھیلی ڈھالی بولی میں بولتا۔ اور ان کی عملی سنجیدہ گفتاری کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی اپنی ہرزہ گوئی ٹنک ملا دیتا۔ مگر چلتے چلتے وہ اپنی تمام کھلائی، ادویات، مفرحات، مقویات پر پانی پھیر دیتے مجھے اصرار کرکے اپنی ڈبیا میں سے ایک پان ضرور کھلاتے، مُنہ کا مزا بگڑ جاتا اور میں راستے بھر مکدّر رہتا۔ ویسے پرانے بزرگوں کی نصیحت ہے کہ شہر کے حاکم اور حکیم سے دوستی رکھو۔ سو حاکم تو آج کل یاری نہیں پالتا بلکہ دشمنی پالتا ہے۔ مگر حکیم سے تو میری دوستی تھی، اگرچہ اس کی حکمت سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ تاہم وہ میرے دوست ضرور تھے۔ ہم دونوں ہی لڑکپن سے نکل کر اس عمر میں بالکل ہی نو وارد تھے جس کو سال وسن کی اصطلاح میں نوخیز اور صورتِ حال کو عنفوانِ شباب کہتے ہیں۔ اکتوبر کا پہلا ہفتہ تھا شکار کا سیزن شروع ہی ہوا تھا۔ میں کارتوسوں کی خرید کے لیے دلی جا رہا تھا۔ اور کسی بھی خریداری کے لیے تنہا اپنے شہر سے باہر جانے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ سب گھر شکار کا رسیا تھا۔ بزرگوں کو اپنے شہر اور دہلی کے نرخ دکھلا کر بڑی مشکل سے اجازت اور رقم لی تھی۔ بڑے شوق کے ساتھ اکیلا سفر پر جا رہا تھا۔ اسٹیشن پر پہنچا تو حکیم جی نظر آئے۔ رستہ کاٹنے کے لیے خواجہ خضر معلوم پڑے۔

"کہاں جا رہے ہو، یار حکیم جی؟" میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

"دلی، اور آپ؟" انھوں نے جواب کے ساتھ ہی سوال کر دیا۔

میں نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ "جہاں تم وہاں ہم!"

"بہت خوب! بہت خوب ساتھ رہے گا۔" ہم دونوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اچھا میں تو کارتوس خریدنے جا رہا ہوں اور تم؟"

"بھئی چودھری صاحب، ابا حضور نے اس خیال سے کہ سفر وسیلۂ ظفر و ممدِ عقل و موجب تجربہ ہے۔ اس مرتبہ مفردات خصوصی کی خریداری کے لیے اپنے بجائے بندے کو متعین کیا ہے۔"

میں نے بات کاٹ دی — "وہ کیا دوا ہوتی ہے یار، ایں مفردات خصوصی "؟

انھوں نے آہستہ سے کھنکار کر پھر سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "جناب ایک دوا ہوتی ہے، متعدد

مفرد ادویہ جن سے تیر بہدف مرکبات تیار ہوتے ہیں، اور مفرد بھی استعمال ہوتی ہیں۔ کُل دواخانے کی مرکبات کا انحصار انھیں پر جو ہے اور آپ کارتوس خریدنے؟ ایں، کیا کارتوس اپنے شہر میں دستیاب نہیں ہوتے؟"

"ملتے یہاں بھی ہیں مگر کوالٹی گھٹیا اور دام زیادہ۔ قیمت میں یاں واں سے اتنا بل ہے کہ کرایہ وغیرہ کل سفر کے اخراجات نکال کر بھی نفع رہے گا اور چیز کے تو کہنے ہی کیا بہترین ملے گی۔ ہاں وہ دوائیں تم کیا کیا لاؤ گے مفردات خصوصی؟"

میرے سوال پر حکیم جی کے بشرے میں حکیمانہ طور اور بھی زیادہ مضبوط ابھر آئے "اجی حضت ایک چیز؟ بھلا قیمتی معدنیات ونباتات وحیوانات مشک، عنبر، زعفران، پایۂ شتر اعرابی، قضیب دب، کفِ ابابیل، زہر مہرہ خطائی، ستِ سلاجیت، مروارید، جملہ جواہرات کی کھرل وغیرہ آپ کیا سمجھیں گے۔ قیمتی ادویہ ہی تیر بہدف ہوتی ہیں اور بلند پایہ اطباء انھیں سے علاج کرتے ہیں۔ سمجھ لیجیے ایسی ویسی نہیں ہزار روپیہ کی خریداری کرنی ہے۔"

میں نے حکیم جی کا رُخ اشتہار بازی اور اُستادی کی جانب دیکھ کر بات کا دھارا موڑنا چاہا۔

"ٹھہرو گے کہاں یار یہ بتاؤ؟"۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ جواب دیں، میں نے دوسرا سوال اسی سلسلے میں ملا دیا۔ "اور واپسی کب ہو گی؟"

حکیم جی نے جواب دیا۔ "جناب قیام تو یہ ہے کہ ہر سال شروع سرما میں ابا حضور بہ نفسِ نفیس اس اہم مہم پر دہلی تشریف لے جایا کرتے تھے اور ہر چیز بچشم خود پسند فرما کر لایا کرتے تھے۔ علاج اور دواسازی میں لازم وملزوم کا ربط ہے۔ ہماری ساری اہلیت وقابلیت ہی لایعنی و بے کار ہے۔ اگر دوا صحیح نہیں ہے، اور اپنے دواخانے میں تو یہ خصوصیت ہے کہ تحقیق کے ذریعے اپنے مرکبات نسخے خود وضع کرتا ہے، ابا حضور کا بیشتر وقت تجربات اور تحقیق میں صرف ہوتا ہے ویسے پیچیدہ و کہنہ امراض کا اصل معالج تو خاکسار ہے اور یہی ہماری کامیابی کا راز ہے۔ ہماری ایجادات تیر بہدف ہوتی ہیں اور تیر بہدف اور توتیہیں ہوتی ہیں۔ دیکھ لیجیے نا ہزار روپیہ لے کر جا رہا ہوں۔"

"وہ تو سب معلوم ہے۔ پھر اس سفر کی تو بتاؤ، کہاں ٹھہرو گے؟ ساتھ ہی ساتھ واپسی ہو تو صحیح ہے۔" میں نے پھر بات کا رُخ بدلا۔

"عرض کیا نا، اس مہم پر میرا یہ پہلا سفر ہے اور مفردات خصوصی کی اہمیت میں نے عرض کر دی۔ سمجھ لیجیے ہماری ساری طبی و معالجاتی اہلیت و قابلیت کا دارو مدار اسی خریداری اور انھیں مفرد اشیاء پر ہے۔ سو ابّا حضور نے آزمائشی طور پر بغیر کسی ہدایت کے خاکسار کو متعیّن فرمایا ہے۔ حتیٰ کہ ان ادویہ کی فہرست بھی نہیں لکھائی ہے، ان کی تفصیل، تعداد، اقسام، نوعیّت و مقدار بھی میری استعداد معلومات پر مبنی ہے اور ایک طرح یہ میری آزمائشی مہم ہے۔ بس یہ ہدایت دے کر رخصت فرمایا ہے کہ جو جو مفردات خصوصی دواخانے کا جزو لاینفک ہیں خرید کر لاؤ۔"

"ارے یار وہ تو سُن لی لن ترانی، میں پوچھتا ہوں ٹھہرو گے کہاں اور واپسی کب تک ہو گی ــ؟"

"عرض کرتا ہوں نا ابّا حضور تو ہر سال حکیم صادق حسین عطّار کے واں قیام فرمایا کرتے تھے۔ یہ بات تو میرے علم میں ہوش سنبھالنے سے چلی آ رہی ہے۔ مگر انھوں نے مجھے مطلق کوئی ہدایت نہیں کی ہے۔ حکیم صادق حسین حکیم وکیم تو کیا درحقیقت مفردات خصوصی کے بڑے دلال ہیں۔ ہر نوعیت کی اشیاء خالص و مستندان کے ذریعے دستیاب ہو جاتی ہیں۔ مال خالص اور چیز معتبر ملتی ہے۔ بھاؤ بازار سپلائی کرا دیتے ہیں، تھوک پرچون، دکان دکان دھکے نہیں کھانا پڑتے ویسے خاکسار کو بھی اصل و نقل کی تمیز ہے مگر ان کے ذریعہ نقلی مال ٹھگی کا امکان نہیں۔ یہ جانبین سے اپنا کمیشن دلالی پاتے ہیں۔"

میں نے پھر بات کاٹ دی۔ "یار عجیب بے مغز سے آدمی ہو، سوال دیگر جواب دیگر۔ میں تو پوچھ رہا ہوں ٹھہرو گے کہاں اور آپ حکیم دلّال کا تعارف پیش کر رہے ہیں۔ کیا انھیں صادق حسین صاحب کے یہاں ٹھہرو گے؟"

"بھئی عرض تو کرتا ہوں ابّا حضور تو انھیں کے مکان پر قیام فرمایا کرتے تھے حالانکہ انھوں نے مجھے ہدایت نہیں دی ہے تاہم میں بھی سوچ رہا ہوں کہ اُنھیں کے یہاں ٹھہروں گا، انھیں کی عرفت خریداری کرنا ہے نا۔ اور جناب کا قیام کہاں ہو گا؟ خریداری کتنے کی ہے؟ اور کتنے عرصے بس فارغ ہوں گے؟"

میں نے شکار کے شوق کی خوشی سے چہکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یار تم تو پیسے سے پیسہ کھینچنے جا رہے

ہو اور زندگی جان بچانے کا سامان اور ایں جانب دولت پھونکنے ۔خون بہا نے اور جان لینے والی چیزیں لینے ۔کارتوس خریدنے ۔اور اپنا بھی ایسی مہم پر جس میں خریداری کرنا ہو پہلا تنہا سفر ہے ۔ سو بھئی مجھے تین سو نقد تو پاپا نے دیئے ہیں اور سوا سو نقد بندہ اپنے جیب خرچ کی سال بھر کی بچت کے مالِ طیّب ان کے علم سے علیحدہ دبا کر لایا ہے، پورے پانچ لگلے فورٹونٹی ۔ پاپا نے تو ڈھائی سو روپے کارتوسوں کے لیے اور پچاس سفر خرچ کے دیئے ہیں ۔سو پاپا اتوار کے اتوار یا چھٹی کے دنوں کھیلنے والے ہیں اور یہاں روزانہ بلا ناغہ صبح شام دنا دن کرنے والے ۔سو بھیّا اپنے والے کارتوس تو دبا کر رکھ لوں گا اُن سے ۔ اور پاپا اپنوں میں سے جتنے میرے حصّے کے دیں گے وہ علیحدہ ، گھر سے بجٹ بنا کر جارہا ہوں، پچیس روپیہ تو سفر خرچ مع کرایہ قیام وغیرہ لہٰذا اپنے ڈیڑھ سو روپے کے لانگ رینج علیحدہ اُن سے چھپا کر لے جاؤں گا۔ ڈیڑھ ہزار ۔ دس روپے سیکڑہ والے ۔یہ سفر کی دو چار دن کی تھوڑی سی تکلیف ہے ، پھر تو سال بھر مزے ہی مزے ہیں دنا دن !"

میں چہک چہک کر کہہ رہا تھا، ان کی اور میری سوچ میں بڑا تفاوت تھا، وہ میرے اس وفورِ شوق کو اسی طرح دیکھ رہے تھے جیسے میں ابھی ان کے مفردات خصوصی کے ذکر کو۔

بات ختم کرتے ہوئے بولے "اور قیام پذیر کہاں ہوئیے گا، کسی ہوٹل میں شاید؟ ایں"۔

"ویسے ہوٹل میں بھی ٹھہر سکتا ہوں، لیکن اس سفر میں خاص طور پر کفایت مدِ نظر ہے ! سال بھر کے شوق کی بات ہے نا، زیادہ سے زیادہ بچت کر کے جتنے زیادہ کارتوس لے جاؤں بہتر ہے، لہٰذا چچا، مم مرحوم کے یہاں قیام کروں گا"۔

"ایں کیا! چچا مرحوم کے یہاں ۔کہاں کہیں قبرستان میں ؟ یہ کون ؟ بزرگ !" انھوں نے حیرت اور اِک مزاحیہ انداز میں کہا۔

"اماں یار ۔ تم چچا مرحوم سے واقف نہیں ؟ انھیں تو ایک دُنیا جانتی ہے ، اور وہ تو ہر جگہ مرحوم لگا کر ہی پکارے جاتے ہیں، حالانکہ ہم بہت سے زندوں سے زیادہ جاندار لوگ ہیں ۔تعجب ہے یار تم انھیں نہیں جانتے ، اپنے شہر میں بھی تیسرے چوتھے مہینے کاروباری دورہ کرتے ہیں ۔خیر اس مرتبہ یہیں دہلی میں ملائیں گے تم سے ۔ ممکن ہے کہ تمہارے کام کے بھی آدمی ثابت ہوں ۔ ورنہ پرلے درجہ کے پُر خلوص، خوش باش، خوش معاملہ اور زندہ دل ہیں ۔جب آتے ہیں تو ہمیشہ سے ہمارے ہی یہاں

ٹھہرتے ہیں۔ اور ہر شہر میں اُن کے ایسے ہی ٹھہرنے کے ٹھکانے ہیں، ہوٹل سرائے کہیں نہیں جاتے۔ اپنی کمشنری چھبیوں شہروں اور ریاست رام پور میں چھوٹے بڑے ہر سطح اور ہر نوعیت کے دکان داروں اور دوسرے تجارت پیشہ لوگوں سے معاملت لین دین کا کاروبار ہے، اور بڑی ساکھ ہے، ہر قسم کے مال کا آرڈر لے جاتے ہیں، تھوک پرچون سب بازاروں کا اتار چڑھاؤ انھیں پہلے سے نظر میں رکھتے ہیں۔ اور گھر بیٹھے سپلائی ہوجاتی ہے۔ وہ تو تھوک فروشوں کے تھوک فروش سمجھیے، مثال کے طور پر اگر آپ اپنی دوائیں اُن کے توسّل سے خریدیں گے تو وہ کون ہے آپ کا صادق حسین عطّار دلّال کیا، اِن سے ہر مال بیش کھرا اور قیمت میں کافی کم، آپ کے دواخانے پر سپلائی ہوجائے گا۔ سُنتے ہیں کبھی بڑا کاروبار تھا، جاپان سے کلکتے تک اور کلکتے سے تمام بہار یوپی لاہور تک پھیلا پڑا تھا مگر برسیں ہوئیں دیوالہ پٹ گیا، اب اسی لوٹ پوٹ میں خوب کماتے ہیں، ویسے خلقی طور پر بڑے پُرخلوص وضعدار آدمی ہیں، تجارتی معاملت میں جس کے ساتھ ایک مرتبہ واسطے میں پڑجائیں پھر دامن چھوٹتا نہیں۔ ویسے مجسّم خلوص اور بڑی پیاری شخصیت ہیں۔ جس گھر میں آنا جانا ہوجائے بڑی پذیرائی ہوجاتی ہے، خوش آواز بذلہ سنج ہر محفل میں یکساں کھپنے والے لوگ ہیں، بوڑھوں، جوانوں بچّوں سب میں ویسی ہی دلچسپی آؤ بھگت۔ دادا سے لے کر پوتے تک سب کے یکساں دوست، باغ و بہار آدمی ہیں'۔ بڑے اچھّے مہمان اور اپنے گھر پر کوئی پہنچ جائے تو ایسے ہی بڑے اچھّے میزبان بھی۔ نہ آپ کے یہاں تکلّف، نہ اپنے یہاں تصنّع — شفّاف ہیرے کی طرح ترشے جلا کیے پہلودار شخصیت ہیں۔ دہلی میں جب کوئی اُن کا دوست یا اہلِ معاملہ آتا ہے تو سیدھا انھیں کے گھر کا رُخ کرتا ہے۔ تواضع خاطر، اور پھر جس کام کے لیے آیا ہو اس میں امداد۔ مجال ہے کہیں ذرا چوک ہوجائے۔ آمدنی بھی معقول ہے خوب کمانے خوب کھانے اور کھانے سے زیادہ کھلانے میں خوشی و طمانیت پانے والے لوگ ہیں۔ اپنا کوئی خرچ نہیں۔ اولاد ہے نہیں میاں بی بی۔ فقط دو دَم۔"

"خیر وہ تو میں سمجھ گیا مگر آپ نے یہ نہیں بتایا کہ یہ چچا مرحوم کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ کیا اس میں بھی ان کی شوخیٔ طبع کو دخل ہے۔"

"کیا بتاؤں بھئی۔ کچھ ایسا ہی ہے، لوگ کہتے ہیں اور یہ کہلواتے ہیں، اس میں شوخی و سنجیدگی دونوں ہی ہیں۔ ویسے تو ان کا نام حاجی عبدالرحیم ہے اور سوداگرانِ پنجابی برادری سے ہیں۔ بڑے مذہبی، مختصر

نمازی متقی پرہیزگار واقع ہوئے ہیں۔ عقائد کچھ اس قسم کے ہیں کہ فاتحہ درود، بزرگوں پیروں کے مزاروں پر حاضری وغیرہ کے بہت قائل ہیں۔ کوئی اولاد ہے نہیں اولاد تو اولاد میاں بی بی دونوں ہی کے بہن بھائی بھانجہ بھتیجہ سگا تو درکنار دور کا بھی کوئی رشتہ دار نہیں ہے، بس ہم آپ دوست آشنا یا خوش معاملہ گاہک خریدار کاروباری معاملت میں آجائیں وہی سب کچھ اور زندگی کا سہارا ہے اور ساری محبت و مروّت انھیں کا حصّہ۔ نہ معلوم کیوں مذہبی عقیدہ عجیب ہے، یا وسوسہ سمجھو، کچھ ایسا کہ مرنے کے بعد اگر فاتحہ درود قل نذر و نیاز نہ ہو تو تا قیامت روح دُنیا میں بھٹکتی پھرتی ہے، اور بے چارے کے اپنے اولاد ہے نہیں ورنہ سب کے بیٹے پوتے کیا ہی کرتے ہیں، اب پتا نہیں کسی پیر عالم کے مشورہ سے یا خود اپنی افتادِ طبع کے تحت چچا یوں سمجھو جیتی زندگی مرنے کے بعد کی اپنی تمام رسوم خود ادا کرتے ہیں، مدّتیں ہوئیں اُنھوں نے دو قبریں کھُدوائیں، ایک اپنی ایک اہلیہ کی، اور ان کے اندر سیغمبری قسم کے جَو لبالب بھروا کر وہیں کے وہیں قبرستان میں فقیر جمع کر کے خیرات کیے، اس طرح گویا یومِ وفات ہوا، لوگ تعزیت کو آئے، اس کے تیسرے روز چچا چچی دونوں کا سوئم ہوا، کشمش مِلا کر چنے پڑھے گئے، قرآن خوانی قل ہوا اور شام کو پلاؤ زردہ قورمہ شیرمال پکوا کر اچھی طرح سوئم کی فاتحہ دلائی ۔ ۔ ۔ فقیروں مسکینوں میں کھانا تقسیم کیا گیا اور پھر برادری والوں کو بھی کھلایا گیا۔ گویا مرنے کے چالیس دن بعد بڑی دھوم دھام سے چہلم منایا۔ دروازے پر فقیروں کا میلہ لگ گیا۔ کھانے کی دیگیں پکائیں اور تنور جھُکایا۔ پھل مٹھائیاں اور اپنے پہنے ہوئے کپڑے جُوتے خیرات کیے۔ دوستوں کو بھاری دعوت دی اور حافظ بٹھال کر چالیس قرآن ختم کرائے اور دوسرے روز خام قبریں درمیان میں تعویذ سے کچّی چھوڑ کر آس پاس سے پکّی کرادیں بلکہ سُنتے ہیں کہ سنگِ مزار بھی کھُدوا کر لگوا دیئے ہیں، صرف تاریخ کندہ ہونا باقی ہے۔ اس سے پہلے حج کو گئے تھے تو کفن کا کپڑا ساتھ لیتے گئے تھے اور اب زمزم میں بھگو کر ساتھ لائے ہیں۔ میاں بی بی دونوں کے کفن غلافِ کعبہ کے ٹکڑے میں لپیٹے رکھّے ہوئے ہیں۔"

یہ سُنتے ہوئے حکیم جی خلافِ عادت کچھ مذاقیہ موڈ میں آگئے۔ بولے "خیر یومِ وفات تو انھوں نے فرضی کرلیا۔ ان کا فعل تھا لیکن مرنے کا مقام کیسے متعیّن کرلیا، قبریں کھدوا لیں، یہیں کہیں دہلی میں، یا وصال یہیں ہوگا، یہ بھی معلوم کرلیا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا "اماں یار، بالفرضِ محال دہلی میں نہ سہی تو آس پاس کے کسی شہر میں، سوچا جہاں مریں گے وصیت کر جائیں گے کہ اپنی قبر میں گاڑے جائیں۔ کہیں لندن، امریکہ تو مرنے جائیں گے نہیں۔ حکیم جی یار وہ تو بڑے وضعدار مزے دار آدمی ہیں، مل کر دیکھنا، میں تو کہتا ہوں تم بھی میرے ساتھ انھیں کے یہاں ٹھہرتے اور ان دواؤں کی خریداری کے سلسلے میں اگر چاہتے تو ان کی رہنمائی امداد لیتے۔"

"نہیں خیر اس مرتبہ انھیں کے واں صادق حسین کے، ابا حضور کی ہدایت نہیں مگر روایت کے مطابق واجب ہی ہے۔ پھر دیکھا جائے گا مل لیں گے تمہارے ساتھ کسی دن جا کر تمہارے چچا مرحوم سے بھی۔"

ساتھ ساتھ کھانا کھا کر میں اور حکیم جی جب فارغ ہوئے تو اس "چودہ مسافروں کے لیے" لکھے ہوئے کمپارٹمنٹ کے اندر ہم صرف دو نفر رہ گئے تھے۔ مجھے ٹرین کے ہنڈولے اور لوریوں میں غنودگی آ رہی تھی کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری۔ جھٹکے سے میں نے نیم وا آنکھیں کھول دیں۔ ادھر ایک مرد ایک عورت داخل ہوئے، جو تھے تو ساتھ ساتھ ہی مگر پہلی نظر میں دیکھ لیا کہ بالکل مختلف ہیں، جتنا دیکھا تجسس بڑھا، حالانکہ گاڑی آمد خرفت تھا مگر بستر پر پڑے پڑے یہی گھورنے اور جوڑ ملانے کا مشغلہ کرنے لگا۔ صورت حال نے پرچول کو اشتباہ کی حد تک پہنچا دیا۔ پہلی عجیب سی بات یہ تھی کہ ان دو انٹر کلاس کے نو وارد مسافروں کے ساتھ کوئی اسباب نہ تھا حتیٰ کہ سردی کا موسم اور بستر قسم کی بھی کوئی چیز نہیں۔ ایک پوٹلی اچھی کسی بندھی ہوئی مرد کی بغل میں دبی ہوئی تھی اور دوسری ڈھیلی سی جیسے ایک جوڑا کپڑوں کی عورت کے ہاتھ میں لٹکی ہوئی تھی۔ ایک پانی کی پیتل کی مخصوص لٹیا مرد کے ہاتھ میں تھی، گاڑی چلتی رہی اور لیٹے لیٹے میں اس گورکھ دھندے کی کڑیاں جوڑتا ملاتا رہا۔ مگر چول بیٹھی نہیں، خارجی تضاد تھا کہ ایک دوسرے کا تعلق فٹ نہ ہو سکا۔ مرد کے بدن پر پھتوئیں تھی، جس کی آستین کہنیوں پر سے رگڑ رگڑ کر پھٹ گئی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی پرانے بڑے کوٹ کو کسی اناڑی درزی نے کانٹ چھانٹ کر اس کے لیے کبھی بنا دی ہے۔ کپڑا کھنگی اور میل کی تہ بہ تہ چیکٹ کے سبب مسخ ہو گیا تھا۔ شاید کبھی اونی سرج رہی ہوگی۔ رفتگی اور خستگی دونوں ہی اترن ہونے کی غماز تھیں۔ سر کے اوپر کپڑے کی نیچی دوپلی میلی ٹوپی تھی جس میں سے سخت آہنی تاروں جیسے بالوں کا گچھا آگے نکلا ہوا تنگ پیشانی پر لٹک رہا تھا۔ پچکی گڑھے دار کنپٹیوں اور پیچھے۔ بے سر کے اوپر تک

زیرو نمبر کی مشین بھی گھومی ہوئی تھی، اوٹنگری ٹوپی میں سے ناریل کی طرح کھوپڑی پیچھے کو نکلی ہوئی تھی، موٹے موٹے کرخت گلگلہ سے سیاہ کانوں میں چاندی کی چھوٹی چھوٹی مرکیاں پڑی تھیں، چہرے کے زیریں حصے اور گردن کے گرد ایک کثیف سا جھاڑن لپٹا تھا جو سُرخ رہا ہوگا، ایک جھاڑن کندھے پر پڑا تھا۔ ٹانگوں میں مخملی کنار والی اترن کی دھوتی تھی جس میں سے تقریباً نصف ۔ سے زیادہ بوسیدہ کپڑا پھاڑ کر علیحدہ پھینک دیا گیا ہوگا۔ اور ساڑھے پانچ گزی کے بجائے بمشکل تین گزی رہ گئی تھی جس کو بڑی محنت سے دھویا گیا تھا مگر میل نہ نکل سکا تھا اور نہایت اہتمام کے ساتھ نیچی کر کے باندھنے کے باوجود بمشکل گھٹنے ڈھک سکتی تھی۔ پاؤں میں اُدھڑی استر کا جوتا جس میں کچے چمڑے کو نرم کرنے کے لیے کڑوا تیل اور مٹھا بھر کر رکھنے کے سبب چکنائی پھوٹی ہوئی تھی اور اس پر باریک مٹی کی دبیز تہ جمی ہوئی تھی۔ ٹھڈی کے بیچ کافی گہرا گڑھا تھا جس نے سیاہ چہرے کو سنگِ موسیٰ کی چھوٹی سی چٹان جیسی صورت کا تاثر دینے میں تبدیل کر دیا تھا، جیسے چوکھونٹے چہرے کا آدمی۔ کنپٹیوں کی ہڈیاں اور رُخساروں کے ہڈے گول گول اُٹھے ہوئے تھے۔ اور اوپر سے تنگ پیشانی کی ہڈیاں، جٹی ہوئی بھوؤں کے ساتھ لٹکی ہوئی تھیں، ان مہیب سے گڑھوں کے اندر چھوٹی چھوٹی ذرا کینٹری کینٹری آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں، جن کی چمک چہرے پر ایسی نظر آتی جیسے بھٹیارے، اچھے بڑھیا خمیرہ تمباکو کے سیاہ پنڈے کو سجانے کے لیے گٹھیاں کوڑیاں لگاتے ہیں، لیکن غضب کی تیز، جائزہ سی لیتی ہوئی، عجیب انداز سے گھومتیں اور گردن کے بغیر گھمائے جہاں کی تہاں بھیڑیئے کی طرح نگاہ بدلتیں، موٹے موٹے لٹکے ہوئے سیاہ تاب ہونٹ، نشیو بڑھا ہوا جیسے رُخساروں اور ٹھڈی پر موٹا موٹا پسا ہوا کوئلہ ملا ہو۔ اور یہ سب کا سب کریہہ چہرہ مہرہ ذرا کوتاہ آہنی سلاخوں پر پڑی گردن پر دھرا ہو، جس میں ایک چاندی کا تعویذ سُرخ ڈورے میں لٹک رہا تھا۔ نیم کے درخت کی اچھی موٹی شاخیں جیسی کلائیاں تقریباً مربع بڑے بڑے ہاتھ جن میں چھنگلی سے لے کر انگوٹھے تک یکساں جیسی موٹائی کی انگلیاں سب کچھ نہایت مضبوط اور کرخت جس میں ایک گھسی ہوئی چاندی کی انگوٹھی پڑی تھی۔ سیٹ پر بیٹھا کیا ٹک سا گیا۔ اور جب کندھے پر سے انگوچھا اتار کر اور پاؤں اُٹھا اُٹھا کر جوتوں کی گرد جھاڑی تو رونگٹا منڈی پنڈلیوں پر جگہ جگہ موٹی موٹی نسوں کے غدود نظر آئے۔ گھستے ہی تمام کمپارٹمنٹ کا ذرا اجنبی اجنبی نگاہوں سے جائزہ لیتا رہا۔ انٹر کلاس کی گدی ٹٹول کر دیکھی جیسے عمر میں پہلی مرتبہ گدّے دار کمپارٹمنٹ میں بیٹھا ہے۔ تمام حلیے سے اندازہ ہوا کہ کسی ہندو گھر کا پانی کھینچنے والا نوکر ہے۔ عمر پچیس سے

اُوپر ہو گی، آہنی ہاتھ پاؤں، سنگین سینہ کو لیے۔ تمام وجود ر وڑھا۔ روڑھا پتھریلا سا نظر آرہا تھا ساتھ ہی ساتھ انتشار والی کیفیت نمایاں تھی جیسے چلتی ریل سے پھاند پڑنا چاہتا تھا۔ اس کیفیت کو سنبھالنے کی کوشش کرتا لیکن اس کوشش میں یہ اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی۔

عورت جسم جُثّہ سے نوخیز سی نازک اندام لڑکی معلوم ہوتی تھی اور صرف چھوٹے چھوٹے گورے گورے گداز سے ہاتھ نظر آرہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کی جانب یہ مرد عجیب سی بیگانہ نگاہیں ڈالتا اور پھر کھڑکی سے باہر تاریک فضا میں گھورتا۔ لڑکی سیٹ کے اُوپر کونے میں چُری چُری سہمی سہمی دُبکی سی بیٹھی تھی۔ سُرخ اُونی شال میں لپٹی گٹھری سی بنی، شال کے نیچے ریشمی دوپٹہ تھا جس کا پلّو گھونگھٹ میں سے نظر آرہا تھا۔

میں لیٹے لیٹے چُپکے چُپکے بدیر گھورتا رہا، اور اس مرد اور اس لڑکی کے رشتے کا پیوند ملا کر اس مرد کے چوکھٹے میں فٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ شوہر نہیں، جیٹھ دیور، کوئی سُسرالی رشتہ دار نہیں، بھائی، بھتیجا، باپ وغیرہ بالکل نہیں اور میری نگاہیں اور گہری ہو گئیں۔ مرد کا ایکسرے کرنے لگیں۔ رات گئے چھوٹے سے دیہاتی مقاماتی اسٹیشن سے سوار ہوا، مرد کے جوتوں اور لڑکی کے رنگین ریشمی لہنگے کی گوٹ اور چپلوں پر گرد کی تہہ، دونوں ساتھ ساتھ پیدل منزل مار کر چلے آرہے ہیں، کسی کچے دیہاتی راستے پر مسافت طے کرتے۔ یہ آدمی تو یقیناً شودر ہے، محنت اور سخت کام کرنے والا اور یہ لڑکی اونچی جاتی کی ہے، گوری چِٹّی، ریشمین کپڑوں میں ملبوس۔ دونوں ساتھ ساتھ سوار ہوئے لیکن بات کرنا تو درکنار سرگوشی اور اشارہ بھی نہ ہوا جیسے سب کچھ پہلے سے طے شدہ ہو، مرد کے چہرے اور انداز کا انتشار اور لڑکی کا چہرہ تو گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا لیکن بار بار پہلو بدلتی۔ سب کچھ تضاد ہی تضاد تھا اور معمّا سا۔ دیہاتی مالدار ہندو کبھی کبھی قصباتی گھروں کی لڑکیاں معتبر حجاموں کے ساتھ مخصوص تیوہاروں پر سُسرال سے میکے جایا کرتی ہیں، لیکن یہاں وہ بات بھی نہیں بنتی۔ ان کے ساتھ کپڑوں کے پوٹلے مٹھائی کی جھابیاں ہوتی ہیں اور میکے کے حجاموں کے سامنے گھونگھٹ نہیں نکالتیں، حجام بوڑھے ہوتے ہیں۔ پھر یہ کسی تیوہار کا توقع نہیں اور پھر حجام ایسے نہیں ہوتے۔ یہ تو کبھار چمار کوئی محنت کرنے والا ہے۔ میں حیرت میں ہی نیند میں ڈوب کر رہ گیا۔

ٹھہرنے اور چھوٹنے کے دونوں جھٹکے جیسے نیند میں ایک ہی محسوس ہوئے۔ ویسے تو اس کے

پیشتر اور بھی اسٹیشنوں پر ایسے جھٹکے لگے ہوں گے لیکن شاید میں اچھی طرح نیند لے چکا تھا۔ آنکھ کھل گئی۔ ریل کے ہنڈولے میں شاید پھر کروٹ لے کر سو جاتا مگر اس نیم بیداری کی حالت میں۔ مجھے کچھ اور غیر معمولی سی بات بھی محسوس ہوئی۔ جیسے خواب میں کسی نے کہا "اٹھ، تماشا دیکھ!" اور کان تو شاید گہری نیند میں بھی چوکنے ہو رہے تھے۔ منہ پر بار بار ہاتھ پھیرا، کلائی پر گھڑی دیکھنے کی کوشش کی۔ ساڑھے چار بج رہے تھے اور پھر آنکھیں کھول کر جو دیکھا اس پر یقین نہ آیا، جو الٹی سیدھی کانوں میں پڑ رہی تھی . . . . لیکن خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ مگر ایک لمبی انگڑائی لے کر یہ جاگتی آنکھوں کے خواب کی حقیقت نظر آگئی۔ بھلا اس تقریب ملاقات کی شانِ نزول کیا ہے؟ اور پوری طرح سے حواسِ خمسہ جمع کر کے غور کیا تو دھک سے ہو گیا شروع شب کا معمّا اس وقت در معمّا بنا ہوا، میرے سامنے تھا، اور حیرت ضرب اندر ضرب ذہن کے اندر بڑھ رہی تھی۔

ایک سیٹ بیچ اگلی سیٹ پر حکیم جی تھے اور وہ غیر معمولی زیادہ قریب ہی قریب۔ پیہم کھسر پھسر سرگوشیاں، لڑکی کی آواز میں الفاظ کم سسکیاں زیادہ، کبھی گہری، کبھی اتھلی جن میں تھرتھراتے ہوئے دو چار الفاظ پھر بچّے کی سی سسکیاں اور بمشکل ایک آدھ جُملہ اور پھر ہچکیوں میں کچھ کہنے کی کوشش، اور حکیم جی کی مخصوص ہمت بڑھاتی آواز، جیسے نبض دیکھ کر کسی مایوس مریض کو تشفّی دے رہے ہیں اور میری نیند وِیند غائب ہو گئی۔ اور بستر میں دبکے ہی دبکے بغیر انگڑائی جمائی کے چاق چوبند ہو گیا۔ ذہن کے اندر سوالوں پر سوال ابھرنے لگے، وہ اس کے ساتھ والا کندۂ ناتراش آدمی کون تھا؟ سونے سے پیشتر تو کاؤ آمد خر رفت والی بات تھی لیکن اب حکیم جی کے ساتھ معاملت دیکھ کر یہ بھی اہم سوال بن گیا کہ وہ آدمی اب گیا کہاں؟۔ اور سب سے زیادہ اہم سوال یہ تھا کہ حکیم جی . . . اُس قربت کی سطح تک کیسے پہنچ گئے جس کا میں نے گفتگو کے الفاظ بغیر سُنے صرف حرکتوں سے اندازہ کر لیا تھا، تقریب ملاقات یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟ میرے اللہ! اور اس کی تو میری جانب سے اک ذرا ترچھی ترچھی پیٹھ تھی، اور آمنا سامنا نہ تھا لیکن حکیم جی کا چہرہ تو عین میرے مقابل تھا، میرے سامنے برتھ پر بڑے اطمینان کے ساتھ پان منہ میں دبائے جُگالی کر رہے تھے۔ تمام وجود پُر سکون اور کامیابی والی مخصوص کیفیت تھی۔ آواز واضح طور پر تو ریل کی کھڑکھڑاہٹ میں سُنائی نہ پڑ رہی تھی تاہم چہرہ آنکھوں اور ہونٹوں کی حرکت کے اتار چڑھاؤ اور تبادلے سے صاف ظاہر تھا کہ تسلّیاں دے رہے ہیں، نیز یہ بھی کہ انھوں نے اندازہ کر لیا۔ ہے کہ میں جاگ

چکا ہوں، لیکن جس کو کہتے ہیں کہ رُخ نہ ملا رہے تھے تاہم کنکھیوں سے دیکھنے کی کوشش بھی برابر جاری تھی اور مجھے اندازہ ہوا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

چونکہ لڑکی کی میری جانب پُشت سی تھی لہٰذا میں نے اطمینان کے ساتھ حکیم جی کو ہاتھ کے اشارے سے مخاطب کیا، لیکن جب اُنھوں نے توجہ نہ کی تو پھر آہستہ سے کھنکھارا اور ہاتھ لہرا کر استفسار کیا اور اب اُنھیں متوجہ ہونا ہی پڑا لیکن بڑے اطمینان اور بھاری بھر کم انداز میں انھوں نے ہاتھ ہی کے اشارے سے جواب دیا کہ سب بتا دوں گا، اطمینان رکھو۔

ان اشاروں پر وہ لڑکی سمٹی سمٹائی اور گردن موڑ کر میرے اور حکیم جی کی سگنلنگ SIGNALING کا جائزہ لیا، صبح صادق کا سپیدہ پھوٹ رہا تھا اور اس وقت مجھے گھونگھٹ کے اندر سے تین چہارم چہرہ نظر آگیا، بجلی سی کوند گئی۔ آنکھوں کے سامنے صُبح کا سپیدہ، بلب کی روشنی اور اس کا چودھویں کے چاند سا چہرہ۔ دال میں جو کچھ کالا تھا وہ سپید ہو کر سامنے آگیا۔ الحفیظ الامان، رونگٹے رونگٹے میں سرور لپک گیا! حکیم جی اس سطح تک کیسے پہنچ گئے! کیا اس لونڈیا کے پیٹ میں درد اُٹھ کھڑا ہوا یا بخار چڑھ گیا۔ چلتی ٹرین میں جو انھیں دست گیری اور معالجہ کرنا پڑا۔ اور اُس کے ساتھ والا وہ کھردرا مرد، وہ تو شروع ہی سے ایسا نظر آتا تھا کہ چلتی ریل سے پھاند ہی تو پڑے گا... ایں کیا اس بدنصیب نے سچ مچ جست لگادی! حکیم جی نے ہاتھ کے مثبت اشارے سے مجھے مطمئن کر کے پھر رُخ نہ ملایا اور اُلٹے آہستہ سے پہلو بدل کر اور نگاہ بچا کر بیٹھ گئے اور ان کے اس انداز پر میں نے بڑے زور سے کھانس کر احتجاج کیا، کھانسی کی آواز میں چیخ کا انداز تھا اور دوسرے منٹ میں برتھ کے اُوپر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ شاید انداز جارحانہ ہو گیا تھا اور حکیم جی کو اپنی خاموش سی ڈھٹائی توڑنی پڑی اور توجہ دینی پڑی۔ لیکن مُنہ سے ایک لفظ نہ بولے۔ زیادہ اطمینان دلاتے ہوئے واضح اشاروں میں ہی بتایا کہ "سب بتاؤں گا، کوئی خاص بات نہیں، آرام سے لیٹے رہو۔" اور شاید اپنے اس اطمینان کو راسخ تر بنانے کے لیے ڈبیہ سے نکال کر ایک پان بھی کھایا اور مُنہ کے اندر چھالیہ تمباکو اس طرح گردن اٹھا کر چٹکیوں سے ڈالتے رہے جیسے مرغا پانی پیتا ہے۔ میں بمشکل دو چار منٹ نچلا بیٹھ پایا ہوں گا کہ میرے اندر پھر بڑے زور سے تحقیق کی آرزو ہوئی۔ وہی بندر کی سی اضطراری حرکتیں اب لنگور کی طرح اچھلنے کودنے لگیں، جن کا حکیم جی کو شاید شروع ہی سے اندیشہ تھا کہ صفراوی المزاج اور بے تکلف آدمی سے، اور بات بھی کچھ ایسی ہی ہے، شاید یہ اندیشہ بھی ہو کہ مبادا کہیں

اپنی جگہ سے جست لگاکر ہمارے درمیان نہ آپڑے۔ حدّتِ تجسّس فزوں تر ہے پھر طبعاً شوخ اور پھکڑ کی حد تک غیر سنجیدہ واقع ہوا ہے۔ بچپن کا ساتھی لنگوٹیا ہے اور بات بھی حیرت میں ڈالنے والی ہے، اگر کوئی دوسرا غیر متعلق مسافر ہوتا تو بھی اس کو پرچول ہو جاتی۔ انھیں اندیشہ ہوا کہ اگر یہ پھکڑپن پر اُتر آیا تو ساری رات کے کرائے پر دو جملوں میں پانی پھیر دے گا۔ انھوں نے میری جانب جیسے مخاطب ہونے کے انداز سے دیکھا، مگر زور سے کھنکھار کر رہ گئے۔ ادھر میں نے بھی ان سے بھی زیادہ کھنکھار کا جواب کھنکار کر دیا مگر انھوں نے بڑے اطمینان اور اہتمام کے ساتھ پیک تھوکنے کے لیے کھڑکی سے باہر سر نکالا۔ ان آوازوں کے تبادلے میں اُس نے بھڑکی لناڑی ہرنی کی طرح مُڑ کر مجھے دوبارہ زیادہ وضاحت کے ساتھ دیکھا اور اُس کا پورا کتابی چہرہ کُھل کر میرے سامنے آگیا۔ اور بھرپور آنکھیں چار ہوئیں۔ روئی ہوئی نرگسی انکھڑیاں، رونے سے گلابی ہو رہی تھیں اور چہرہ لال بھبھوکا اور ناک کا ٹسوا ذرا بھاری بھاری سا انگارے کی طرح دمکتا ہوا۔ آئینہ سی چمکتی پیشانی، گداز سے نم ہونٹ۔ وہ تو جسم ہی سے اندازہ ہو گیا تھا۔ چہرہ دیکھ کر مزید تصدیق ہو گئی کہ اٹھتی ہوئی شوخ جوانی اور معصوم رخصت ہوتی ہوئی طفلی گلے مل رہی ہیں اور چہرہ دیکھتے ہی ساری روئداد کی پوری کتاب کھل گئی۔

میں ساعت بھر کے لیے تو بھونچکا سا رہ گیا، پھر اس کفر سامان رنگ و تابناک لب و رُخسار اور پیشانی کے آئینے میں، حکیم جی کا عکس دیکھنے اور برداشت کرنے کو یک دم میرا دل تیار نہ ہوا۔ مگر سب کچھ ایک طرف تھا اور روزِ روشن کی حقیقت سامنے تھی اور چلتی ریل میں صبح تو بڑی ہی رنگین و تابناک طلوع ہو رہی تھی مگر اس غارت گر ایمان و آگہی پر غائر نظر ڈالی تو دھک سے ہو گیا۔ اس کے جسم پر تو رات لہنگا دوپٹہ تھا اور اب ساڑھی ہے۔ حکیم جی نے بڑے غور سے میری جانب دیکھا اور بیٹھے ہی بیٹھے دور سے اختلاجِ قلب کے مریض کی طرح میری آنکھوں میں سے میری نبض دیکھ لی اور اندازہ کر لیا کہ آثار شدید ہیں، بغیر مفرّح عنبریں اور مسکّنِ خاص کی خوراک دینے کے کام نہیں چل سکتا۔ پھر حد بھی ہوتی ہے۔ تحقیق و تجسّس، انتظار اور یہ سب سامانِ حیرت۔

اور میں بھی تو حکیم جی کی طرح سولہ سترہ سال کا نوخیز ہی تھا اور پھر مجرّد اور حکیم جی تو تجربہ کار۔ بقے اور خوردنِ گندم سے جو فساد اس خلقت کے اندر برپا ہوتا ہے اس کے بھرپور محرم، مگر وہ تو بات ہی ایسی تھی حکیم کے اوپر بہروپیا چڑھ بیٹھا اور اس ملمع نے ان کی قلعی اور بھی کھول دی۔ انھوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ ایک گلوری کھائی اور چھالیہ تمباکو زردہ مُنہ میں ڈال کر قوام چاٹا، سفر کے اختتام والی ایسی طمانیت

طاری ہوگئی جیسے اہلیہ ساتھ ہیں۔

آخر مجھ سے نہ رہا گیا، شاید آدمی اور بندر کے بین بین جست لگاتا ہوا اپنی نشست سے اُٹھا اور حکیم جی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنا چاہا مگر وہ بکمال نرمی خود ہی میرے برابر آبیٹھے اور حکیمانہ سنجیدگی کو معمول سے زیادہ سنجیدہ ظاہر کرتے ہوئے خوشبو بھری سرگوشی میں بولے۔

"کیوں کیا کہہ رہے تھے آپ؟"

کھول تو میں بڑی دیر سے رہا تھا، اِس سوال پر اور ایسے استغنا پر پھنک کر رہ گیا۔ دیکھو مسخرے کی، نہ تو میں اتنا احمق ہوں اور نہ یہی اتنا بھولا کہ یہ سوال کرتا۔ جی میں آیا کہ اس وقت ہاتھا پائی کا مذاق شروع کردوں لیکن بات اتنی سنجیدہ اور عجیب تھی کہ دھپ لگانے کو ہاتھ نہ اُٹھ سکا۔ تاؤ میں ایک موٹی سی غلیظ گالی بکی۔ پھر زہریلے کی حد تک طنزیہ تیوروں سے کہا۔

"اجی قبلہ ہنوز نہیں سمجھ سکے کہ کیا عرض کر رہا ہوں۔ ایں! قربان جائیے اس پیارے سوال کی بھولی ادا پر۔ کیوں جی مجھے بہرہ سمجھتے ہو اور اندھا بھی شاید! ایں؟"

حکیم جی اک ذرا زچ سے ہوتے نظر آئے۔ مگر چہرے اور آنکھوں کے بدلتے ہوئے رنگوں پر قابو پاکر سنبھل گئے، تاہم رنگا سیار کیا سنبھلتا، رنگ ہی اڑ گیا، اک ذرا توقف کیا۔ جیسے جواب کے لیے لفظ تلاش کر رہے ہیں۔ زبان سے یہ کہنے کا یارا نہ رہا کہ "میں نہیں سمجھا کیا پوچھ رہے ہو۔"

لیکن ان کے انداز سے یہی جواب اخذ کر کے میں نے طنزیہ تلخی سے کہا۔

"خیر تم میرا سوال نہیں سمجھے تو مجھ سے سمجھو جو میں پوچھ رہا ہوں، یہ لڑکی کون ہے؟ اس کا وہ ساتھی کہاں گیا، جس کے ساتھ کل سرِ شام سوار ہوئی تھی؟ وہ کون تھا؟ اور میں دیکھ رہا ہوں' جناب سے یہ آدھی رات سے کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں؟ اور کچھ صاف صاف سمجھ گئے حضور۔ میں اردو بول رہا ہوں عبرانی نہیں۔"

میرے دم خم کا اندازہ کر کے حکیم جی ایک دفعہ تو بہت سٹپٹائے اور پیک مُنہ میں بھری ہونے کے بہانے ہکلا کر مفلوج زبان میں بولے۔

"وہ، اوں، آں ایک مصیبت زدہ لڑکی بچاری، شریف خاندان۔"

اور مبہم سا سکوت کیا۔

ڈیڑھ دو منٹ سکوت کے بعد تو مجھے اندازہ ہوا کہ بس حکیم جی اپنی بات ختم کر چکے۔ غصّہ آیا۔ دیکھو تو اس بھانڈ کی حرکت! اچھل کر کہا۔

"جی! یہ تو مجھے بھی معلوم پڑ رہا ہے، لڑکی ہے۔ اور مصیبت زدہ ہے اور شاید شریف بھی۔"

میں نے اک ذرا کے ذرا توقف کیا اور اس لڑکی پر غائر نظر ڈالی اور پھر سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "یار حکیم جی پتے کی بتلاؤ، معاملہ کیا ہے؟ تم تو سونے والے تھے اور میں نے کمپارٹمنٹ میں آتے ہی ان دونوں کو اچھی طرح پرتالا تھا اور ماتھا ٹھنک گیا تھا مگر پھر میں سو کر رہ گیا، کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ آدھی رات کے بعد آنکھ کھلی تو وہ اس کے ساتھ والا جو کوئی بھی اس کا رہا ہو چلتی ریل میں غائب تھا اور یہ تمہاری سرپرستی میں آچکی تھی جیسے تمہاری پرانی مریضہ ہے کوئی، تم شفقت کے ساتھ تسلیاں دے رہے تھے، نہ اُس وقت جب سوار ہوئی تو اس کے ساتھ اس کندۂ ناتراش کی شانِ نزول میری سمجھ میں آئی اور نہ اس وقت جناب کے ساتھ تقریب ملاقات، ماجرا کیا ہے؟ ذرا ہم بھی تو سُنیں، بہت آڑے لیے اور جتنا اڑو گے اتنا ہی ہم اُلجھتے جائیں گے اور تم پھنستے جاؤ گے۔"

حکیم جی بڑی نرم اور آئی گئی کرتی آواز میں بولے۔

"عرض کیا نہیں، بے چاری شریف، مصیبت زدہ بس۔"

میں نے چٹختے ہوئے کہا۔

"وہی مُرغے کی ایک ٹانگ، بچاری شریف مصیبت زدہ۔ لیکن یہ جو آپ آدھی رات سے سرگرم گفتار تھے، یہ کون سی دوا کی ترکیب استعمال اور پرہیز کی ہدایتیں فرما رہے تھے، اتنی دیر سے دیکھ رہا ہوں۔ اس کو طاعون نے دبوچ لیا یا کالا بخار چڑھ بیٹھا۔ اس کے ساتھی کو چلتی ریل سے کہاں پر پھینکا، یہ تو بتاؤ بدنصیب کو دھکا دیا۔ اوں اور یہ آپ کے زیرِ علاج کیسے آئی؟"

اور میرے جملوں میں سے ایک پر حکیم جی بلبلا پڑے اور سنبھل کر بولے۔

"یار اللہ اللہ کرو! ایسا بھی پھکڑ پن کس نے مانا ہے! یہاں پردیس میں کیا پھانسی کراؤ گے!

وہی ہرزہ گوئی، بچپنا، میں کیا جانوں، مردود کہاں گیا۔"

حکیم جی کا انداز پھر گویم مشکل نگویم مشکل ہو گیا، میں توقف کر کے سنبھلا اور کہا۔

"تم نہ بتاؤ میں خود ہی پوچھے لیتا ہوں۔ نیک بخت کیا معاملہ ہے۔ بات کرنے میں

کیا برائی ہے، آخر تم اتنی دیر باتوں کی جھڑی لگائے پڑے ہو تو وہ باتیں میں بھی پوچھ لوں کہ مسماۃ کیا چکر ہے"

یہ کہتے ہوئے میں اک ذرا اٹھنے کے لیے ہمکا۔

حکیم جی نے میرے دونوں بازو پکڑ کر بے تکلفی کے ساتھ دبا کر اٹھنے سے روکا۔

"دیکھو یار یہ پھکڑ پن، اچپنا چھوڑو، اور پوست کندہ مجھ سے سنو" حکیم جی نے حکیمانہ سنجیدگی کے تانے بانے کو توڑتے ہوئے کچھ کہنا چاہا، لبوں کے گوشے، سکڑے پھیلے اور ایک دلآویز مسکراہٹ کھیلتی رہی۔ لال لال گالوں پر ریشمین داڑھی کا رونگٹا جیسے بال بال تر کر علاحدہ کھل گیا۔ گل سوئے پھڑکے اور پھر سنبھلے اور پھر لاکھ سنبھالا مگر انکھڑیوں سے رس چھلک ہی پڑا۔ بولے۔

"اب یار تم سے چھپاؤں بھی کیا۔ بات اب نہیں تو تھوڑی دیر میں روشن ہی ہو کر رہتی وہ تو" میرے قریب کو کھسک آئے "داستان لمبی بھی ہے اور دو حرفی بھی، بہر حال میں نے جرح کر کے نکال سب لی۔ پوست کندہ۔ ہردوئی کے مشہور صرّاف ساہوکار کی ناکتخدا لڑکی ہے، اپنے گھر کے اندر برتن مانجھنے پانی بھرنے والے اس کہار سے تعلق ہو گیا۔ یہ کہار جو گھروں میں کام کرتے ہیں بڑے تیز ہوتے ہیں۔ وہ تو سب ہی بنیوں میں اور خاص طور پر اس اگروال جاتی (قومیت) کے اندر تو صدفی صد گھر گھر یہی ماحول ملے گا۔ ہمارا تو رات دن کا واسطہ ہے، مطب، دوا خانہ گودام آپ جانتے ہیں سب بنیوں ہی کے محلّہ میں ہے اور علاج معالجے کا آئے دن کا واسطہ، پھر نکلتے بیٹھتے یوں بھی دیکھتے بھالتے رہتے ہیں۔ ہمیشہ سے اور پوست کندہ صورت حال ملتی رہتی ہے، ناکارہ ادھیڑ سیٹھانیاں، برتن چوکا کرنے اور جوٹھن اٹھانے والے نوخیز کہار چھوکروں کو کاڑھ کر اپنی راہ پر لگائے رہتی ہیں۔ چنانچہ گھر گھر کا چلن ہے کہ چکنا چپڑا ایک مسٹنڈا کہار سیٹھانی کا منظورِ نظر پایا جاتا ہے۔ اور بھیا میں تو ان اگروال بنیوں کے گھروں سے خوب واقف ہوں، چنانچہ ابھی ذرا سی جرح میں اس لڑکی سے سب اُگلوا لیا۔ ان بنیوں میں بچپن کی شادیوں کا عام رواج ہے اور مانی ہوئی بات ہے۔ دنیا بھر میں، عورت مرد سے پہلے بلوغت کو پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں یہ روزِ روشن کا راز ہے کہ ادھیڑ سیٹھانی سیٹھ جی کے کام کی نہیں رہتیں اور اُدھر سیٹھ جی سیٹھانی کو ان کے کہار کے لونڈے کے سپرد کر کے نابالغ بیٹے کی نوخیز بیوی پر ہنہ پھیری کر کے مزے کرتے ہیں اور سیٹھ و سیٹھانی جی دونوں ہی روگردانی کیے اپنے کام سے کام رکھتے

ہیں۔"

حکیم جی اپنی عادت، واصول کے منافی اس وقت پھکڑ پن سے بات کر رہے تھے۔ مجھے حیرت سی ہوئی تاہم میں نے محظوظ ہو کر کہا۔

"ارے یار۔۔۔ رہنے بھی دے بے کار بکواس، بہو تو ہر قوم و مذہب میں بیٹی کے برابر ہوتی ہے۔"

"بکواس میں کر رہا ہوں۔" حکیم جی نے پھر سلسلۂ کلام جاری کیا۔ "ابھی پچھلے سے پچھلے سال کی بات ہے، یہیں دہلی میں کل ہند اگروال کانفرنس ہوئی تھی جس نے اس بد چلنی کی بالکل ہی تصدیق کر دی، کوئی شبہ بھی باقی نہ رہا۔ اس کی روئداد تو اکثر اخباروں میں بالتفصیل چھپی تھی مگر عام لوگوں کو اور خاص طور پر ہم مسلمانوں کو اس سے کیا دلچسپی؟۔ سرخیاں بھی بغیر پڑھے اخبار کا ورق پلٹ دیتے ہیں۔ ملک بھر کے طول و عرض سے پوری اگروال برادری کے نمایندے سربرآوردہ سیٹھ اور ان کے لیڈر مہاشے جمع ہوئے تھے۔ ان کے اکثر زعماء نے بچپن کی شادیوں نے مخالفت میں ریزولیشن دیئے تھے اور اپنے موقف کی تائید میں اور باتوں کے علاوہ بیبا کی کے ساتھ اس قبیح عمل کا بھی حوالہ دیا تھا جس کو اپنی قومیت کے گھروں میں عام کیا تھا اور واشگاف لفظوں میں تشریح کی تھی۔ تقریباً اتنی ہی برہنہ گفتاری کے ساتھ جس طرح میں نے آپ سے بیان کیا تھا اور ستم یہ کہ بہت بڑا اکٹھ تھا۔ چھوٹے بڑے سبھی اگروال جمع تھے۔ کسی ایک نے بھی تردید کی جرأت نہ کی اور گریبانوں میں منہ ڈال کر رہ گئے، پسینے چھوٹ گئے۔ یہ گھر گھر کی لعنت ہے، چنانچہ تقریباً یہی صورت حال اس لڑکی نے اپنے گھر کی بھی بتلائی، اس کا بھائی چھوٹا ہے اور بھاوج جوان بتاتی تھی۔ خسر کا بہو سے تعلق ہے مگر اس گھر میں ایک ناپاک ترین بھید کی تھی جس کا ظہور اس لڑکی کے اس آدمی کے ساتھ بھاگ آنے کی شکل میں ہوا۔ وہ کہار اس کی ماں کا پرانا منظور نظر لونڈا تھا جو رات تم نے اس کے ساتھ دیکھا تھا۔ ایسے نوکر ایسی صورت میں زیادہ سے زیادہ تھوڑا بہت انعام، ورنہ سیٹھانی کی نگاہ کرم سے کھانا کپڑا کچھ اچھا پا جاتی ہیں اور رکھو کو چپکے رہتے ہیں، چھوڑ کر جایا نہیں کرتے۔ لیکن اس نمک حرام کے منصوبے لمبے تھے، اس نے بیٹی پر (لڑکی کی جانب بھووں سے اشارہ کرتے ہوئے) بچپن ہی سے ریاض شروع کر دیا اور چھیڑ چھاڑ کر آٹھوں نویں سال ہی میں بلوغت کو پہنچا دیا اور اس وقت سال بھر سے ماں

اور بیٹی دونوں سے تعلق تھا۔ لیے منصوبے کے تحت بیٹی پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے حظِ نفس کے بجائے صرف دولت کا لالچ مدِ نظر تھا۔ ادھر ماں نے بھانپ لیا۔ کہار کو نکال تو نہ سکتی تھی البتہ تھوڑی بہت دونوں ہی کو تادیب کی۔ ادھر یہ لڑکی شادی شدہ ہے۔ شاید پانچ ہی سال کی عمر میں بیاہ ہوگیا تھا لیکن گونے رخصتی کی مہورت نہ آئی تھی، پنڈت برہمن بلاکر اور ٹھونس ٹھانس کر سیٹھانی نے بے مہورت ہی مہورت نکلوانا چاہی، ادھر یہ لونڈیا بھی اس کہار پر مرنے لگی تھی، ساتھ ہی اس کہار نے یہ بھی پٹی پڑھادی کہ اس کا شوہر بچہ ہے اور کسی لائق نہیں ہے، اور اس کو اپنے منصوبہ کے مطابق ترکیب بتائی کہ ماں کے کمر بند میں سے تجوری کی کنجی چُرا کر زیور اور اشرفیاں نکال لے اور پنجاب بھاگ چلیں اور وہاں میں کوئی کاروبار کروں گا اور عیش کے ساتھ میاں بیوی بن کر زندگی گذاریں گے۔ عقل خام یا پختہ کیسی ہی سہی، جذبات انتہائی شدید، اور اس کہار کا دکھلایا ہوا ایک عمل یعنی گونے رخصتی کے بعد شوہر کا بچہ نابالغ ہونا جنسی محرومی کا اندیشہ اور اپنے ساتھ بھاگ چلنے میں ساری عمر عیش ہی عیش کا سراغ دکھایا۔ اور آپ جانیں صرّاف ساہوکاروں کے گھروں میں گرہٹ اور گروی ہر طرح کا طلائی زیور یوں بھی ڈھیر کے ڈھیر ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔ کہار نے رہنمائی کی اور لڑکی نے ہزار بارہ سو تولہ طلائی زیور اور اشرفیاں تجوری سے نکال کر گٹھری میں باندھا اور کہار کے ساتھ بھاگ آئی اور وہ مکّار اس کو چھوڑ کر اور بغل میں پوٹلی دبا کر پانی لینے کے بہانے کسی اسٹیشن پر اترا اور اس کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔"

داستان رنگین اور حیات زا تھی۔ حکیم جی سنجیدگی سے اتر کر ذکر العیش نصف العیش کے انداز میں اپنی نہیں دُوسروں کی گُذری بیتی بیان کر رہے تھے اور میرے کانوں میں بھی خواہ مخواہ رس پڑ رہا تھا، شاید ہم دونوں ہی کی عمروں کا تقاضا رہا ہو، معاً مجھے شبہ ہوا، اتنی ڈھیر ساری باتیں اس نے رات بھر میں حکیم جی کو کیوں بتادیں اور باتیں بھی گھر بھر کے راز، اور خود اپنے بھی سارے کرتُوت۔ میں نے کہا۔

"ہاں یار یہ تو سُن لی تمہاری کوک شاستر۔ پھر اب؟"

حکیم جی نے مصنوعی لاچاری سے کہا۔

"بھئی اس لڑکی کا دہلی تک کا ٹکٹ وہ نمک حرام برتھ پر چھوڑ گیا تھا اور خود نا معلوم کتنا دس سیر

پانچ سیر سونا لے کر نو دو گیارہ ہوا۔ میری آنکھ تو اس لڑکی کے رونے پر کھُلی۔ چلتی ریل میں سے مُنہ نکال نکال کر بھاگیرت، بھاگیرت پُکارتی تھی پھر روتی تھی پھر پُکارتی تھی، میری آنکھ کھلی تو میں نے اس نمک حرام کو غائب پایا۔ بھئی پہلے تو مَیں نے ڈرتے ڈرتے بات کی پھر سمجھایا کہ گاڑی چھوٹ گئی ہوگی اور وہ پانی بھرتا رہ گیا ہوگا۔ مگر اس کو پہلے ہی سے اندیشہ تھا اور سمجھے ہوئے تھی۔ اس نے بتا دیا کہ وہ یقیناً زیور لے کر فرار ہو گیا اور اب کبھی نہیں آئے گا۔ کیونکہ پانی لینے گیا تھا تو پوٹلی کیوں ساتھ لے گیا جس میں سونا تھا۔" حکیم جی نے گھونٹ لیا اور پھر درست ہو کر بولے۔ "اور ذرا تشفی دینے پر کھُل گئی کہ اس طرح بھاگ کر آئی ہے۔ میں نے تسلّی دی کہ تیرے باپ کے پاس پہنچادوں گا تو کانوں پر ہاتھ دھرتی ہے کہ اتنی رقم کے نقصان کے بعد باپ کے گھر میں گذارہ نہیں، اور سب جانتے ہیں کہ بنیے کو دولت، اولاد اور عزت بلکہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے اور یہ بات یہ لڑکی اور بھی اچھی طرح جانتی ہے۔"

میں نے بھی بات کا رُخ بدلا۔

"ہوں۔ حکیم جی وہ تو سب سمجھ گیا مگر یہ نہیں سمجھا کہ تم نے اس کو اتنا رام کیسے کر لیا کہ محرمِ راز ہو گئی یار۔ سالی نے تمہیں سب بتادیں۔"

حکیم جی "محرم راز" اور "رام" کے لفظوں پر چونکے اور بولے — "بس تشفی دی، گھبراؤ نہیں۔"

حکیم جی چہک سے رہے تھے اور شاید کچھ زیادہ ہی بول گئے تھے خوشی میں۔ میری پکڑ پر بغلیں سی جھانک گئے۔

ایک گہرے معنی والا سکوت ہو گیا اور میں نے گھُور کر اس لڑکی پر نگاہ کی تو مجھے پوشاک کی تبدیل ہونے کا احساس ہوا۔ شبہ گہرا ہوا، اور پھر حکیم جی کے چہرے کا جائزہ لیا، مشرقی افق کی سُرخی، سبزہ آغاز نرم نرم چھدری چھدری داڑھی کے نیچے گلابی رخساروں کو دمکا رہی تھی، سرخ سرخ نم ہونٹوں پر سنجیدگی کے بجائے مسلسل مسکراہٹ لہریں چڑھاتی رہی تھیں۔ گہری سوچ کی مظہر آنکھوں میں صبوحی کا سرور چھلک رہا تھا۔ تمام وجود پر رات کی کہانی کی آؤٹ لائن نمایاں تھی، اور شب کی بیتی کا افسانہ سنا رہا تھا، بے پایاں عیش اور آئندہ عیش ہی عیش کا مخصوص اطمینان تھا، میں نے بار بار ان دونوں پہ گہری نگاہیں ڈالیں جس کو حکیم جی نے سمجھ بھی لیا کہ تجسس میں ہے۔ بار بار مسرور نظریں جھک جھک گئیں، کسی کسی وقت کچھ

کہنے کے طور کا بھی بشرے سے سراغ ملا۔ پھر گومگو کا انداز نظر آیا۔ اِدھر شبہ یقین کی منزل کو چھو چھو کر تصور کی فسوں کاری میری رگ وپے میں سرور دوڑا دیتی۔

حکیم جی میرے ہم سفر تھے۔ بچپن کے ساتھی اور جوانی کے دوست تھے۔ میں سوتا رہا اور یہ۔۔۔۔ میرے انگ انگ میں گدگدی اور خلیہ خلیہ میں چل پڑ گئی۔ ذہن میں محرومی اور امید کی لہریں اُٹھنے لگیں۔

دہلی قریب آرہا تھا۔ ریل جمنا برج پر سے گذر رہی تھی میں نے حکیم جی سے بے معنیٰ سا سوال کیا۔ "تو پھر اب یار"۔

حکیم جی نے حکمت بھرا جواب دیا۔

"سوچوں گا، ابھی تو بہت وقت پڑا ہے۔ یہ میری مرضی پر ہے۔ پہلے تو یہاں کا کام نبٹا لوں، ابھی تو سوچنے کے لیے ہفتہ عشرہ پڑا ہے"۔

ان کے انداز میں انفرادی خود اعتمادی والا انداز نمایاں تھا۔ اور بات کرتے ہوئے ویسے تو سفر بھر جمع کا صیغہ "ہم" استعمال کرتے رہے تھے لیکن اس ضمن میں واحد کا صیغہ "میں" بول رہے تھے اور انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اجنبیت جیسا، اس معاملے کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھنے والا۔ حالاں کہ ہم دونوں رات ایک ہی دستر خوان پر ساتھ ساتھ کھانا کھا کر سوئے تھے۔

دہلی کے مضافاتی اسٹیشن شروع ہو گئے دُور دُور تک نکلے ہوئے سورج کی شفق نے منظر واضح کر دیئے۔ میں نے غور کر لیا تھا کہ لڑکی کے جسم پر شال تو وہی تھی رات والی لیکن لہنگے دوپٹے کے بجائے نیچے ریشمین ساڑھی بندھی ہوئی تھی، اور جو دوپٹہ رات لہنگے کے ساتھ اوڑھے ہوئے تھی اس میں وہ لہنگا اور کپڑے جو رات جسم پر تھے پوٹلی بنا کر باندھ لیے تھے، میرے تو لئے ذہنی اس وقت بڑے ذکی الحس ہو رہے تھے۔ یہ لباس کی تبدیلی، ماضی کی گذری اور حال او رمستقبل کے منصوبے کی نشاندہی کر رہی تھی۔ میرے اندر کبھی امید کی توس وقزح مچل پڑتی اور کبھی بیم کی گھٹائیں اُمڈ آتیں اور آن کی آن میں آرزوئیں مچل مچل کر وجود کے اندر سرور سا دوڑا دیتیں۔

میں نے اس کی جانب ہاتھ کے اشارے سے استفسار کیا "دہلی کا اسٹیشن آرہا ہے اب یہ

کہاں !"

حکیم جی نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے زیرِ لب کہا، "جہاں میں وہاں یہ، ابھی کہا نہیں کچھ سوچوں گا۔"

حکیم جی کے اس عُذرِ لنگ اور کائیاں پن پر مجھے تاؤ آگیا۔ اس وقت وہ بدلے ہوئے کوئی اور تھے، ساری عمر جو دیکھتا چلا آیا تھا، اس کی بجائے دُوسرا آدمی نظر آرہے تھے۔ میں نے پینترا سا بدلا "دیکھو جی حکیم جی، سیدھی سیدھی بات کرو، ہمیں نرا گدھا ہی نہ سمجھو۔ یہ آدھی رات تم نے لہنگا اتروا کر ساڑھی بندھوا دی، اگر ہم سو رہے تھے تو تم سمجھتے ہو کہ اب جاگنے پر ہم کچھ سمجھتے بھی نہیں ہیں۔"

اور حکیم جی میرے انداز پر جیسے ترکی بہ ترکی بولے۔

"ارے۔ جانے بھی دو، اللہ اللہ کرو! کسی مظلوم بھٹکے ہوئے سے ہمدردی کرنا ایسا گناہ ہے جو تم سوءِ ظن سے کام لو۔ توبہ توبہ!"

میں نے اُن کے مُنہ سے بات لے کر کہا۔

"اجی ہمدردی کرنا نہیں اپنی راہ پر لگانا کہو۔ بس رات بھر رہ لی تمہارے ساتھ اب ہمارے ساتھ رہے گی۔" اور حکیم جی یہ ساڑھی کھلے بندوں تمہاری شیروانی کے ساتھ کھپتی نہیں، یہ تو اس سُوٹ بُوٹ کے ساتھ میل کھاتی ہے۔" اور میں نے اپنی ٹائی کی ناٹ درست کی۔

"لاحول ولا قوت! حکیم جی کے مُنہ سے بے اختیار نکلا اور ڈھٹائی کے ساتھ درست ہو کر بولے۔ "یعنی آپ مجھے ڈھکے کھُلے لفظوں متہم کر رہے ہیں۔"

"جی ڈھکے کھُلے لفظوں میں نہیں واشگاف الفاظ میں گذارش احوال واقعی کر رہا ہوں جناب! یہ کوئی نبض، قارورہ نہیں ہے، جو ہم نہ سمجھ پائیں۔ یہ مرغی اب اکیلے اکیلے تو چٹ نہ کر سکو گے، ہم یوں آسانی سے ہضم نہ ہونے دیں گے۔" مگر حکیم جی کے تیور تو اور بھی زیادہ مضبوط ہو گئے۔ زہریلے انداز میں بولے "یعنی چہ خوش مان نہ مان، میں تیرا مہمان، کیا لوٹ پڑ گئی ہے۔" اور کہتے کہتے چہرہ ایسا ہو گیا جیسے ابھی ابھی کڑوے چرائتہ کے جوشاندے کا گھونٹ حلق سے اُتار کر ہونٹوں سے علاحدہ کیا۔ ہے، اور بڑبڑائے "کون آپ ہوتے ہیں اِس کے خصم"؟ اِین ؟

میں نے برجستہ کہا "لوٹ نہ ہوتی تو آپ کے ہاتھ کیسے آجاتی۔ اور میں خصم نہیں تو آپ بھی ابا

نہیں اس کے۔"

اور اس وقت حکیم جی کو اپنی جبلّت کے منافی تاؤ آگیا۔ "جائیے جائیے یہی سہی جو کرنا ہے کر لو ۔۔۔"

میں نے دھیمی آواز میں جیسے لفظ چن چن کر جواب دیا۔ " میرے عزیز مت سمجھنا کہ میدے کے حلوے کی طرح اس کو ہڑپ کر جاؤ گے۔ ابھی ابھی بڑے حکیم جی کو سو لفظوں کا ارجنٹ تار اڑا دوں گا کہ صاحب زادہ بلند اقبال دوائیں خریدنے کے بجائے لونڈیا بازی کے چکر میں ہیں۔ اور کل کی ٹرین سے بڑے حکیم جی یہیں دھرے ہوں گے اور تمہارے مُنہ پر حلف اُٹھا اُٹھا کر رات بھر کے کرتوت بیان کر دُوں گا، ساری عیاشی کرکری ہو جائے گی۔ میاں ہو کس لال باغ میں۔"

اور اُن کا رنگ یک دم فق ہو گیا اور اُن کی سراسیمگی کا اندازہ کر کے ضرب لگائی۔ " اور بچہ کسی خوابِ خرگوش میں نہ رہنا۔ یہ بھی کوئی اور وہ سمجھے ہو، جانتے ہو ڈھنڈورا یا ہوں، ڈھنڈورا، پلٹ کر سارے شہر میں گھر گھر مطعون کروں گا۔ دو کوڑی کی ہو جائے گی۔ مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہو گے، ساری حکمت نقاہت دھری رہ جائے گی۔"

حکیم جی میرے ہم عمر ہم مکتب سبھی کچھ تھے، مگر خواہ مخواہ یک طرفہ سنجیدگی کے خول میں سے میرے تایا ابا سے بڑھے ہوئے بزرگ بنے رہتے تھے، میں اُن کے چہرہ کے بدلتے ہوئے رنگوں کا اندازہ کر کے دھمکیوں کی باڑھ مار رہا تھا۔ چور کے پاؤں کتنے! خوف کے مارے پتہ پانی ہو گیا اور مجھ جیسے بے ڈھب بولنے اور اندھا دھند کر گذرنے والے آدمی سے بعید بھی نہ تھا ان سنگین دھمکیوں پر جیسے چھاتی پر گھونسہ اور پیٹ پر لات پڑی، اور قلا بازی کھا کے الٹے جا پڑے۔ ایٹم بم پر یک دم ہتھیار ڈال دیئے۔ چہرہ محبت و اپنائیت کے انداز میں لٹک گیا۔ پیار کے ساتھ بڑھ کر میری کلائی تھام لی اور اپنی جانب معانقہ کی قربت تک کھینچ لیا کہ پیٹ پیٹ کو اور سینہ کو سینہ چھونے لگا، بڑے رازدارانہ خلوص کے ساتھ کان پر ہونٹ لگا کر سرگوشی کی۔

" اماں یار تم تو یعنی سچ مچ خفا ہی ہو گئے۔ بھئی جب روزِ ازل سے دِل ملا ہوا ہے تو میرا تمہارا بٹا بھی کیا ہے، تم ہی لے جاؤ سالی کو جہاں چاہو رکھو، اگر واں تمہارے چچا کے ہاں گنجائش ہو تو واں ورنہ اختیار ہے جہاں چاہو لے جاؤ، ہم دو تین دن بعد میں سہی۔"

میں نے پُر امید انداز میں اُن کی جانب دیکھا اور آئندہ کے لائحہ عمل کے متعلق ان کی رائے لینا اور سوچنا چاہا انھوں نے کہا۔

"ہاں اتنی بات ہے یہ سمجھے رہنا کہ ابھی بہت بھڑکی ہوئی ہے، ساری رات ریاض کیا تو کہیں سویرا ہوتے بڑی مشکل سے۔" اور حکیم جی کی آنکھوں سے رس چھلک پڑا۔ "ویسے نری احمق گاؤدی ہے، اور بھئی یہ سونے کی چڑیا ابھی تک تو مٹھی میں ہے۔ ایسا تو نہیں کہ تمہارے ساتھ یُوں یکایک کچھ نامانوسیت محسوس کرے اور کسی کی بھی نہ ہو، ایں ہے نا؟" ہوں، غیر قوم، غیر مذہب، بنیے کی لونڈیا، پردیس کا موقع۔"

میں کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا۔ آہستہ سے کہا۔ "کیا؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ اس کی مرضی معلوم کرلیں، آدم زاد ہے، ربڑ کی گڑیا تو نہیں۔ ویسے تو میں نے اچھی طرح رام کر لیا ہے، سوچ سے بالکل عاری ہے اور ہکا بکا ہو رہی ہے۔ ہم بھی سوچتے ہیں، ہم نے کسی سالی کا قبالہ تو نہیں لکھایا ہے۔ بیٹھے بٹھائے ہماری مٹھی میں آپوں آپ اُڑ کر چلی آئی ہے۔ یہ دس پانچ دن عیش کر لیں پھر جائے جہنم میں سالی، ہم چپکے سے اپنا رستہ پکڑیں گے جب وہی حرام زادہ پیچھا کٹا کر بھاگ گیا جو عمر بھر کا منصوبہ بنا کر بھگا کے لایا تھا تو ہم رستہ چلتوں کی کیا ہے۔ ہے نا دوست"؟

حکیم جی کی بات اپنی جگہ پر قرینِ عقل تھی اور معاملہ ففٹی ففٹی پر طے ہو گیا۔ ذراسی بات وہ مرضی معلوم کرنے والی باقی رہ گئی، سو میں جانتا تھا کہ حکیم جی اس کے تابع مہمل ہو رہے ہیں۔ خلوص کے ساتھ کہا۔

"ہاں وہ مرضی والی بات بھی کر لو، راضی تو ہو ہی جائے گی۔"

حکیم جی کا رونگٹا رونگٹا گذری رات کا رنگین فسانہ کہہ رہا تھا، میں نے سب کچھ طے سمجھ کر سوال کیا۔

"تو پھر تم ٹھہرو گے کہاں؟ واں تو ممکن نہیں ان حکیم عطار کے یہاں شاید۔"

"ہاں واں تو نہیں ہو سکتا قیام اب اُن کے ساتھ، کہیں ہوٹل سرائے میں ٹھہرنا پڑے گا۔"

اور اس وقت حکیم جی کی مخصوص نگاہیں اُس لڑکی پر پڑیں۔ سب کچھ کہہ گئیں اور لفظ "ان" کے استعمال میں بڑی معنویت تھی اور اس کے میرے کان کھڑے ہوئے کہ حکیم جی پھر وعدہ سے پھر رہے ہیں اور

چھوڑنا نہیں چاہتے ... لیکن میں نے پھر سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا "یہ سوجھی خوب تمہیں۔ اب یہ تو ساڑھی ہر عورت کا لباس ہے ورنہ وہ تو ٹھیٹ بنیے والے لہنگے میں تھی ۔۔ دُور سے دکھائی پڑ جاتی ہے۔"

تو میرے مُنہ سے بات لے کر بولے "اجی میں نے اصرار کر کے غسل خانے میں جا کر کپڑے بدلنے پر آمادہ کیا۔"

میں نے کہا۔ "وہ تو میں سمجھ گیا، غسل خانہ ہی میں جا کر ہوا ہوگا، پھر میں تو بے خبر سو رہا تھا، بھلا اس کے کہنے کی ضرورت کیا تھی؟"

"خیر چھوڑو یار۔ ہوں، آں پھر یہ رائے قائم کرو ٹھہریں کہاں؟ اب بھی کسی ہوٹل سرائے میں بجز اس کے چارہ نہیں اور آپ کی قیام گاہ تو طے ہے۔ کون ہیں وہ چچا مرحوم، پنڈت کے کوچہ میں آپ کو اطلاع دوں گا واں۔"

"اور میرے پیٹ میں آگ کی گیندیں سی لڑھکنے لگیں۔ "جی نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" میں نے ٹھیک ٹھیک نصف کے شریک والے انداز میں کہا۔

"چہ خوش یعنی اسٹیشن پہنچ گئے اور ہنوز جا ر قیام کی نوعیت طے نہیں ہو پائی اور مجھے ٹرخا رہے ہیں چچا کے یہاں کو۔"

اور مجرم ضمیر حکیم جی بغلیں جھانک گئے۔ لیکن وہ تو بات ہی ایسی تھی کہ چُست و درست ہونا ہی پڑا۔ نبض قارورہ دیکھ کر جیسے آر پار نگاہ ڈال کر سب کچھ سمجھ لینے والی نظروں میں ایک مرتبہ پھر جارحانہ کیفیت پیدا ہوئی مگر میری بھوکی آنکھوں سے دوچار ہوتے ہی مصلحت نے دامن پکڑا اور کیفیت پر قابو پا لیا، ایک نوعیت کا خوف و انفعال سا ابھرا جیسے کہہ رہی ہوں "کیسی بُری گھڑی تھی جب اس کم بخت کا ساتھ ہوا تھا۔ کباب میں ہڈی۔ ایک گھونٹ سا لے کر سنبھلے۔ حلق میں پھنسی ہوئی آواز درست کر کے منت کے ساتھ بولے "بھئی چودھری صاحب، یار، وہ بات تو طے رہی اور ابھی تو بہت وقت پڑا ہے۔ آپ صبر سے کام لیں۔ بھلا دیکھو تو یہ بھی کوئی بات ہوئی، میں کہتا ہوں کہ آپ کوچۂ پنڈت میں ان کے مکان کا پتہ سمجھا دیں۔ میں خود پہنچوں گا۔ ہے نا؟

حکیم جی کی اس حرکت پر غصّہ تو مجھے بہت آیا کہ ابھی ابھی طے کر چکے ہیں کہ پہلے میرے ...

ساتھ رہے گی اور اب بات سے پھر رہے ہیں، مگر میں پی گیا اور انداز بدل کر کہا۔

"تو پھر پلیٹ فارم تو چھوڑو۔ لوگ یہ پنچایت دیکھ کر گھورتے ہیں خامخواہ۔ وہاں تانگہ اسٹینڈ کے پیچھے علاحدگی میں کُھل کر بات ہوگی، ہوں ــــ صورتِ حال کو اچھی طرح ٹھونک بجاکر پروگرام بنائیں گے۔"

پل پر چڑھ کر ہم لوگ باہر پہنچے۔ آگے آگے میں، میرے پیچھے حکیم جی اور ان کے پیچھے وہ الگ تھلگ سی۔ تانگہ اسٹینڈ کے پچھواڑے لبید اور پیشاب کے شامّہ شکن تھپیڑوں میں معاملت ہوئی۔ ویسے حکیم جی اس وقت راہِ راست پر آچکے تھے لیکن ڈرامہ کے حفظ کیے ہوئے مکالموں کے انداز میں جو سوال جواب ہوئے ان سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ حکیم جی نے صبح کو پیش آنے والی صورتِ حال کے قوی اندیشہ میں اس کو اچھی طرح پڑھ کر تیار کر رکھا تھا۔ "دیکھو جی بھگونتی میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہ صاحب میرے بچپن کے دوست اور بڑے اچھے آدمی ہیں اور ادھر اب مجھے کچھ ضروری کام سے دہلی سے باہر بھی جانا پڑے گا لہٰذا تین دن تمہیں ان کے ساتھ ٹھہرنا پڑے گا، سمجھیں۔" اور وہ تو اچھل پڑی، آہوئے رم دیدہ۔ گرے ہاونڈوں کا لتاڑا ہوا خرگوش لومڑی جیسے، اور ظالم کم بخت مجھ سے اور پرے کو ہوگئی ــــ

"وہ کوئی بات نہیں ہے یہ بھی کوئی غیر نہیں۔" حکیم جی نے کہا لیکن وہ تو حکیم جی کی پشت سے آڑ لے کر جا کھڑی ہوئی۔ حکیم جی نے جیسے کسی گھٹیا تھیٹر کے ایکٹر کی طرح موٹے بے کار مکالمے کے الفاظ نکالے جو اپنی نوعیت اور لہجہ کے اعتبار سے صاف ظاہر تھے کہ مجھ کو سنانے کے لیے اور اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے بول رہے ہیں "ارے میں کہتا ہوں بھگونتی، ایک ہی بات جو میں وہ یہ، ہم دو دو نہیں، تم بے دھڑک ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ چوتھے، آس خیر نہیں چوتھے دن نہیں، پرسوں ہی پلٹ کر آجاؤں گا۔" "نہیں نہیں، نہیں" اور بچوں کی طرح بسور کر رونے لگی۔ "ان کے ساتھ نہیں" اور پھر آہستہ سے ایک چیخ نکالی۔

حکیم جی بولے "مان جاؤ بھگونتی، مجھے ضروری کام سے دو دن کے لیے باہر جانا ہے۔ تم جب تک ان کے ساتھ رہ لو، میرے ساتھ کہاں ماری ماری پھروگی۔"

"یہ کون ہے؟۔ تم نے تو کہا تھا کہ دِلّی میں ہفتہ اٹھوارے بھر کا کام ہے، پھر بات سب ٹھیک

کردو گے۔!" اور پھر سرک کر مجھ سے آرڈلیتی حکیم جی کی پشت سے جا ملنے کی حد تک قریب ہو گئی۔ حکیم جی نے خوشی میں بھرائی آواز میں پھر نصیحت کی۔

" دیکھ بھگونتی ضد نہیں کرتے، اس وقت ضرورت ہے کہ تم زیادہ نہیں جاؤ پرسوں تک ہی ان کے ساتھ رہ لو، میں پرسوں شام تک لوٹ آؤں گا۔"

"نہیں نہیں ان کے ساتھ نہیں۔ تمہارے۔"

میرا ماتھا ٹھنکا، حکیم جی مدت گھٹاتے چلے جا رہے ہیں، مگر وہ کم بخت جو بولی اس کا کیا جواب: سرے سے نخلِ آرزو کی جڑ ہی کاٹ رہی تھی۔ اور جب اس کے پیہم انکار پر جھینپ کر میں نے نظریں اٹھائیں تو حکیم جی کی آنکھ میں فتح اور خوشی کے مرغولے ناچ رہے تھے، ہونٹوں پر حقارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اور اس تمام نے مجھے ناگ کی طرح ڈس لیا چٹیل بندر کی طرح منہ بناتا دو قدم پیچھے ہٹا اور بڑبڑایا۔ "چھوڑو یار حکیم جی، ہم کب کسی سالی حرام زادی کے پیر پڑتے ہیں، جائے جہنم میں سالی، تمہیں کو مبارک" اور زیرِ لب بڑبڑایا "ایسی گھول کر پلائی ہے۔ اترتی ہی نہیں اور تلخی کے ساتھ منہ پھیر لیا اور اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے حکیم جی نے حقارت کے ساتھ قہقہہ مار کر میری کمر پہ لات رسید کی ہے۔

مگر میرے بڑبڑانے پر حکیم جی کا خوف و کمپلیکس بولا۔

" دیکھو یار پھر وہی بات کہی نا تم نے، 'ہو' ! تمہیں کو مبارک! ایں اور دیکھ بھی رہے ہو کہ کیا حال ہے، مگر پھر بھی مجھ پر الزام ہے۔"

" یہ میں نے کب کہا یار، چھوڑو یہ نحس چکر! یہ نحوست تمہیں پر چڑھی رہے، مبارک ہو منحوس" میں نے ایک لمبی تھرتھراتی سانس لے کر منہ پر رومال پھیرا۔ اور پالی کے پٹے ہوئے بٹیر کی طرح چل پڑا۔ حکیم جی سے آنکھیں چار نہ کر سکا۔ دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ . . جھنجھل کا یہ عالم اپنی کلائیاں آپ بھنبھوڑنے کو دانت بڑھتے تھے، ذلت اور شکست کے غیض کا دھارا گہرے غم کی جانب مڑ رہا تھا اور ستم یہ کہ حکیم جی میری حالت کو کسی کھلے بیمار کی طرح مجھ سے کچھ کم نہ پہچان رہے تھے۔ چند ساعت سناٹا رہا جیسے ایک دوسرے کے ساتھ کسی بھی مثبت یا منفی احساس کی ڈور کٹتی رہی۔ حکیم جی نے ویسے تو مجھے بڑی ذلت آمیز شکست دی تھی لیکن شروع ہی میں میں نے اتنی زبردست دھمکی

دے دی تھی کہ موصوف کا ڈر کے مارے پتہ پانی ہو رہا تھا۔ بڑے حکیم جی کے نام نو آنہ کے سیدھے سادے تار میں ۔۔۔ سارا مزہ کرکرا ہو جاتا تھا بلکہ اور اُلٹی آفت گلے پڑتی تھی پھر میری عادت کو خوب پہچانتے تھے کہ اگر شہر میں مطعون کرنے پر اتر آیا تو پشتوں کی ساکھ مٹی میں مل جائے گی ۔۔۔

مجھے علیحدہ ایک جانب کو لے گئے اور بولے "یار تم ناامید نہ ہونا" اور پھر کچھ منفعل انداز میں بولے ۔ "بھئی معافی خواہ ہوں ۔۔۔ مگر یہ سالی اس وقت اگر دِگر رہی ہے اور بھئی تمہاری حالت بھی اپنی جگہ پر حق بجانب ہی ہے۔ رات وہ، آں، ہمارا ساتھ رہا۔ اور جب ہم تم ہمیشہ سے ساتھ ہی ساتھ چلے آ رہے ہیں تو اس میں بھی قاعدہ کی رو سے آج کا دن تمہارا ہونا چاہیے تھا۔ بُردند و برادرانہ قسمت کردند ۔۔۔ اب میں زیادہ سے زیادہ ایک دن اور دو راتیں تم سے طلب کرتا ہوں، اور اس کو راہ راست پر لے آؤں گا، اب آج کا دن تو گیا ہی سمجھو، پرسوں صبح تک تم ہو گے اور یہ مالزادی۔ ورنہ اگر ہوئی تو میں اس سے پہلے ہی تیار کر کے تمہارے حوالے کر دوں گا، بھائی دیکھو تم اس وقت ناراض ہو گئے مگر میں کیا کروں دوست! ہم ان لوگوں میں نہیں ہیں جو تنہا خور خود غرض ہوتے ہیں ۔۔۔ دیکھو میں نے تو ابھی بہتیری پٹائی، تمہارے لیے بھی، مگر بھیّا بڑی کھائی کھیلی ہے، اس جاکی کہار چابک سوار کی گاڑی ۔ ۔ ۔ نکالی، ہم تم دونوں سے پرلی طرف۔ رات بھر ریاض کیا، پھر ایک آنکھ ساون تھی ایک بھادوں روئے ہی چلی جا رہی تھی اپنے اس بد قوم، کالے بھینسے، آبنوس کے کندے، آشنا کہار کو یاد کر کے جو رقم کی پوٹ دبا کر چپکے سے اکیلا چھوڑ کے کسی دیہاتی اسٹیشن پر نو دو ہوا، چلتی ریل سے پھاند ہی پڑتی تھی، بدحواس کھڑکی میں سے سر نکال نکال پیار بھری آواز نکالتی تھی۔"

حکیم جی نے ایک شیریں گھونٹ سا لیا، چہرہ کی مخصوص شگفتگی میں ایک ذرا کے ذرا سنجیدگی کی جھانک ابھری، میرے قریب کھسک کر کان کے اوپر ہونٹ رکھے ہوئے بولے ۔

"یار مجھے ویسے عملی تجربہ تو ہے نہیں، یوں سمجھ لو کہ کبھی کبھی مریضائیں آتی رہتی ہیں، بیاہیاں، کنواریاں سبھی، مجھے رات ایسا لگا کہ دوسرا تیسرا مہینہ ہے۔ حمل، ہوں" اور حکیم جی ذرا سوچ کر بولے ۔ "میرا اندازہ ہے کہ یہ بھاگنے کا سلسلہ بھی اسی لیے ہوا، وہ کہار کم بخت ماں کا بھی تھا اور اس

حرام زادی بیٹی کا بھی اور نہ اس کا ٹھانہ اس کا، ماں کا تھا اور ماں تو کچی گولیوں کی کھیلی نہ تھی، اس لونڈیا کے کچی عقل کے ذریعہ سبز باغ دکھلا کر تجوری میں سے سونا نکلوا لیا اور اس کو کیا سونے کی پوٹلی کو لے کر فرار ہوا گھر سے ۔ اور وہی ہوا، چھوڑ کر چلا گیا۔ ویسے اس نے سب بات بتا دی مگر پہلی بات یہ ہے کہ بہت کم عمر ہے، میرا اندازہ ہے کہ ابھی بشکل گیارہ بارہ کی۔ اور اس پختہ عمر کہار نے پچھلے دو تین سال میں ہاتھ پھیر پھیر کر جوان کر لیا اور میں سمجھتا ہوں صرف دولت مال ہی اس کا مطمحِ نظر تھا، چنانچہ اپنا کام بنا کر سونے کی پوٹ دبائے رات فرار ہو گیا۔ میرا تو اندازہ ہے کہ اک دو سال سے منصوبہ بنا کر کہار نے صرف یہ مال نکلوانے کے لیے اس پر ہاتھ صاف کیا اور اپنی راہ پر لگا لیا ۔ یہ صرف جنگ زرگری کا معاملہ ہے اور رات کسی دیہاتی اسٹیشن پر سونے کی پوٹلی دبائے اتر گیا اور اس کو ہمارے سر منڈھ گیا۔" اور حکیم جی نے جیسے رات کے کھائے ہوئے شہد بھرے ہونٹ چاٹے، چَپ چَپ چَپ، اور جیسے ایک بھرپور میٹھا گھونٹ بھرا، اور پھر گھی شکر بھرے رندھے ہوئے حلق سے بات جاری رکھی ۔" اور بھیّا تسمیہ میں نے تو تمہارے لیے اسی وقت ڈورے ڈالنے شروع کر دیے تھے، تم تو خفا ہو گئے۔ دیکھا نہیں کسی طرح راضی نہیں ہوتی تمہارے لیے آہوئے رم دیدہ ہے گلہ سے بچھڑی، جوڑے سے چھوٹی اب رات جوڑا ملا تو یکایک کیسے چھوڑ دے !" حکیم جی کا چہرہ جبڑہ کلہ تیور چڑھ گئے سینہ تن گیا؛ اور جیسے مجھے دھکّا دیا، میں اُلٹا جا پڑا۔

ذکرالعیش نصف العیش نہیں ۔۔ رات گئی رات کی بات گئی نہیں تھی رات سے زیادہ رنگینیوں خیر گیبوں، نشوں بھرا دن طلوع ہو رہا تھا، اور لا متناہی سلسلۂ عیش سامنے تھا، چوتھی کی دلہن پہلو میں جو تھی، اور رنگین تابناک دن ہی دن، اور رنگین تر راتیں ہی راتیں، جتنی شب براتیں چاہو اتنی شب براتیں اور جتنے روز عید چاہو اتنے روز عید، اور مجھے سب اچھی طرح یاد آرہا تھا مگر مفر اس میں تھا کہ ان کے رحم و کرم پر رہوں، ان کا کام بننے دینے میں ہی اپنا کام بننے کی امید ہو سکتی تھی، اور انھیں کی جود و بخشش سے یہ چڑیا ان کی مٹھی سے اپنی مٹھی میں آسکتی تھی، ہم ایک دوسرے کو ہمیشہ سے اچھی طرح پہچانے ہوئے تھے اور اس وقت اور بھی اچھی طرح سمجھ رہے تھے اور دونوں ہی کے پاس بجز اس کے مفر نہ تھا کہ ایک دوسرے کو تسلیم کرتے، برداشت کرتے چلے جائیں، خوف اور

لالچ کا عجیب النوع سمجھوتہ تھا، ویسے وہ بھی میرے داخلی جذبات کو خوب سمجھ رہے تھے، اور وہ تو حکیم بھی تھے پاگل مجنوں کے تیور تو رستہ چلتا عامی پہچان لیتا ہے اور مجھے اچھی طرح پہچانتے تھے کہ دیہاتی مضافاتی آدمی ہے، دھمکی بڑی کراری دے چکا ہے، ابھی اگر ذرا برافروختہ ہوا تو کر گذرے گا۔ منہ زور گھوڑے کی طرح میری راسیں صحیح رکھے ہوئے اور پچکار رہے تھے، اور اور یہ بات نہیں میں بھی سب کچھ سمجھ رہا تھا، مگر بجز اس کے چارہ بھی نہیں تھا۔ "بس موافق قول مرداں جان دارد، کل ہی شام ورنہ زیادہ سے زیادہ پرسوں کسی وقت تم ہو گے اور یہ۔ اور ابھی تو یہاں ہفتہ پندرھواڑے قیام کرنا ہے۔ راہِ راست پر لے ہی آؤں گا، اور ہم نے کسی سالی اقبالہ کا نکاح نامہ تو بھرا نہیں ہے۔" حکیم جی نے میرے بشرہ سے میرے داخلی جذبات کا اندازہ کرتے ہوئے پچکارا سا دیا۔ جیسے منہ زور گھوڑے کے دانتوں میں دبی ہوئی لگام کھلوانے کے لیے گڑ کی ڈیلی دیتے ہیں" اور حکیم جی موج میں آگئے اور سلسلۂ کلام نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں جاری رکھا۔ "بھائی ہم رستہ چلتے مسافر، ریل کی گدگدی برتھ پر نہ بیٹھے اسی پر سہی۔"

کھی کھی کھی، کھس کھس کھس، حکیم جی نہایت کلاسک ہو رہے تھے اور مطب کے بجائے کوٹھے کی زبان بول رہے تھے اور حکیم کی طرح نہیں تماشبین رالی ہنسی ہنس رہے تھے، اور میری چھاتی پر مونگ دل رہے تھے۔ وہ بے انتہا بشاش تھے، رواں رواں خوشی میں ابھرا جا رہا تھا، پانچوں گھی میں تھیں جیسے میری شکست بھی ان کے لیے اس وقت باعث طمانیت تھی، اور میرے لیے امید کا سہارا صرف اس صیغہ میں تھا جو وہ لفظ "ہم" کا استعمال کر کے جمع کا بول رہے تھے جس کی معنویت اور شرح آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں میرا مقدر ہو سکتی تھی اور حکیم جی کامیابی میں کھرائی سی آواز میں بولتے رہے۔

"اجی ہم کیوں جی سے لگا کر غم پالیں اور اپنا چند روز کا عیش منغص کریں، ہاں پردیس میں بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا، آسمان سے گری کھجور میں اٹکی آپوں آپ ہماری گود میں آ گری، جب وہ اس کا آشنا ہی سالا اس کا دھگڑ بیٹھ دکھلا گیا جو جنم کرم کا سبز باغ دکھلا کر بھگا کے لایا تھا تو ہم کون ہوتے ہیں سالی کے خصم، اپنا رستہ پکڑیں گے۔" حکیم جی میرے کان کے قریب مسلسل

بڑبڑا رہے تھے اور تمام وجود پر معجون فلک سیر والی کیفیت اور خواص کا انداز تھا۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا تو آنکھوں میں پیہم سرور کے مرغولے ناچ رہے تھے، اور جب انھوں نے میرے چہرے پر نظر کی تو یقیناً انھیں اپنی مجرب خاص گولی چرائتہ تلخ کے گھونٹ سے اتارتا نظر آتا، شاید کچھ سٹ پٹا گئے اور سوال کا ڈھیلا سا مارا۔

"ہاں یار تم کہاں ٹھہرو گے، اپنے انھیں چچا مرحوم کے مکان پر کوچہ پنڈی ہیں"۔

اور میرے پیٹ سے وہی لڑائی والا طرز تخاطب جواب میں ابھرا۔" واہ بے حکیما واہ!! پھر وہی!"

اور ان کے اس بے تکے سوال پر اتنی دیر کے سارے وعدوں پر پانی پھرتا دکھائی دیا۔

"لاحول ولا قوۃ! کیا بول رہے ہو یار، بھنگ پی رکھی ہے، ساری زلیخا پڑھ گئے اور یہ نہ معلوم ہوا کہ زلیخا مرد تھی کہ عورت تھا۔ کیا مجھے اتنی دیر سے احمق بنا رہے ہو، بار بار مرغی کی ایک ٹانگ، یعنی کیا یہ ممکن ہے کہ اس صورت حال میں ہم کسی دوست کے یہاں ٹھہریں، میں چچا مرحوم کے یہاں اور تم اس تام جھام کے ساتھ اپنے ان دلاّل حکیم صادق حسین کے یہاں!

اور مجھے اندازہ ہوا کہ اتنی لمبی بات کر گئے لیکن اپنی جائے قیام نہ بتائی، کہیں لومڑی کی سی ڈھچی تو نہیں دے رہے ہیں۔

وہ بولے ـــ" وہ میں، میں تو احمد بائی کی سرائے کا رُخ کرنے کی سوچ رہا ہوں کسی علیحدہ کنارے والے گوشہ محل میں ٹھہروں گا تمہاری کیا رائے ہے؟"۔

"ہاں، ہاں سُنا ہے وہ احمد بائی کی سرائے ایسے موقعوں پر موقع کی جگہ دیتی ہے"۔ میں نے جواب دیا ـــ

اور حکیم جی کی آنکھوں سے سرشاری چھلک پڑی، وہ احمد بائی کی سرائے کے کسی گوشہ محل کی خلوت میں جا پہنچے اور ایک نگاہ لڑکی پر ڈالی، تمام وجود گنگناسا پڑا۔ اور پھر جب مخمور آنکھیں گھوم پھر کر مجھ پر پڑیں تو شاید رقابت بار قابت نگاہیں ٹکرائیں۔ میرے چہرے پر رنگ اتر چڑھ رہے تھے۔ اور مجھے ان کے چہرہ پر گلہریاں سی دوڑتی دکھائی دیں۔ اور ہم دونوں ہی نے اپنے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا ـــ

اور ہفتہ عشرہ تو لامحدود مدت ہے ایسی چند ساعتیں عیشِ دوام و زندگی تمام کی منزلیں چھوتی ہیں، اور یہاں تو لا متناہی مدت سامنے تھی، میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور چہرہ پر بار بار ہاتھ پھیرنے لگا، جیسے پڑتی ہوئی پیزاروں کی چوٹیں سہلا رہا ہوں، جوتیوں کی گرد جھاڑ رہا ہوں، رقیب روسیاہ کی خوشامد اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ پیٹ کی گہرائیوں سے ایک محسور گرم گرم غبارہ سا اٹھا، اور حلق تک پہنچتے پہنچتے سرد ہو گیا، ہونٹوں سے ٹھنڈی سسکی بن کر نکل گیا۔ کیا ہی عجیب سمجھوتہ، میں بل کھا کر رہ گیا اور اندر ہی اندر پیچ و تاب کھانے لگا۔ اپنا اپنا مقدر۔"

آہستہ آہستہ وہ دونوں ذرا فاصلہ سے آگے پیچھے اور میں کبھی دائیں بائیں اور کبھی پیچھے پیچھے کبھی آگے آگے سنتا اور کنکھیوں سے اس کو گھورتا پلیٹ فارم پار کر کے اور پل چڑھ اتر کر اسٹیشن سے باہر آ گئے۔ حکیم جی ایک تانگے میں خود بیٹھے اور دوسرے میں احتیاط کے زیرِ نظر پچھلی سیٹ پر اس کو بٹھایا اور دونوں تانگے آگے پیچھے چل پڑے۔ میرے تانگے والے نے ایک غلیظ سی گالی دیتے ہوئے گھوڑے کو کوڑا رسید کیا، وہ چابک پہ چابک مارتا جاتا اور طنز کرتا جاتا عجیب عجیب گالیاں اخذ کرتا جاتا اور میرے اندر جو جذبات تھے ان پر تیل چھڑکتا جاتا، اندر بار بار شعلے سے بھڑک بھڑک اٹھتے، رقیب روسیاہ سے ٹھنی ہی رہتی ہے۔ آج شاید اس سلسلہ میں ہابیل قابیل کے مجادلہ کے بعد پہلا تجربہ تھا کہ میں ریشہ خطمی خوشامد میں پیچھے پیچھے تھا . . . . . . اور ہابیل قابیل میں سمجھوتہ ہو گیا۔

پہلے احمد بائی کی سرائے آئی، حکیم جی نے تانگا پھاٹک سے کچھ فاصلہ پر ادھر ہی رکوا دیا۔ اپنا سامان جو مختصر سا تھا فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔ اس کے بعد میرے تانگے کے قریب آئے اور سرگوشی کے انداز میں بولے۔

"بھئی پردیس کا موقع ہے، مجھے اپنی یہ خریداری والی رقم اپنے پاس رکھتے ہوئے خلاف احتیاط معلوم ہوتا ہے، آیا تھا حکیم صادق حسین کے یہاں ٹھہرنے کے ارادہ سے، یہ تم اپنے پاس رکھ لو، میری امانت ہے نا؟ بس دو تین روز کی بات ہے،" اور پھر مسکراتے ہوئے بولے "یہ رقم اب تمہاری امانت کے طور پر میری تحویل میں رہے گی۔" اور آنکھ مارتے ہوئے لڑکی کی جانب اشارہ کیا اور جیسے

بات پکی ہوگئی۔ انھوں نے جیب سے بٹوا نکال کر میری جانب بڑھایا۔ چاہو تو گن لو، سو، سو، والے دس ہیں۔"

میں کچھ ہچکچایا پھر حکیم جی کے چہرے کا جائزہ لیا، رات کے ڈرامہ والے اسٹیج کا تصوّر آنکھوں میں تھا۔ اور جیسے مجھ پر منعکس ہوگیا۔ وہ جلدی میں تھے ادھر لپک گئے چلتے چلتے بولے پچاس روپے میں نے رہنے دیئے ہیں خرچ کے خیال سے۔ انتظار کرنا، اطمینان رکھنا، بر وقت پہنچوں گا۔" حکیم جی سرائے کے پھاٹک میں داخل ہوئے اور میرا تانگا ہوٹل کی سمت بڑھا۔ میں میں بھی تو اکیلا ہی ہوں گا اور یہ پرائی رقم اور سر بندھ گئی۔ ہاں، مگر امید قوی تر ہوگئی۔ دو تین روز کے اندر اندر میرے احمد بائی کی سرائے میں منتقل ہو جانے کی مزید ضمانت اور یقین ہوگیا۔ حکیم جی کی امانت میرے پاس ہے۔ اب بہر صورت لینے آئیں گے ہی۔ زیادہ سے زیادہ پرسوں تک کی بات ہے پھر تو راوی عیش ہی عیش لکھتا ہے .....

تمام رات سفر کی تکان اور نیند پوری نہ ہونے کی ہڑکل کے باوجود ہوٹل کے کمرے میں بستر کے اوپر مجھے کل نہ پڑی، جیسے میرا رونگٹا رونگٹا گنگنا رہا تھا، کانوں میں ہلکا ہلکا ارغنون بج رہا تھا۔ سانس کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر جلترنگ کی آواز سنائی پڑتی۔ خواہ مخواہ ناک میں خوشبوؤں کے بھبکے پہنچتے۔ اک ذرا آنکھیں میچتا تو رنگین مرغولے ناچتے دکھائی دیتے۔ پھلجھڑیاں سی چھٹتیں، اسی کیفیت میں سہ پہر ہوگئی تو یوں ہی ذرا رہنے سہنے دیکھنے کو احمد بائی کی سرائے پہنچا کمرہ مقفل پایا۔ ایں یہ آج کہاں سرک گئے، تمام رات کے مارے دہاڑے، میں نے دل میں کہا اور میں نے غور کیا کہ حکیم جی نے قیام کے لیے گوشہ محل بڑا موقع کا دیکھ بھال کر انتخاب کیا ہے، اس کا دروازہ ایسی جگہ واقع ہے کہ صرف اسی کا مسافر جائے تو دروازہ کا سامنا ہوتا ہے، دروازہ بند پا کر الٹے پاؤں واپس آیا، اپنے ہوٹل کے کمرے تک سوچتا ہوا کہ یہ دونوں آج کدھر گئے۔ یہ تو آرام اور عیش کرنے کا مخصوص اور پہلا دن تھا۔ مغرب کے قریب پھر اتر کر سرائے پہنچا، حکیم جی کا دروازہ اب بھی بدستور مقفل تھا۔ "ایں ابھی تک نہیں پلٹے! کہاں گئے"!! واپس آکر اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ گیا اور یہ معمہ حل کرنے لگا اور جب کسی نتیجہ پر نہ پہنچا تو دل ہی دل میں سمجھوتہ کیا، بہر حال ابھی دو دن تو طے شدہ دھرم کے حکیم جی کے ہیں، تمہیں حق کیا پہنچتا ہے کہ اس عرصہ میں خواہ مخواہ پر چول کرو۔ کہیں گئے ہوں گے، تمہارے

ان کے درمیان معاہدہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ پرسوں شام وہ تمہارے خالی بستر پر آلیٹیں گے اور تم..... تم ان کے بھرے بستر پر دادِ عیش دو گے ـ پھر یہ بچکانہ اضطراب چہ معنی دارد!ـ میں نے اپنے کپڑے اتارے اور بستر پر دراز ہو گیا۔ اونی چادر اوپر کھینچ لی، نرم نرم تکیہ میں چہرہ اور سر دبا لیا، اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر جسم تو کارونیشن ہوٹل کے کمرہ نمبر تین میں پڑا تھا لیکن روح حکیم جی کے گوش محل نمبر تیرہ کے دروازہ پر تڑپ رہی تھی۔ اس مخصوص قیام گاہ کی جاء وقوع پوری سرائے میں کتنی علیحدہ کو ہے۔ سامنے والے پہلے کمرے کے دروازہ پر چھوٹا سا صحن، یا گھونچ ہی کہہ لیجیے۔ خلوت پیش دروازہ ہی سے شروع ہو جاتی تھی، حکیم جی ہے تو بے وقوف سا آدمی لیکن یہ گوش محل اچھی طرح ٹھونک بجا کر پسند کیا۔ اندر شاید تین کمرے ہیں۔ اور تصور کی فسوں کاری میں میں اندر کے خیال سے رنگین امیدوں میں زیر و زبر ہونے لگا۔ آج تو پہلا دن اور پرسوں شام تک کا حساب گھنٹوں میں تقسیم کرنے لگا۔ پھر بڑے ہی بڑے گھنٹوں کے منٹ بنائے۔ اس کے لیے بار بار گھڑی تکیہ کے نیچے سے اٹھا اٹھا کر دیکھی، پھر اس بچکانہ حرکت پر خود کو دل ہی دل میں قائل معقول کرنے لگا۔ تمہیں اس وقت آرام سے سو جانا چاہیئے؛ حسبِ قرار داد تمہیں ابھی بہتر گھنٹے اور انتظار کرنا ہے۔ پھر کہیں جا کر ایجاب و قبول ہو گا اور سفر سے لے کر اس کمرہ تک کی ساری بیتی یاد کر رہا تھا۔ اتنے میں ہوٹل کا بیرا مینو کارڈ لے آیا۔ میں نے بغیر کارڈ دیکھے یوں ہی واپس کر دیا اور کہا لے آؤ جو کچھ ہے اور چند منٹ میں وہ کھانوں کا بھرا ہوا خوان لے کر آیا اور جب ناک میں خوشبو گئی تو یاد آیا کہ آج دوپہر کے کھانے کی سُدھ بُدھ ہی نہ رہی، صبح کا ناشتہ کیے ہوئے ہوں.....!

جلدی جلدی کھانا کھایا، کچھ دیر برآمدہ میں ٹہلتا رہا، قریب ۹ بجے پتلون قمیص سوئٹر پہن کر پھر بلاکشانِ محبت بکوئے یار روند، احمد بائی کی سرائے پہنچا، بڑی حیرت ہوئی۔ حکیم جی اب بھی غائب تھے تالا بند تھا۔ ہوٹل واپس پہنچ کر بستر پر دراز ہو گیا، آج کا دن تو گیا سمجھو اور کل کا دن کل کی رات، اور بس پرسوں صبح ہی جا دھمکوں گا۔ اندیشہ ہو رہا تھا کہ حکیم جی ڈنڈی نہ مار جائیں ایک دن کی اور۔ مجھے بھلا ابھی لینا بھی کیا ہے۔ وہ بھی آج یوں مفت میں آواگون کرتا رہا کہ ذرا دیکھیں حکیم جی کے کیسے.....

عیش ہو رہے ــــ اونھ ــــ چھوڑو بھی ــــ کمل اوڑھ لیا اور آنکھیں بند کیں تو اندازہ ہوا کہ شاید دہلی میں سردی چمک اٹھی ہے۔ جاڑا لگ رہا تھا۔ اور جتنا کمل زیادہ لپٹتا سردی زیادہ ہی لگی۔ جیسے رونگٹے

رونگٹے ٹھنڈ کے مرغولے اٹھ اٹھ کر آ رہے تھے۔ کمّل کے ساتھ میں نے اونی چادر اور ملائی، اب جو لیٹا تو ہلکی ہلکی کپکپی کی ہلوریں سی اٹھتی محسوس ہوئیں۔ تکیے بھی ٹھنڈے ہو گئے۔ میں نے ایک پروں کا تکیہ گھٹنوں سے لے کر چھاتی تک دبا لیا اور پائنتی پڑی ہوئی فرد لیٹے ہی لیٹے کمّل کے اوپر اور لگا لی.....

صبح آنکھ کھلی تو دھوپ پھیل چکی تھی اور مشرقی کھڑکی کے رنگین شیشوں میں سے کرنیں میرے بستر پر پڑ رہی تھیں اگرچہ خاصا سویا تھا مگر کمئی خواب کے سبب کسل کا یہ عالم تھا کہ گویا اعصاب موگلیوں سے کچلے ہیں۔ گھٹنوں میں سے رات بھر کا دبا ہوا تکیہ نکالا، بار بار منہ پر ہاتھ پھیر، جمائیاں آئیں۔ ایک لمبی انگڑائی لی، بستر پر ترنگ سی لگا کر اٹھا اور ویسے ہی سلیپنگ سوٹ کے دھاری دار پاجامہ پر اوورکوٹ کندھے پر ڈالتا اور آستین میں ہاتھ ڈالتا چل پڑا۔ سرائے پہنچا تو کمرہ بدستور مقفل ۔۔۔ یاالٰہی ماجرا کیا ہے۔ پھاٹک کے بغلی کمرے میں منیجر کا کمرہ تھا اور اسی کمرے کی گھونچ میں زینہ کی ڈاٹ کے نیچے مختصر سا دفتر۔ میں اندر چلا گیا منیجر سے دریافت کیا، لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکا کہ اس مخصوص چھوکرے کو آواز دی جس کے متعلق حکیم جی کی قیام گاہ کی خدمت تھی "ابے دیکھ یہ تیرہ نمبر گوش محل والے کہاں چلے گئے صبح ہی صبح۔؟"

"دُو وہ مولانا، ابھی چلے گئے ساتھ ساتھ دونوں کہیں کو" چھوکرے نے بڑی معصومیت کے ساتھ جواب دیا۔

میں نے سوال کیا "اچھا رات کے بجے آئے تھے؟"

"بس بابوجی، آپ پوچھ کر گئے، آپ کے جاتے ہی کھانا کھایا آ کر" چھوکرے کا معصومیت بھرا جواب تھا۔

چند سیکنڈ گومگو جیسی خاموشی رہی۔ منیجر بولا۔ "ہوں، ہمیں تو بس اسی وقت شاید پرسوں؟ نظر آئے ہیں جس دن آئے تھے، رجسٹر میں اندراج کراتے ہوئے ۔۔۔ دونوں میاں بیوی، پھر تو نہ معلوم کس کس وقت آتے جاتے ہیں ۔۔۔ ویسے کھانا ناشتہ یہیں سے لے رہے ہیں پابندی کے ساتھ۔"

اور میں سوچتا ہوا چل پڑا۔ حکیما سالے کے پر لگ گئے پر۔ اٹھائے اٹھائے پھر رہا ہے۔

میں سمجھتا ہوں، اب آج صبح ہی صبح جمنا کی سیر کو لے گیا ہوگا۔ کل شام کہیں اور گھومے ہوں گے۔ دن بھر پرانی عمارتیں دکھائی ہوں گی اور بغل میں دبا کر، شام کو کوئی سنیما کا ٹپ ٹپا شو دیکھا ہوگا اور پھر رات بھر..... ایک ٹھنڈی سسکی نکل گئی۔ تصور کی فسوں کاری نے خون منجمد کر رکھ دیا۔ اپنے پروں اڑ کر سونے کی چڑیا مٹھی میں پہنچ گئی۔ بڑا بھرپور ہاتھ پڑا ہے۔ مقدر کا کھیل ہے۔ پھر ابھی تو بھائی تیرھویں چودھویں میں وہ، اور سولہویں سترھویں سال میں حکیم جی۔ امنگوں کی راتیں مرادوں کے دن ہیں۔ اب دیکھیے اپنا مقدر بھی کھلے تب بات ہے۔ ہوٹل پہنچ کر ایک رسالہ اٹھایا۔ وقت تو کاٹے نہیں کٹتا۔ پڑھ نہ سکا۔ ورق الٹ کر رہ گیا۔ پڑھنے کی کوشش کی تو عبارت کا سیاق وسباق ملانے ہی سے قاصر تھا۔ دل خواہ مخواہ مچلا سا پڑتا تھا۔ جس قدر سمجھاتا، تھپکتا اتنا ہی زیادہ مچلتا۔ صبر کی تلقین کرتا تو جیسے وقت کی طنابیں کھینچنے کی آرزو کرتا۔ ابھی تو قرارداد کی رو سے ۳۶ گھنٹے حکیم جی کی باری کے باقی ہیں۔ پھر ایک مبہم سا وسوسہ اٹھتا، اور حکیم جی لاکھ شریف النفس سہی لیکن اس معاملے میں کیسے ہی سیدھے کیوں نہ ہوں، رات بھر تو اور گھسیٹ ہی جائیں گے کہیں پرسوں صبح تک چارج دیں گے۔ اور دل سے کہتا۔ "میاں تم ابھی سے مچلے جا رہے ہو۔ ابھی تو اڑتالیس گھنٹہ کا پہاڑ یوں بھی باقی ہے۔ مگر منٹ منٹ بھاری تھا۔ برآمدہ میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اور خلا میں گھورنے لگا۔ کبوتروں کا ایک بڑا پرا فضا میں مخصوص پرواز میں غوطے کھا کر اڑ رہا تھا اور نیچے آ کر پھر اوپر اٹھتا تھا۔ فتح پوری کے ٹریفک کی آواز کانوں میں آ رہی تھی۔ کمرے سے برآمدہ تک اور برآمدہ سے کمرے تک اس رستخیز میں کچھ پتا نہ چلا کہ کس وقت دوپہر ہو گئی، بیرا کھانا لے کر آیا تو چونکا پیٹ کا جائزہ لیا تو بھوک غائب تھی۔ ارے! کھانے کا وقت ہو گیا! باتھ روم گیا، ہاتھ دھوئے کھانا کھایا۔ اک ذرا کے ذرا کمر سیدھی کی۔ معاً خیال آیا۔ صبح کے نکلے اب ضرور پلٹے ہوں گے۔ کھانے کے وقت یوں ہی اٹھ کر چل پڑا۔ پھر وہی جیسے مُنہ کی کھائی۔ واپس آیا، راستہ میں سوچا، حیرت ہے، ابھی اس وقت تک ان کے وہیرا باؤٹس کا پتہ نہ چل سکا۔

ہوٹل پہنچ کر سوچا لاؤ جس کام کے لیے آیا ہوں اسی کا مشغلہ کر کے جی بہلاؤں، امونیشن ڈیلروں کے یہاں جانے کے لیے تیار ہوا۔ یہ کام شوقین شکاری کے لیے بڑا دلچسپ اور خوش آئند تھا مگر پھر گیا نہیں، اندازہ ہوا کہ اس وقت کسی اور جانب دلچسپی لینا ممکن ہی نہیں۔ میں خود اپنے بس میں

نہیں! کہیں اور کھپ ہی نہیں سکتا۔ کارونیشن ہوٹل کی پچاس سیڑھیاں شام تک تین چار مرتبہ اور چڑھیں اتریں اور والہانہ انداز میں سرائے تک راستہ ناپا، اور تالا دیکھ دیکھ کر بُد رقیب روسیاہ کے مُنہ پر دولتی پڑتی رہی۔۔۔ ادھر پہاڑ سی رات سر پر آرہی تھی۔ اندرونی خلفشار کسی بڑے انقلاب کا سراغ دے رہا تھا۔ بس خیال ہوا اور امید کی کرن نظر آئی، یا دل خود فریبی میں گرفتار ہو کر اچھا شگون لینے لگا کہ آتشِ شوق تیز تر ہے، وعدہ وصل نزدیک ہے۔ تاہم بار بار محرومی اور ناامیدی کی لہر اس سرور کو کاٹ کاٹ دیتی۔ کھانا کھایا، کھایا کیا زہر مار کیا، بستر پر لیٹ گیا۔ آج میری دوسری سنہری رات ہوتی قرار داد کے مطابق۔ دل کی گہرائیوں سے گہری گہری ٹھنڈی سانسیں آپوں آپ ابھرنے لگیں۔ نرم نرم گدا ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے تپسیا کرنے والے جینی سادھوں کا کیلوں کا بستر، اور نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے مگر بدنصیبی، نہ معلوم کیسے کس وقت، صبح ہوتے آنکھ لگ گئی کم بخت، سورج نکلے ہڑبھڑا کر اٹھا اور ویسے کا ویسا ہی بغیر کلی کیے آنکھیں ملتا سرائے کی جانب بھاگا۔ اس چھوکرے کم بخت نے بتایا۔ "ابھی ابھی ناشتہ وغیرہ کر کے تانگے پر قطب صاحب چلے گئے۔"

"اچھا۔ تم نے کہا تھا کہ میں کئی بار آچکا ہوں؟" میں نے کہا۔

اور چھوکرے نے بکمال معصومیت جواب دیا۔ "نہیں، بابو جی۔ اب کہہ دوں گا جب آئیں گے۔"

بڑا تاؤ آیا۔ گیند کی طرح ٹپہ کھا کر اپنے کمرے میں پہنچا اور وہیں سے اسکیم بناتا آیا۔ غسل کیا ناشتہ کیا، شریفوں کے سے کپڑے پہنے اور ایک تانگہ ٹھہرا کر قطب صاحب پہنچا۔ دوپہر تک ٹکریں مارتا پھرا، ہر سیاح پر حکیم جی کا دھوکا ہوتا۔ ناامید ہو گیا، مگر گتھی سلجھ بھی نہ رہی تھی یہ تو اندازہ ہو گیا کہ بات قرار داد کے مطابق ہوئی نہیں، پھر اگر وہ حرام زادی تیار نہیں تو حکیم جی مجھے بتا دیں، یہ تو حکیم جی کی بدمعاشی معلوم ہوتی ہے، چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا، جونک بن گیا ہے۔ ڈھٹائی پر غصہ آیا کہ بڑے حکیم جی کو سولفظوں کا تار دوں۔ پھر خیال آیا کہ ممکن ہے وہی تیار نہ ہوتی ہو، اور حکیم جی ریاض کر رہے ہوں۔ اس نے پہلے ہی روز میرے رُوبرو اسٹیشن پر کورا انکار کر ہی دیا تھا۔

قطب صاحب سے واپس آکر دماغ اسی ادھیڑبن کی آماجگاہ بنا رہا۔ رات ہوئی تو بستر پر انگارے بچھ گئے، "ہائے مقدر، کم بخت انکار تو نہیں کر رہی ہے کہیں! خون میں کبھی غصہ کے مد اٹھتے اور کبھی ناامیدی کے جزر اور اپنی اس کیفیت اس کلنٹے، ڈور، راڈ اور چرخی میں پھنسی مچھلی جیسی تھی جس کو اس کا شکاری اس کی بے قرار جبلت سے اس کو کھینچ کھینچ کر اور ڈھیل دے دے کر تسلسل کے ساتھ اس حد تک متحرک رکھتا ہے کہ تھک مر کر پانی کی سطح پر آجاتی ہے۔ اور میرے دماغ کے اندر لاوا سا بھڑبھڑا پڑتا تھا۔ اور چھاتی میں زلزلہ سا بپا ہو ہو جاتا تھا۔ قرار داد کے بموجب آج میری تیسری رات . . . . ہونی تھی اور یہاں روز اول ہی تھا، سب کچھ حکیم جی کا مقدر۔ اب اندازہ ہو گیا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے: دل و دماغ دونوں ہی کو تھام کر جائزہ لیا تو پکے پر پایا۔ صورت حال پر غور کیا۔ اب تک شیڈول ٹائم سے تین دن اوپر ہو چکے ہیں۔ مگر دنیا بہ امید قائم۔ حکیم جی بے چارے کیا چیز ان کے تو پر کھے بھی میرے پاس پہنچیں گے اپنے پاؤں چل کر، بھلا ہزار روپیہ زرِ ضمانت جمع ہے، جائیں گے کہاں نکل کر بچہ، ساری عمر اسی کے چکر میں لگا دیں گے کیا؟ کام کا سارا دار و مدار اسی رقم پر ہے، کیوں میں بے قراری کی حماقت میں پڑوں، پھر، ہاں ابھی جی بھرا نہیں، چھاتی سے نہیں کھلتی، سونے کی چڑیا مٹھی سے نہیں نکلتی، دیکھنا ہے کب تک روپوش رہتے ہیں بچہ۔ مگر پھر آن کی آن میں وسوسے گذرنے۔ حکیم جی وہی مخصوص لات میری کمر پر رسید کرتے تصوّر میں آتے۔ بھیّا کیا کروں وہ حرام زادی کم بخت راضی نہیں اور میں تو پانچ روز سے سمجھا رہا ہوں، نہیں مانتی کیا کروں۔" گویا کہتے " اے نامراد کتنے! تو اس قابل نہیں ہے کہ تیری جانب ملتفت ہوتی۔" اے ہٹ کسی لائق بھی ہے۔ یہی منہ مسور کی دال، اور وہ تو حکیم جی ہی کو پسند کرتی ہے، تجھ پر لعنت بھیجتی ہے۔ اور میرا وجود ہل جاتا۔ مرنے کو جی چاہتا پھر جی میں آتا کہ لاؤ بڑے حکیم جی کو تار دے کر سب بھانڈا پھوڑ دوں۔ لیکن عقل دامن پکڑتی ۔۔۔ ہزار روپیہ کی رقم مضبوط ضمانت کے بل پر امید سہارا دیتی آج نہیں تو کل آخر تا بکے۔!

تھک کر کپڑے اتارے، بستر پر دراز ہو گیا۔ دس بجے کے قریب چائے منگائی اور بیرے نے دوپہر کا مینو بتایا۔ میں نے جیسے کھسیا کر کھانے پر جھونٹ اتاری اور فورمہ، بریانی،

اور بھنے ہوئے تیتر کا آرڈر دیا۔ اور ارادہ کیا کہ اب نہیں جاؤں گا۔ دیکھوں کب تک نہیں پلٹتے ہیں حکیم جی کبھی تو مستی ختم ہو گی۔ آج دوپہر لمبی تان کر سوؤں گا اطمینان سے۔ اور جب جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ دہلی پہنچنے کے بعد معمول کی نیند سے بمشکل ایک چہارم سو سکا ہوں اور وہ بھی اچھلوں ڈوبوں۔ مفرور ملزم والی نیند جس کے تعاقب میں پولیس لگی ہو۔ اور جیسے کوئی تھک کر کسی کام پر پڑتا ہے۔ دوپہر کے کھانے کی پلیٹوں پر ٹوٹ پڑا۔ جیسے انتقاماً پیٹ سے اوپر کھانا کھاتا چلا گیا۔ دوبارہ منگا منگا کر پلیٹیں صاف کرتا رہا۔ کھانا کھا کر بیرے سے بستر ٹھیک کرایا۔ اور کمل تان کر گہری نیند سونے کے لیے لیٹ گیا۔ میرے تکیوں میں آبی پرندوں کے نرم پر بھرے ہوئے تھے اور ایسے تکیے تو لوری دیتے ہیں۔ میں نے سر گرا دیا جیسے کبھی شکار کی مہم سے ناکام پلٹنے کے بعد ہوا کرتا تھا۔ مگر شروع میں تو یہ پانچ دن رات کا مارا شوریدہ سر پتھروں کی چٹانوں کے درمیان رہا، بیٹھ بھڑکتی ہوئی بھٹی کے انگاروں پر، مگر نیم خواب نیم بیداری میں خون کے اندر سنسناہٹ ہوتی، پھر سرور سا دوڑنے لگتا محفل کی کارفرمائی ہوتی، میری جیب میں ہزار روپیہ کے نوٹ حکیم جی کے آنے کی ضمانت میں بھرے ہوئے تھے؛ خوب گہری نیند سویا۔ کسی کھٹکے پر ذرا آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ فتح پوری مسجد سے آذان کی آواز آ رہی تھی۔ ارے مغرب ہو گئی۔ نہیں یہ تو عشاء کا وقت ہے۔ شام کی چائے بھی غائب ہو گئی تھی۔ بیرا رات کے کھانے کے لیے پوچھنے آیا تھا۔ میں نے پڑے ہی پڑے جواب دیا "نہیں" اور کروٹ بدل کر پھر گہری نیند سو گیا۔ اٹھارہ گھنٹہ سو کر صبح کو اٹھا تو تمام وجود بھڑکا ہوا تھا۔ صریحاً میرے حق پر دست درازی ہے یہ۔! انھیں میرے پاس آنا چاہیے تھا! ایسی تیسی میں جائے دوستی، میں ایسی یاری نہیں پالتا، ابھی جا کر گریبان پکڑ کر مطالبہ کروں گا۔ پھر عقل نے دامن کھینچا یا اللہ میرے اس کرب کا اختتام کب ہو گا! عزت نفس، خودداری، انا سب کچھ گرد ہو کر رہ گیا دل ہی دل میں حلف اٹھا چکا تھا کہ اب نہ جاؤں گا دیکھوں گا کب تک کتراتے رہیں گے؛ صبح کا ناشتہ بھی ذرا اچھا کیا اور دوپہر کا کھانا بھی۔۔۔ اس دوران میں دل کی کشش کہتی رہی کہ اب آئے اور اب آئے لیکن کسی وقت جھاڑ پونچھ کرنے والا ہوٹل کا چھوکرا اور کسی وقت بیرا اور ہر کھٹکے کو میں حکیم جی سمجھ کر چونک چونک پڑا۔

سہ پہر کے وقت دل نے پھر طواف کوئے ملامت کا تقاضا شدید کیا اور میں احمد بائی کی

سرائے میں کھڑا تھا۔ اب کی مرتبہ بند تالا دیکھنے کی ہمت نہ پڑی سیدھا دفتر کا رُخ کیا اور منیجر نے اسی طریقہ سے جس طرح ایسے سوال پر ہوٹل کے منیجر کو جواب دینا چاہیئے تھا۔

"اچھا، یعنی گوش محل میں نہیں ہیں، کہاں گئے؟ مجھے تو وہ مولانا جب سے آئے ہیں ایک ہی آدھ مرتبہ دکھائی دیئے بس ۔۔ آتے جاتے پھاٹک میں سے گذرتے شاید ایک دفعہ ۔۔ وہ ۔ ابے لہاں گیا رمضنیا ۔۔ وہ کہاں ہیں تیرے تیرہ نمبر والے، مولانا۔"

اور کمرہ کا ملازم لڑکا ذرا دور کہیں دور سے بولا اور پھر سامنے آگیا۔"کہاں ہیں تیرے مسافر؟ تیرہ نمبر والے؟"

"یہ بابو جی انھیں تین چار دن سے بے چارے کو آتے جاتے دیکھتا ہوں، اسی چکر میں، اور ملے شاید ایک مرتبہ بھی نہیں ہیں ۔۔ بابو جی کبھی ملے آپ کو؟" میں نے نفی میں جواب دیا اور ملازم لڑکا پھر ہکلا گیا ۔" مَ مَ مَ میں کیا جانوں۔"

اور منیجر نے اس کو گالی دے کر کہا ۔ ۔ ۔ ۔ "اسے کام تو کرتا ہے کمرہ کا، اور کہتا ہے میں کیا جانوں۔ پھر کون جانے ۔ ۔ ۔ ۔؟ مکار کہیں کا ۔ ۔ ۔ ۔"

"وہ، وہ، وہ ابھی چلے گئے دونوں۔" لڑکے نے درست ہو کر جواب دیا۔

اور منیجر نے نہایت وثوق کے انداز میں کہا۔

"اچھا بابو جی اس وقت تو آپ جائیے لیکن سوتا پڑتے ادھر آئیں گے تو آپ کے دوست سے ضرور بالضرور ملاقات ہو جائے گی ۔۔ ہوں میری ذمہ داری ہے، تین چار دن سے آپ کو آتے جاتے پریشان دیکھ رہا ہوں، مقدر کی بات ہے کہ آپ کو نہیں مل پاتے اور آپ ٹھہرے کہاں ہیں؟ یہیں کہیں؟ فتح پوری کے کسی ہوٹل میں؟"

"ہاں، ہاں کارونیشن میں، تین نمبر کمرہ میں۔" میں نے کہا۔

اور سرائے کے منیجر نے بکمال اخلاق سے برجستہ جواب دیا۔

"بس بہت ٹھیک میں ان مولانا سے بھی کہوں گا بلکہ ان کے آتے ہی آپ کو بھی ہوٹل کے دفتر فون کروں گا کہ تین نمبر کو بھیج دیں، تیرہ نمبر آگئے ہیں۔"

سرائے کے منیجر کی یقین دہانی پر نئی امید لیے سرائے کے پھاٹک سے نکل کر سڑک پر والہانہ

انداز میں کھویا کھویا چلا جا رہا تھا وہ معمہ جو چلتی ریل میں سامنے آیا تھا سرائے کے منیجر کی مدد سے دو ڈھائی گھنٹہ کے اندر حل ہوتا نظر آ رہا تھا، بتیاں جل چکی تھیں اور مجھے دور اور قریب کی ہر روشنی میں امید کی کرنیں جھلملاتی دکھائی دے رہی تھیں اور کسی کسی وقت گردن اور نگاہیں ترچھی ہو جائیں تو قوسین رنگتیں چھلک پڑتیں ــ اور کون جانے آج ہی شب" سنہری رات " ہو جائے، بس ہلکا ہلکا سا سرور رگ و پے میں دوڑ دوڑ جاتا ــ اور منزل بہت ہی قریب محسوس ہوئی، اور ہو بھی چکی تھی آخر تو مقدر جاگتا کسی وقت۔

سرائے اور ہوٹل کے درمیان کا مختصر سا راستہ طے کر کے ہوٹل کے زینہ کے قریب ہی پہنچ پایا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میری گردن میں ہاتھ حمائل کر کے ایک خوشی میں بھرائی ہوئی چیخ سی نکالی اور ساتھ ہی کامیابی اور مسرت بھرا قہقہہ، جیسے بچپن میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے چور پکڑ کر آوازوں کا ٹکراؤ ہوتا تھا۔ اس تمام کے استعجاب ٹیمپو اور ردِ عمل میں میں نے بغیر ہی پیچھے مڑے سمجھ لیا کہ گرفتار ہو گئے چچا مرحوم کے زندہ آسیب نے مجھے دبوچ لیا تھا، جو اسی دن سے میری تلاش میں تھے جس دن میں پہنچا تھا کیونکہ انھیں لکھ چکا تھا کہ پہنچنے والا ہوں دو دن کی تاریخ کے ارد گرد کی اطلاع تھی۔ ارادہ مصمّم تھا مگر وقت کا یقینی تعین نہ تھا۔ ٹھیک ٹھیک تاریخ اور وقت سے مطلع نہ کر سکتا تھا ورنہ وہ تو اسٹیشن پر حتمی طور پر موجود ملتے۔

" پکڑے گئے نا آج بچہ! " چچا نے لپٹاتے ہی لپٹائے اپنا چہرہ تقریباً میری ناک سے بھڑا کر کہا، اور چچا کی آنکھوں میں مسرت اور کامیابی کے مرغولے ناچ رہے تھے، اور بھی زیادہ بھینچ کر خوشی میں بھرائی ہوئی آواز میں بولے ــ " کیوں بھتیجے بہادر یہ کیا حرکت "۔

میں چور ضمیر تھا، دھک سے ہو گیا، چچا بولتے رہے ــ " شوخی اور ڈھٹائی ــ یعنی مجھے باضابطہ کارڈ ڈال رہے ہیں کہ ۱۳-۱۴ تاریخ کسی بھی دن کسی گاڑی سے پہنچ رہا ہوں، اور آج ۱۹ تاریخ ہے اور چچا راستہ دیکھ رہے ہیں ــ گلی میں جس تانگے کی آواز سنائی پڑتی ہے۔ دروازہ پر کو بھاگتے ہیں ــ چچی ہیں کہ بے چاری دونوں وقت ایک آدھ خاص ہانڈی پکا رہی ہیں، بس کان چاپ پر ہی لگے ہوتے ہیں ــ جس دن سے خط ملا ہے چین نہیں ہے، تمہاری چچی نے تو یہاں تک اصرار کیا کہ گھر تار دے کر دریافت کرو کہ کیوں نہیں پہنچے اور میں نے انھیں یہی سمجھایا کہ " بھئی چلے نہیں، تم جانتی ہو

ان رئیس زادوں کو، ان کے باپ دادا ریل کے سفر سے گھبراتے ہیں، صاحب زادہ نے کسی ذرا سی بات پر ارادہ ترک کر دیا ہوگا۔ وہ بولیں، بہر حال نہیں پہنچے تھے تو کارڈ ڈال دیتے۔ اس میں کیا قباحت تھی؟ میں نے کہا بی بی تم کیا جانو روز اور ہر گاڑی سے روانگی کا ارادہ ہوتا ہوگا۔ اسباب بندھتا ہوگا۔ اسباب بندھتا ہوگا کھلتا ہوگا۔ یہ تبائلی لوگ ہیں۔ پھر میں نے شگن ڈالا تو کچھ ایسا معلوم ہوا کہ چل بھی دیئے اور پہنچ بھی گئے اور پھر ادھر تین چار دن سب ٹھکانے منجھا کر پھینک دیئے۔ وہ کارتوسوں والے حاجی ہیں اور فٹن والوں کے یہاں جا کر پوچھا بھی اور کہہ بھی رکھا تھا کہ صاحبزادہ پہنچیں تو مجھے اطلاع کرا دیں اور ان سے کہہ دیں چچا تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ تمہارے یہاں ہمیشہ سے انھیں دو کارخانوں سے کارتوس جایا کرتے ہیں نا؟"

چچا میرے خاندان بھر کے محبوب اور معتمد دوست تھے کسی کے خورد کسی کے بزرگ۔ چھوٹے بڑوں سبھی کے کچھ نہ کچھ اور میرے مربی اور دوست دونوں، مگر اس وقت ان کا خلوص اور وضعداری مجھے کوتوال شہر کے چھاپہ اور وارنٹ کے ایکشن سے زیادہ زہرناکی اور سنگین محسوس ہو رہی تھی، زبان گنگ تھی اور دماغ میں بگولہ سا سنسنا رہا تھا۔ اور اسی کیفیت میں چچا نے کھوپڑی پر ہتھوڑا سا رسید کیا۔

"چلو گھر۔ اور اس کارونیشن ہوٹل میں تشریف آوری کی کیا شانِ نزول تھی؟ میں تلاش کرتا کرتا پہنچ ہی گیا جوئندہ یابندہ، تمہاری چچی کی اور میری کشش کچھ اللہ کو ملانا ہی منظور تھا، وہ بھی اتفاقیہ بے نشان وگمان، وہ ایک نوکر میرے یہاں کام کر چکا ہے اور اب اسی ہوٹل میں ملازم ہے، اس نے میرے یہاں تمہیں کبھی دیکھا تھا۔ ایک دو سال قبل کسی موقع پر۔ راہ چلتے سڑک پر مل گیا۔ دہی لینے دکان پر جا رہا تھا۔ سلام کر کے از خود ہی بتایا کہ آپ کے بھتیجے اس ہوٹل میں مقیم ہیں، ہوٹل کے دفتر میں گیا تو کلرک جاننے والا نکلا۔ رجسٹر دکھایا کمرہ پر دکھوایا تو پتہ چلا کہ ابھی ابھی کہیں یوں ہی اٹھ کر چلے گئے ہیں اور جب سے میں یہیں چبوترا ہے پر کھڑا ہوں اور بس تمہیں دور ہی سے بھانپ لیا آتے ہوئے پہلے ارادہ کیا کہ پیچھے سے آکر آنکھیں بند کر لوں۔ پھر رہا نہ گیا چمٹا لیا۔"

چچا کے روئیں روئیں سے مسرت کی پھلجھڑیاں چھٹ رہی تھیں۔ ہوں، اچھا تو پھر اٹھاؤ اسباب چلو گھر ابھی۔

اور چچا کے الفاظ میرے کانوں میں مشین گن کی باڑھ کی طرح پڑے، بڑی مشکل سے حلق سے آواز نکال سکا۔

"ہوں، نہیں، ہاں، میں آجاؤں گا۔"

اور چچا کے منہ سے خلوص، جواب طلبی اور تادیبی انداز نے ایک لمبا ہونکارا نکالا اور "کیوں؟" کا سوال بے جواب، اور پھر یک طرفہ اپنی ہی کہتے چلے گئے "یعنی یہاں ہم نے ہفتہ بھر سے کنوؤں میں جال ڈلوا دیئے ــ سارا شہر چھان مارا ــ یا اللہ کہاں پھنس گئے ــ تمہاری چچی کے جی میں وسوسے اٹھنے لگے، وہ واں انتظار کر رہی ہیں بے چاری اور آپ فرماتے ہیں" آجاؤں گا" پہلے تو ہوٹل میں قیام کی کوئی وجہ نہیں اور پھر فرماتے ہیں آجاؤں گا، یعنی چچا مرحوم اتنے سیدھے ہیں کہ آپ کو اس وقت اس ملعون ہوٹل میں چھوڑ دیں گے ــ میری سمجھ کام نہیں کرتی کہ بات کیا ہوگئی؟ بھتیجے بہادر، آپ ٹھیک ٹھیک اپنے اطلاعی کارڈ کے مطابق دہلی پہنچے ہیں، میں ہوٹل کا اندراج دیکھ آیا اور پر جاکر ابھی تمہارے ملنے سے قبل ــ پھر یہ وحشت چہ معنی دارد کہ اسٹیشن سے اتر کر کارونیشن ہوٹل کا رخ کیا اور اطلاع مجھ کو دی کہ پہنچ رہا ہوں، کوئی تک سمجھ میں نہیں آتی ــ اگر گاڑی کا وقت لکھ دیتے تو اسٹیشن پر ہی جاکر پکڑ لیتا۔"

چچا اپنا لیکچر دے رہے تھے اور مجھے اندازہ ہوتا چلا جا رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا کہ "جب نہیں پکڑ ملا، لیکن اب شومئی قسمت سے ضرور چنگل میں پھنس گیا! آپ کے اس" اور مجھ پر رہ رہ کر سناٹے کی لہریں چڑھ اتر رہی تھیں جیسے آٹھ دن بعد بندھی ہوئی امید پر پانی پھر گیا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ چچا مرحوم کی باہوں میں نہیں مستان کی پکڑ میں جکڑا ہوا ہوں، ساتھ ہی اندازہ ہوگیا کہ بہت چلتی رقم ہیں، اس قدر رسا کہ میں ملنے نہ پایا تھا کہ ایک گھاگھ سب انسپکٹر کی طرح سراغ لگا کر اور ایک ماہر وکیل کی طرح پہلے ہوٹل کے دفتر میں پہنچ کر آمد کی تاریخ وغیرہ سب پڑھ آئے تھے۔

چون چرا کی گنجائش بہت ہی کم بلکہ مطلق نہیں ہے۔

اور چچا پھر شروع ہو گئے۔" یا اللہ یہی تو میری عقل حیران ہے۔ گھر سے ایک دن پہلے کارڈ ڈالتے ہو کہ پرسوں یا ترسوں چل دو گے اور پھر ہوٹل کا رجسٹر دیکھتا ہوں تو پہلے ہی تعین کے مطابق

پہنچ بھی جاتے ہو ٹھیک ٹھیک دن اور وقت، پھر میرے اللہ راستہ میں ایسی کون سی افتاد پڑی کہ میرے یہاں آنے کا پروگرام بدل کر ہوٹل میں آن پڑے۔ بس، لڑکپن ہی تو!۔"

اور میں نے پھر لنگڑاتی ہوئی آواز نکالی، " وہ، وہ، کچھ کام ہے، بس میں کل شام تک آپ کے یہاں پہنچ جاؤں گا چچا۔"

اور چچا افضل اچھل پڑے۔" ایں ہوں! آں! وہی تو میں پوچھتا ہوں کہ وہ کون سی مہم ہے جو آپ دہلی شہر میں چچا مرحوم کے بغیر اکیلے سر کرنا چاہتے ہیں اور جو فتح پوری کے اس ہوٹل میں بیٹھ کر کل شام تک سر کرنا ہے اور چچا کے یہاں سے نہیں ہو سکتی میاں صاحب زادے سیدھے سیدھے گھر چلو، جو کچھ ہو گا عمل معمول سابق دستور، اپنے بڑوں کی ریت کے مطابق وہیں بیٹھ کر ہو گا۔ اور ہاں کہیں وہ کارتوس وغیرہ تو نہیں خرید لیے ہیں ابھی، ایں؟۔ اب کی مرتبہ میں دلواؤں گا، خاص اپنی معرفت، تمہارے خط پر میری بات دو جگہ پکی ہو گئی ہے۔ ایک نئی دکان کھلی ہے، پارسی نے اسی سال لیسنس لیا ہے۔ دام ہر جگہ سے کم اور مال کھرا اور تازہ۔ یہ پرانے تو دو کے نو، کرتے ہیں۔"

اور چچا مرحوم باتیں کرتے رہے اور میرا ہاتھ مضبوط پکڑے رہے، ان کا خلوص مجھے اس وقت کالا سانپ بن کر ڈس رہا تھا، میں ان کی شخصیت سے خوب واقف تھا، اور ایسے وقت اس نوعیت کے معاملہ میں تو کم زور سے کم زور شخصیت بھی مضبوط ہو جاتی ہے، خلوص اور تواضع دونوں مل کر تو بڑی قوت بن جاتے ہیں۔ "تو پھر میں کیا کروں؟" میں نے مضبوط جال میں پھنسے ہوئے ہرن کے انداز میں کہا۔

"بس گھر چلو" کہتے ہوئے چچا ہوٹل کا زینہ چڑھ گئے اور دفتر میں پہنچ کر ہوٹل کا کل بل اپنی جیب سے ادا کر دیا۔ کچھ سوچ کر میں پیچھے پیچھے اوپر پہنچا تو چچا میرے کمرے کا تالیفہ کر رہے تھے۔

ایک مرتبہ دبی زبان سے پھر کہا۔ "چچا وہ میرے ساتھ حکیم جی ہیں، ان کی امانت ہزار روپیہ میری تحویل میں ہے، وہ مل جاتے تو بس انھیں ان کی رقم تھما دیتا اور وہ مجھے کل شام ہی مل سکیں گے۔ اس لیے کہہ رہا تھا کہ آج کی رات اور کل کا دن مجھے اور یہاں چھوڑ دیں۔"

پچانے نہایت جارحانہ انداز سے جواب دیا ــ" چہ خوش ! وہ حکیم جی کہاں ـ گئے ــ بتاؤ چلو، انھیں بھی پکڑے لیتا ہوں، بہر حال انھیں تو اتنا نہیں جانتا مگران کے باپ سے اچھی طرح با د اللہ ہے، اور پھر وہ جب تمہارے ساتھ ہیں تو میرے ہی مہمان ہوئے، اور ہاں آپ ان کی امانت ...... یعنی ہزار روپیہ کی رقم لیے یہاں ہوٹل میں پڑے ہیں، میاں صاحب زادے ابھی ٹاپتا گدھا نہیں دیکھا ہے ــ بچہ ہیں آپ ــ یہ شہر دہلی ہے ــ اللہ بچائے ـ ایسی رقمیں ہوٹل سراؤں میں لے کر ٹھہرنے والوں کی رقمیں بھی ہاتھ سے جاتی رہتی ہیں اور خدا بچائے دشمنوں سے، گلے بھی کٹ جاتے ہیں ــ یہ تو خوب بتا دیا تم نے مجھے، اب تو میں ہرگز ہرگز نہ چھوڑونگا یہاں تنہا ـ یعنی اتنی لمبی رقم لے کر تم ہفتہ بھر سے ہوٹل میں پڑے ہوئے ہو ــ بڑی خیر گذری، چہ، چہ، چہ، توبہ توبہ، پھر کوئی وجہ، گھر چھوڑ ہوٹل میں ـ ہوں !"

میری آواز حلق میں رُک گئی، "تو پھر وہ حکیم جی کل یہاں آئیں گے اور ان کی امانت . . . ؟"

چچانے بات میرے حلق سے پکڑلی ـ" ٹھیک ہے میں یہاں ہوٹل کے دفتر میں حکیم جی کے نام پرچہ چھوڑتا ہوں کہ تم میرے ساتھ ہو اور حکیم جی اپنی امانت میرے گھر سے آکر لے جائیں بلکہ یہ کہ تم بھی وہیں ساتھ ٹھہرو۔"

اور چچانے میری زبان بند کر دی ـ میرے ہر عذر کو نہایت منطقی انداز میں رد کر دیا، اور بہتر و روشن تر صورت پیش کر دی، ورنہ میں تو چچا کو ڈاج دینا چاہ رہا تھا اور کسی اور ہوٹل میں چھپنے کے لیے چوبیس گھنٹے کی مہلت مانگی تھی کہ شائد اس کے بعد ستارے بدل جائیں اور مقدر کھل جائے ـ مگر چچانے میرا اسباب ہوٹل کے نوکر پر رکھوایا ـ ہینڈ بیگ ہاتھ میں لیا اور یہ جا وہ جا، میں پیچھے پیچھے مذبحہ کے دنبہ کی طرح کشاں کشاں ہولیا ـ اور جب میرا اسباب لاد کر اور مجھے آگے بٹھا کر چچانے تانگہ والے سے کہا " پنڈت کے کوچہ" اس آواز کے ساتھ تو آخری اُمید بھی ختم ہوگئی ـ آنکھوں کے سامنے چاندنی چوک کی روشنیاں کالی تتریوں کی طرح ناچنے لگیں اور جیسے ہی چابک کے شراقے کے ساتھ تانگے نے پہلا جھٹکا لیا تو میری چھاتی پر گھونسہ سا پڑا اور اس ضرب سے جیسے میرے سینے کے اندر کبوتر پرکیاں لینے لگے جس کو کہتے ہیں کلیجہ مُنہ سے نکل کر باہر آپڑا ـ جیسے میں کسی سنگین جرم میں پکڑا گیا ہوں اور انسپکٹر پولیس گھسیٹ کر حوالات لیے جارہا

ہے۔ وائے مجبوری! ہائے معذوری، اور پھر محرومی کا طوفان میرے اوپر پھٹ پڑا، ایک دفعہ جی میں آیا کہ یہ دنیاداری خلوص اور تعلقات کی بندشیں توڑ کر تانگے سے پھاند پڑوں اور چچا سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کروں ۔" آپ کون ہوتے ہیں مجھ کو لے جانے والے؟ یوں قید کر کے؟" پھر اندر سے عقل کی ایک کرن ابھری ۔ اس صورت میں اب بات بنتی تو نہیں ۔ اور اصل صورتِ حال سے چچا کو آگاہ کر کے رحم کی بھیک طلب کروں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کسی طرح بھی بات نہیں بنتی، ایں خیال است و محال است و جنوں .....

نہ معلوم کس وقت فتح پوری سے پنڈت کے کوچہ تک کا فاصلہ تانگہ طے کر گیا۔ میں زمان و مکان کی قید سے آزاد کسی اور دنیا میں کھویا ہوا یا بدستِ دگرے بدستِ دگرے چچا مرحوم کی بیٹھک میں مغموم بیٹھا تھا۔ بستر لگ چکا تھا۔ چچا مزے مزے سے خوشبودار خمیرہ کا حقہ پی رہے تھے اور مجھ سے بار بار دریافت کر رہے تھے کہ کھانا کتنی دیر میں کھاؤ گے۔ بہر حال کھانا تو اس دن بھی کھایا جاتا ہے جس دن باپ مرتے ہیں۔ کھانا تو یاد نہیں کیا کیا تھا۔ نہ معلوم دس بارہ کتنی چیزیں تھیں البتہ چچا کا اصرار اور تواضع اور اندر حویلی میں سے چچی کے ملازم لڑکے اور چچا کی زبانی مختلف کھانوں کے متعلق پیام تواضع جو وہ ہر کھانے بھیجنے کے ساتھ بھیج رہی تھیں، یاد ہیں ۔ یہ بھی یاد نہیں کہ کتنا کھایا، ہاں کھاتے ہوئے چچا کا یہ مخصوص جملہ ضرور یاد ہے " میاں کھا نہیں رہے ہو، کھوئے ہوئے، کہاں ہو؟ کیا بات ہے یہ لو یہ یاقوتی بریانی، بس ایک کباب اور، اور یہ بات نہیں میں کھا خوب رہا تھا لیکن حلق میں سے ہر نوالہ چکنی مٹی جیسی کوئی چیز اتر رہی تھی ۔ نہ معلوم .... کیسے چچا کی تجربہ کار آنکھ میری بے زاری اور بے مزگی کو بھانپ رہی تھی اور اس رات صبر سا آگیا، چچا کے بیٹھکے میں، غم جاناں اور غم دوراں دونوں سے بے نیاز ہو کر گھوڑے بیچ کر سویا، تو دن چڑھے کی خبر لایا۔

چچا اس دوران میں دو مرتبہ ناشتہ لگوا چکے تھے ۔ میری آنکھ کھلی تو اپنا ذی شان خوشبودار دھواں دار حقہ لے کر بستر کے قریب پڑے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گئے ۔ حقہ کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ بڑے پیار کے ساتھ آواز دی ۔ لو اب اٹھ بیٹھو۔ بہت سوئے، ایں! کیا کل کی رات سینما

کا لیٹ شو دیکھا تھا؟ ناشتہ پر چچا نے آج کی خریداری کا پروگرام پیش کیا، تمام امونیشن کی دکانوں کا بھاؤ لسٹوں کے ساتھ میرے علم میں بھی تھا اور چچا کو تو دہلی بھر کے تمام بھاؤ اور اتار چڑھاؤ از بر ہوتے تھے، پارسی کی دکان سے مطلوبہ کارتوس خریدے اور تمام بازار سے سستے داموں ملے۔ اور بہترین نئے امپورٹیڈ۔ دکان سے باہر آئے تو مسکراتے ہوئے اپنی دلالی کی رقم میرے حوالے کی۔ "یہ لو یہ تمہارے ہیں، میں نے اشارہ سے استفسار کیا تو بولے۔" یہ میرا کمیشن ہے اور میاں تم میرے برخوردار اور مہمان ہو۔ یہ تمہارا حق ہے"۔ چچا نے کہا اور میں نے بات ذرا دیر میں سمجھی، بولے۔" میاں تم کیا جانو، ہم بازار کے کیڑے ہیں، یہ کارتوس والے چھ گنا اور آٹھ گنا نفع لیتے ہیں۔ چکنی چپڑی تصویروں والی لسٹیں چھاپتے ہیں، اور کارتوس کوئی بنیئے بقال تو خریدا نہیں کرتے جو بھاؤ تاؤ کریں، پٹھان، ٹھاکر رئیس پارسل منگواتے ہیں۔ یہ پارسی میرا جاننے والا بھی ہے اور پھر میں اس سے پہلے سب بات کر رکھی تھی۔ بھائی دہلی میں ہر چیز کا اوروں کا بھاؤ اور ہے اور ہمارا اور سمجھے میاں۔ اب یہ میرے کمیشن کی رقم ہے اس سے آپ ایک سوٹ کا کپڑا خریدو، گھنٹہ گھر کی دکانوں میں بڑی اچھی سرجوں کے نمونے آگئے ہیں امسال۔ چلو بازار کی سب سے زیادہ قیمتی سرج خرد وادوں"۔

میں نے بات کاٹ کر کہا۔" مگر چچا آپ میرے ہوٹل کا بل بھی تو اپنی جیب سے ادا کر کے آئے ہیں وہ تو مجھ سے لے لیجیے"۔

"میاں حساب جو جو بخشش سو سو۔ چچا بنئے آدمی ہیں کارتوسوں کے کمیشن میں سے وہ رقم پہلے ہی وضع کر کے بقیہ تمہارے کوٹ کے لیے دی ہے، تم بے کھٹکے رہو، چچا کھا کر کمانے والے لوگ ہیں"۔

اور چچا نے گھنٹہ گھر کی ایک دکان سے درحقیقت بازار کی سب سے زیادہ قیمتی اور جدید ترین ڈیزائن کی سرج سوٹ کے لیے پسند کرائی اور جب ہم کپڑا بغل میں دبائے سڑک پر پہنچے تو جیب سے نکال کر پانچ روپیہ نقد پیش کیے۔ لو بھتیجے بہادر لو۔ یہ اس کپڑے کی دلالی، ابھی تمہاری موجودگی میں لی اس بزاز سے اور تمہیں خبر نہ ہوئی اب تم اس کی تین ٹائیاں خریدو، اور دو تین دن ٹھہرو تو سلوا بھی دوں جس فرم میں چاہو، آدھے ریٹ پر اور دولھا

بن کر جاؤ گھر کو۔"

مگر ان تمام جھوٹے کھلونوں سے میری اشک شوئی نہ ہو سکی۔ چچا کے کہنے پر دل نے جواب دیا، دولھا تو حکیم جی بنے اور یہاں تو حسرت ہی حسرت میں رہے، آپ کے خلوص عمل کے کلہاڑے نے نخل آرزو کی جڑ ہی کاٹ دی۔ اتنا کچھ پاکر اور چچا کی مہمان داری سے بڑھ کر ان کی پُر لطف صحبت سب کچھ مل کر مجھے خوش کرنا تو درکنار میری آزردگی بھی دور نہ کر سکی، اور آزردگی نے بھی اب بجائے جوش، جستجو، غرض اور حسرت و تمنا کے صرف ناامیدی کا روپ دھار لیا تھا۔ دلِ ناداں کو لاکھ سمجھاتا تھا کہ "تم غم کیوں پالتے ہو۔ میاں ہم اچھے کارتوس خریدنے آئے تھے، سو اچھے سے اچھے سستے سے سستے داموں مل گئے اور بلا سان گمان دہلی کے بازار کی بہترین سوٹنگ مفت ہاتھ آئی اور ٹائیاں وغیرہ صرف چچا کی عنایت اور خلوص کے ہاتھوں پھر چچا کے یہاں اعلیٰ سے اعلیٰ کھانا ملا، واں ہوٹل میں گھاسلیٹ سے مُنہ مارتے پھرتے تھے اور چچا کے بیٹھکے اور ہوٹل کے اس کمرے کا کیا مقابلہ۔ مگر اس ردگ کا کوئی جواب نہیں تھا جس کا علاج صرف احمد بائی کی سرائے کے اس گوشِ محل میں تھا۔ اس کا بڑا قلق تھا کہ چچا کے بھوت نے اس وقت دبوچا اور کمند اس وقت ٹوٹی جب لبِ بام دو چار ہاتھ رہ گیا تھا۔ اے کاش کہ چچا اس شب نہ ملتے تو احمد بائی کی سرائے کے گوش محل میں ایسا غائب ہوتا کہ اس سالی کو دوا کر پھر دکھائی نہ پڑتا کسی کو۔ اور ریل سے لے سرائے کے منیجر تک ہفتہ بھر کا رنگین و تابناک امیدوں بھرا خواب کابوس بن کر میرے رونگٹے رونگٹے پر سوار تھا۔ کلائیاں بھنبھوڑنے کو جی چاہتا۔ کسی کسی وقت سر دیوار سے ٹکرانے کو، بہر حال دنیا بہ امید قائم، کبھی کبھی خود کو بہت مضبوط زمین پر کھڑا محسوس کرتا، حکیم جی کی امانت تو میری تحویل میں تھی۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا جو ریل میں حکیم جی کے ہاتھ آگیا ورنہ حکیم جی تو کاروبار میں اتنے سرغپ ہوتے کہ عشق کرنا تو درکنار خواب و خور سے بھی بے نیاز ہوتے، سال بھر کی سارے گھر کی روزی کا دارومدار انھیں دوائیوں کی خریداری پر تھا اور بالآخر انھیں زود بدیر فارغ ہو کر کارونیشن ہوٹل سے پتہ لے کر یہاں پہنچنا ہی ہے۔ آج نہیں کل۔ آخر تابکے عیش کرتے رہیں گے۔ پھر دل کو سمجھاتا "میاں تم اطمینان سے بیٹھو"۔ مگر آئندہ کی امید میں چچا کباب میں ہڈی سے کھٹکتے نظر آرہے تھے۔ وہ سایہ اور ہمزاد کی طرح میرے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ خریداری تو پہلے ہی روز کرادی

تھی اب اصرار کے ساتھ رو کے ہوئے تھے اور کام صرف خوش گپیاں اور خوش خوراکی بریانی، قورمہ، مرغا، فیرنی، کباب، کوفتہ وغیرہ وغیرہ کھلانا اور کھانا رہ گیا تھا۔ اگر چچا کو رام کرنے میں دس پانچ فی صدی کامیابی ہوئی تو اندر سے چچی کا حکم نازل ہو کر اس تھوڑے بہت کیے پر پانی پھیر دیتا۔ آثار بتا رہے تھے کہ اس قدر سخت جکڑا ہے کہ قدم ادھر ادھر ڈال سکنا تو درکنار خیال کی گردن اک ذرا موڑنا بھی ممکن نہیں۔ یہ بھی کر سکتا تھا کہ اصرار کے ساتھ رخصت ہو کر عازم سفر ہوں اور بجائے سفر پر روانہ ہونے کے دہلی کے گوشے میں چھپ جاؤں لیکن چچا تو مردہ کو آخیر منزل اور جھوٹے کو دروازہ تک پہنچانے والی افتاد طبع کے لوگ تھے وہ تو مجھ کو ٹکٹ خرید کر ریل میں سوار کرا کر اور میرا بستر بچھا کر، ناشتہ دان اور پانی کا لوٹا بھر کر کم از کم اس وقت اترتے جب ریل رینگنے لگتی ورنہ جی میں آتا تو شاہدرہ تک ساتھ جاتے، بہر حال، بھوت، جن، مسان، دیو ہر ایک کا توڑ تھا اور سب کا منتر تھا لیکن جیتی زندگی چچا کے عزائیل سے چھٹکارا محال تھا۔ لہٰذا اس پہلو سے سوچنا ہی چھوڑ دیا۔

اور اس گتھی کو سلجھانے کے بجائے خود الجھ کر سویا تو حکیم جی خواب میں نظر آئے۔ چہرہ اور ہاتھ کالے ہو رہے ہیں اور صورت حکیم جی کے بجائے پہاڑی لنگور کی سی ہو رہی ہے .... میں اچھل پڑا۔ گھڑی دیکھی، رات کے ۳ بجے تھے، دو تین گھنٹے جاگتا رہا اور ان ہی گھنٹوں میں سوچتے سوچتے اور صبح کے تڑکے فجر کے اول وقت یوں ہی بغیر کلی کیے بستر سے اٹھ کر چل دینے کا یا کہ مفروری کا پروگرام بنایا۔ رات خواب دیکھا ہے، حکیم جی پیٹ بھر کے منہ کالا کر چکے ہوں، اور میری ..... کیا پتہ قسمت یاوری کر جائے۔ پھر خیال آیا کہ چچا آج ناشتہ کے وقت سے لے کر نہ معلوم کے دن ڈھونڈتے ہی پھریں گے دو چار دن عیش مار کر پلٹوں گا تو آئیں بائیں شائیں ہانک دوں گا۔ حالانکہ اندر والا مضبوط منطقی برابر بات کاٹ کر کہہ رہا تھا۔ "میاں چچا وہ نشہ نہیں جسے آپ کی آئیں بائیں شائیں کی ترشیِ صبوحی اتار دے یہ تو ہر بات کی جڑ تک پہنچ کر ہی دم لینے والی بے قرار افتاد طبع لے آئے دنیا میں۔ پھر اس ہانٹ کے شیر میں انھیں کوئی شبہ رہ گیا تو پہلے تو اسی شہر دہلی میں جڑ کھود کر نکال لیں گے اور بھلا دائی سے پیٹ چھپتا ہے۔ ورنہ پھر گھر پہنچ کر جواب طلبی کرا دیں گے۔ کئی مرتبہ یہ تو کہہ ہی چکے ہیں کہ میرے گھر آنے کی اطلاع دے کر کارونیشن ہوٹل میں قیام کا سبب ہنوز میری سمجھ سے باہر ہے۔" اور اس حرکت پر شاکی بھی ہیں اور متعجب بھی اور گو منگو میں بھی، بھولے نہیں ہیں۔ اس بدبو کو، اور ضرور گھر پہ جا کر پھیلائیں گے

اور والد تایا کے روبرو بھی، اور میرے پاس اس کا جواب نہ ہوگا کہ راستہ میں ارادہ کیوں بدلا اور وضع داری کے منافی ہوٹل میں کیوں قیام کیا، چچا کو کیوں شکایت کا موقع دیا۔ مگر میں نے اس اندر والے مضبوط منطقی کو دھکا دیا اور ایسے معاملہ میں "پہلے کر" "پیچھے سوچ" کے اصول پر مصمم ارادہ کر کے سو گیا کہ مرغ کی پہلی اذان پر بیٹھک کا دروازہ کھول کر چل پڑوں گا اور سرائے کے منیجر سے رابطہ قائم کر کے دو دن کی غیر حاضری کی روئداد معلوم کروں گا بلکہ حکیم جی کو نور ظہور کے وقت ان کی عشرت گاہ میں ہی جا کر دبوچ لوں گا.... اور جرأت رندانہ کر کے میں درحقیقت مرغے کی پہلی بانگ پر... بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پاجامہ کے اوپر جیسٹر پہن لیا اور بہت آہستہ سے بیٹھک کا کواڑ کھولا کہ چوں نہ کرنے پائے، اور بلی کی چال گلی میں اتر گیا۔ چند قدم گلی میں ڈالے تھے کہ مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی جو میرے کانوں کے بجائے سینہ پہ دھک سے پڑی جیسے نقب زن چور کو سنائی پڑتی ہوگی اور میں نے مفرور چور ہی کی طرح بڑی گلی کا راستہ چھوڑ دیا اور برابر والی نلتقی میں ہو لیا اس کے ساتھ چچا کی حویلی کے عقبی دروازہ کا راستہ ملتا تھا، اور مجھے بڑے زور سے چچا کے کھانسنے کی آواز سنائی دی اور چچا کے قدموں کی مخصوص چاپ، جو ہوش سنبھالنے سے کانوں میں رچی بسی تھی۔ میرے علم میں مطلق نہ تھا کہ چچا فجر کی نماز پڑھنے حویلی کے اس پچھلے چھوٹے دروازہ سے مسجد جایا کرتے ہیں، شاید چند ثانیہ بھی سوچنے کا موقع ملتا تو اس چور کی طرح جو چوری کر کے واپس آتے ہوئے گشت کے فارغ کوتوال کے سامنے آجاتا ہے بھاگ پڑتا مگر یک دم نلتقی اور چچا کے عقبی دروازہ والی پتلی گلی کے تراہے پر جس کو کہتے ہیں مڈبھیڑ ہو گئی۔

"اماں کہاں!!! ایں؟! کیا مسجد چل رہے ہو؟" چچا نے اوورکوٹ اور پاجامہ اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔

میں سمجھتا ہوں کہ رنگے ہاتھوں چور کا ایک دم پولیس کے چنگل میں پہنچ جانے پر عین یہی ردِ عمل ہوتا ہوگا جو میرا اس وقت ہوا۔ چھوٹے مُنہ سے اتنی بات بھی نہ بنا سکا کہ "ہاں مسجد چل رہا ہوں۔ آں۔ نماز کو۔" ایک تو سردی پھر بات بھی اس کے عین مطابق تھی۔ زبان ٹوٹ گئی۔ ہکلا کر بمشکل چچا سے کہا کہ "ان حکیم جی کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ کہاں رم گئے، ان کی امانت ان کے حوالے کرتا۔"

اور چچا کے مُنہ سے اس طرح نکلا جیسے میرے چہرہ پر قے کر دی "لاحول ولا قوۃ، یعنی مجھے

اس مرتبہ ایسا وسوسہ گذرتا ہے، میاں برا نہ ماننا، اور برا مانو گے تو چچا کو پرواہ نہیں، تمہارا ذہنی توازن ڈانواں ڈول سا ہے۔ تین دن سے دیکھ رہا ہوں پہلے تو واں منحوس ہوٹل میں میرا گھر ہوتے ہوئے قیام کی شان نزول آج تک میری سمجھ سے باہر ہے، پھر اس مرتبہ تمہیں اُڑا اُڑا کھویا کھویا سا پاتا ہوں۔ یعنی ایسی شوقیہ اور اچھی خریداری میں تمہاری دلچسپی محسوس نہیں کی، بیزاری، گریز، پھٹے پھٹے سے۔ اچھا چلو، جماعت کھڑی ہو جائے گی میں گھر سے سنتیں پڑھ کر چلا کرتا ہوں۔ تمہیں تو وضو کرنا ہے۔ بعد نماز، ناشتہ پر بات ہوگی، چچا مرحوم مجھے جیسے گھسیٹتے ہوئے مسجد میں لے گئے اور میں دل ہی دل میں یہ شعر پڑھتا مسجد پہنچا۔

نکلے تھے جستجوئے بت خانہ و صنم میں

بھٹکے تو آکے نکلے کہئے کہاں حرم میں

میں نے چچا کے برابر کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ سب نے فجر کی اور میں نے صلوٰۃ الخوف، یا نہ معلوم کون سی اللہ جانے .... مگر دعا کے وقت کم بخت وہی ناپاک خیال آیا۔ توبہ توبہ ....

اور اب، ہم مسجد سے واپس ہو کر چچا کے بیٹھکے میں براجمان تھے۔ آج صبح ہی صبح چچا نے انڈے پراٹھے کی بجائے محلہ کی دکان سے مخصوص مرغن نہاری اور خمیری روٹی منگائی تھی۔ خوشبودار حقہ کے کشوں میں چچا شروع ہو چکے تھے۔

"اماں یہ دحشت چہ معنیٰ! ۔ کہ ابھی اسی ساعت امانت واپس کر دو، اب تم پر کوئی بار بھی نہیں، جیب کترنے کا خوف رقم اطمینان کے ساتھ تمہاری چچی کی صندقچی میں رکھی ہے، آتے ہی تمہیں ہلکا کر دیا تھا میں نے تو، انہیں حکیم جی کو جب ضرورت ہوگی آکر لے جائیں۔ پھر بندہ خدا یہ صبح تڑکے کیا ہول اٹھا جو یوں بھاگ پڑے۔ چلو ہم بھی ساتھ چلیں گے۔ حکیم جی کا سراغ وہیں ملے گا ان دوا کے دلال کے یہاں۔ حکیم صادق حسین عطار نا۔ صورت آشنا میں بھی ہوں کچھ یاد پڑتا ہے اور وہ تو مجھے اچھی طرح پہچانتے ہوں گے۔ بس بلیماراں تک ہے نا!"

میں گھٹ کر رہ گیا۔ چچا اس وقت پھر مجھے پیر تسمہ پا محسوس ہو رہے تھے۔" پہلے تو کارونیشن میں جو منصل پتہ کا پرچہ چھوڑا ہے، وہی کافی ہے اور کوچہ پنڈت کیا دلی بھر میں" چچا مرحوم" کہہ کر جس سے گھر کا پتہ پوچھو گے بتا دے گا۔" شاید کوئی تانگے والا ہو جو نہ جانتا ہو۔ پھر میاں مجھے

تمہارے اضطراب کا سبب سمجھ میں نہیں آتا۔ بھئی مجھے یہ تلون پسند نہیں اور تمہیں تو میں بچپن سے پہچانتا ہوں، پھر میاں اب منہ پر مونچھیں داڑھی آگئی ہے، آج شادی کر دو، سال اندر بیٹے کے باپ بن جاؤ گے — یہ تلون یہ سیماب پائی اور غیر وضعداری زیب نہیں دیتی۔ ہر کام منصوبہ بنا کر اطمینان کے ساتھ کرو۔ عافیت اسی میں ہے۔ ذرا یہ تو سوچو تمہاری ذمہ داری کیا ہے امانت پہنچانے کی، جس وقت انھیں ضرورت ہوگی خود آکر لے جائیں گے۔ ہوٹل میں پرچہ چھوڑ ہی آئے ہو۔ تمھوں اور پھر یہ بھی عین قرین قیاس ہے کہ ان بے چارے کو سر دست اس کی ضرورت ہی نہ ہو اور ممکن ہے کسی کاروباری مصلحت کی بناء پر اپنے پاس رکھنا نہ چاہتے ہوں اور تم خواہ مخواہ ان غریب کے گلے میں لے جا کر باندھ دو — ایں! بھلا سوچو تو — انھوں نے تم پر بھروسہ کر کے اپنی سہولت کے خیال سے تمہاری تحویل میں دی — دوستی کے معنیٰ مدد اور اطمینان فراہم کرنے کے ہیں، جب ہم کوئی مالی فائدہ نہیں پہنچا سکتے تو سہولت ہی سہی۔"

چٹ پٹی نہاری اور حبشی حلوہ کھلا کھلا کر چچا مرحوم جیسے میری کھوپڑی پر ڈنڈے ہی ڈنڈے برسا برسا کر مجھے زچ پہ زچ کرتے رہے میرا بھیجہ ریزہ ریزہ ہو کر منتشر ہوتا رہا۔ ان کا خلوص اور منطق کالے سانپ کے زہر کی طرح میرے خون میں رسنے لگا۔ غش سا آنے لگا، والہانہ انداز میں بھنگڑی کی طرح اناپ شناپ کھاتا چلا گیا، ذائقہ کے احساس سے بے نیاز شاید معمول سے تگنا چوگنا کھا گیا — ہونٹوں سے لے کر معدہ تک جیسے ہر جگہ ناشتہ بھر گیا اور چچا کا دوسرا حقہ بھر کر ملازم لڑکا رکھ گیا تو میں بستر پر جا لیٹا۔ آنکھیں بند کر لیں، چچا یہ کہتے ہوئے اندر کو اٹھ گئے۔

"میاں تم بھی تیار ہو لو — میں ذرا شیروانی ڈال لوں، یہ معاملہ ابھی طے ہو جائے۔ چل کے ان کی رقم پہنچا آئیں ورنہ دریافت کر آئیں کہ کب تک ضرورت ہوگی، آکر لے جائیں مفت کا بوجھ، تم ناتجربہ کاری میں وہاں ہوٹل میں اکیلے تن تنہا دبائے بیٹھے رہے۔"

خیریت گذری — میں نے چچا کو روکا — "نہیں نہیں نہیں چچا — رقم، ہوں، آں — مگر آپ کی بات میری سمجھ میں آگئی ابھی۔"

میں نے رات بھر تیز بخار میں مبتلا رہ کر علی الصبح پسینہ آکر اتر جانے والے مریض کی طرح نحیف آواز میں کہا —

"یعنی پھر وہی تلوّن — یا تو اتنے تڑکے جا رہے تھے، اب کی مرتبہ یہ تمہاری حالت کیا دیکھتا ہوں۔ کھوئے کھوئے ہوئے ہو۔ ویسے تو تمہاری یہ تڑپ اچھی نفع بخش رہی۔ کیا گھر پہنچنے کی جلدی۔ یہ ماجرا کیا ہے میاں؟" میں بدنصیب چپ رہنے کے سوا کرتا بھی کیا۔ چچا ایک، دو منٹ خاموش رہے غالباً دن بھر کے پروگرام بنانے کو میرے آغاز کلام کے منتظر۔ میں بیزار تھا، وہ میرے ساتھ قلبی اور گہری دلچسپی لے رہے تھے۔ پھر خود ہی کہا ابھی دس دن اور ٹھہراؤں گا، ہوٹل کی کسر نکالوں گا۔ خریداری تو سب کر چکے لاؤ اس دوران لگے ہاتھوں تمہارا سوٹ بھی سلوادوں۔ پنڈت برادرس، ویسے تو بہت بڑھ بولا ہے۔ سچ پوچھو تو اس کے ریٹ ہماری پہنچ سے باہر ہیں مگر میرے توسط سے انھیں ادھر دو تین برس سے چھاؤنی کے کئی بڑے بڑے آرڈر ملے ہیں۔ اور میں نے ان سے کبھی ایک بٹن بھی نہیں ٹکوایا ہے، اگر کچھ ہاتھ پر دھر دو گے تو بغیر گنے رکھ لیں گے۔ ویسے جتنے میری ذات سے مستفیض ہو چکے ہیں اس کے پیش نظر خواہ بکرم استر وغیرہ مٹیریل لے لیں مگر کام انھیں فری کرنا چاہیے، میں نے تو اپنا کمیشن چھاؤنی سے پایا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو دونوں جانب سے ٹھہراتا۔ تب ان کا ٹنڈر سپھل ہوتا۔"

میرا دم گھٹنے لگا۔ چچا کا خلوص سایہ ہمزاد کی طرح میرے ساتھ لگا ہوا تھا۔ یا اللہ کیسے گلو خلاصی ہو، یہ تو ستو باندھ کر پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اور مجھے کسی وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی ٹکسالی جیل کی اس کال کوٹھری میں بند ہوں جس کی گنجائش اتنی ہوتی ہے کہ دھوک لگا کر بیٹھنے کے بعد شکل سامنے والی دیوار تک پاؤں پھیل سکتے ہیں اور جن میں شوریدہ مزاج قیدیوں کو تھوڑی مدت رکھا جاتا ہے۔ جان پر بنی ہوئی تھی۔ ان کا خلوص تو خیر فطری تھا لیکن اس کے نتیجہ میں یہ بے پایاں عنایت اور سب سے زیادہ یہ توجہ نہایت سخت، بس دوزخ کے عذاب کے مترادف تھا۔ کوئی راہ فرار دور دور نہ تھی۔

اتنے میں کسی نے بیٹھکے کے دروازے پر دستک دی۔ چچا جب تک لگائی منہ نے علیحدہ کر کے آرام کرسی سے 'ہمکیں ہمکیں'، میں آہوئے رم دیدہ کی مانند چوکڑی بھر کر دروازہ پر جا پڑا۔ اور آج صبح ہی سے کشش صادق ہو رہی تھی۔ سرائے کا ایک ہرکارہ حکیم جی کا ایک سطری پرچہ لے کر آیا تھا "برادرم میری امانت جو آپ کی تحویل میں ہے لے کر ابھی فوراً پہنچیے"۔

پرچہ پڑھتے ہی میں نے اس ملازم کو فوراً الٹے پاؤں بھگا دیا۔ مبادا کہیں بزرگوار اٹھ کر نہ آجائیں اور کچھ نہیں تو حکیم جی کی صحیح جائے قیام ہی معلوم کر لیں۔ تاہم انھوں نے بیٹھے ہی بیٹھے دو آوازیں دیں۔

"کون ہے؟ کیا ہے؟" میں پلٹا۔ پہلے تو ڈرا کہ کہیں موصوف ہمرکاب ہونے کی کوشش نہ کریں مگر کوئی بات بن نہ پڑی "کس کا پرچہ ہے؟" میں نے اللہ کا نام لے کر مجبوراً پرچہ بڑھا دیا۔ "بہت ٹھیک، بہت ٹھیک۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ تم جلدی سے جا کر ان کی رقم حوالہ کر کے آؤ۔ اتنے میں میں غسل کر رکھوں گا۔ اگر تم جلدی لوٹ آئے تو دوپہر کے کھانے سے قبل ہی چلیں گے۔ کشمیری گیٹ پنڈت برادرس، تمہارا سوٹ دیتے۔ ورنہ پھر سہ پہر میں ذرا آرام کر کے ہے نا؟"

یہ کہتے ہوئے اٹھ کر اندر گئے اور حکیم جی کا پرس لا کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں چلنے لگا تو بولے۔ " دیکھو جی کہیں ان کے واں کھانا مت کھانا۔ تمہاری چچی آج۔ سیخ کباب بنا رہی ہیں اور خستہ پوریاں، میں انتظار کروں گا۔ گرم گرم سیخیں اور پوریاں اترتی جائیں گی کھاتے جائیں گے۔ دے کر فوراً آجانا۔ اس پہر نہیں تو اُس پہر۔ پنڈت برادرز سے جا کر نپٹ لیں گے، شام کشمیری گیٹ پر مجمع زیادہ ہو جاتا ہے، دکان داروں کے دماغ چڑھ جاتے ہیں۔ ویسے پنڈت برادرس میں کوئی بات بھی نہیں مگر پھر بھی۔"

چچا کہتے رہے اور میں بندر کی سی جست لگا گلی میں چلا گیا اور پو فدا ما چلا، مقدر روشن ہو رہا تھا۔ گلی کے نکڑ پر ہی ایک خالی تانگہ مل گیا۔ ارمان پورے ہونے کی رنگین آرزوئیں بر آئی تھیں رنگین تصوروں میں کھویا سفر کر رہا تھا۔ چچا بیچارے کے فرشتے بھی میرا سراغ نہیں پا سکتے۔ منزل زیر قدم نہیں زیر نشست تھی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ایک آدمی کے بدن میں جو خون آج دوڑ رہا ہے وہ سولہ ہفتہ بعد بدل کر دوسرا نیا ہو جاتا ہے۔ تانگے کو احمد بائی کی سرائے پہنچنے میں تقریباً پندرہ منٹ لگے اور میرا خیال ہے کہ میرا خون ہر منٹ میں ایک ایک مرتبہ نیا ہو ہو گیا۔ آنکھوں کے سامنے قوس قزح غبارے ناچتے رہے، بار بار کہنیوں، بانہوں، بغلوں وغیرہ میں سرور کی لہریں سنسناتی رہیں، ہونٹوں پر آپوں آپ مسکراہٹ کی موجیں کھیلتی رہیں۔ اور سینہ کے اندر سے نغموں کی گنگناہٹ سی اٹھ اٹھ کر آپوں آپ زبان تک آتی رہی۔ ہوں، حکیم جی نے بالآخر شہد کی چسکیاں لگاتے لگاتے مجھے بھی یاد کر ہی لیا آج، اگرچہ وقت بہت سخت گذرا چلو کام سے فراغت ہو گئی اور جب تک چاہوں گا میری مرضی پہ

ہے ۔آزاد ہوں۔ سرائے کے پھاٹک پر اس طرح اترا جیسے کسی دیسی ریاست کا ولی عہد رسمِ تاج پوشی اور تخت نشینی کے لیے جاتا ہے۔ خلافِ معمول سرائے میں مبہم سی خاموشی تھی' یہ میری داخلی امنگوں کے عین مطابق اور میرے موڈ کو نہایت خوش آئند و سازگار تھا۔ گویا خلوت کا سماں شروع ہی سے محسوس ہوا آتشِ شوق تیز تر ہوئی۔ وعدہ وصل بالکل نزدیک تھا۔ حکیم جی کی قیام گاہ کی جانب جیسے پاؤں کے بجائے بازوؤں میں لگے ہوئے پروں سے اڑتا ہوا بڑھا۔

اور جوں ہی اس جگہ پہنچا جہاں پچھلے ہفتہ بھر سے دھکے کھا کھا کر ناامید ہو ہو کر پلٹتا رہا تھا' دھک سے ہو گیا۔ ساتھ ہی۔ آ گئے۔ آ گئے کی ہلکی ہلکی دو تین آوازیں کان میں پڑیں۔ حکیم جی کے پیش دروازہ پر درجن بھر لال پگّے پولیس کے مسٹنڈے تعینات تھے۔ ویسے تو میں قانون کے قاف سے بھی ناواقف محض اور اس کی ذمہ داریوں سے جاہل مطلق تھا۔ لیکن بہر حال پولیس کا خوف تو ہر آدمی کے دل میں پوتڑوں کا پڑا ہوتا ہے۔ ایک دفعہ تو جی میں آیا کہ الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوؤں۔ لیکن اک ذرا ٹھٹکا۔ اتنے میں دو داروغے چست وردیوں میں کسے لال پگڑیوں پر سنہرے جھبے لٹکائے خلافِ معمول ایسے نرم اور استقبال کرتے ہوئے تیوروں سے بڑھے جیسے ایک میرے خسر ہیں اور دوسرے سالے یہ خندہ پیشانیاں ان کے وجود پر انمل بے جوڑ نظر آ رہی تھیں جیسے تھانہ کے بہروپئے' پہلے کھچڑی مونچھوں والے نے گرم جوشی سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"میں کوتوال ہردوئی۔"

اس کے بعد کالی مونچھوں والے نے بڑی نرمی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے تعارف کرایا۔

"فدوی انچارج تھانہ چاندنی چوک۔"

دونوں نے اس قدر ثقہ انداز میں مصافحہ کیا جیسے قصبہ کی مسجد میں بعد نماز جمعہ پیش امام صاحب رخصت ہوتے ہوئے نمازیوں سے خشوع و خضوع کے ساتھ شرعی نوعیت کا کیا کرتے ہیں اور دونوں نے مخصوص تواضع کے انداز میں جیسے ہاتھوں ہاتھ لیے ہوئے چند گز کا فاصلہ طے کیا۔

ادھر پولیس کے جوانوں کے حلقہ کے اندر سے بڑے زور سے رونے کی آواز آئی۔ یہ حکیم جی نے مجھے دیکھ کر ڈیک ماری تھی۔ میں نے چونک کر دیکھا تو حکیم جی ایک تپائی پر بیٹھے تھے۔ ذرا بڑھا تو آنکھیں نیچی کرلیں اور دوسری ڈیک ڈھاری جیسے سینہ اور پیٹ کی گہرائیوں سے اٹھی۔ مگر ردِ عمل میں میرے اوپر رقت کے بجائے خوف طاری ہوگیا مگر بکمال انداز تواضع ہر دو پولیس افسر مجھے ایک جانب لے گئے اور اس نفاست اور نرمی کے ساتھ جیسے گلدستہ لگاتے ہیں ایک آرام کرسی پر بٹھایا اور دائیں بائیں دو چھوٹی کرسیوں پر خود بیٹھ گئے۔ میں نے کنکھیوں سے دونوں کے بشرے بھانپے لیکن ان کے چہروں پر تو اس وقت ضابطہ والا مخصوص خول بھی نہ تھا۔ اگر وردیاں نہ ہوتیں تو ڈاک خانہ کے بابو یا بنک کے منیجر معلوم پڑتے۔ تاہم جسمانی طور پر آزاد ہونے کے باوجود جیسے میں گرفتار محسوس کر رہا تھا۔ دونوں نے اپنی کرسیاں دائیں بائیں میری کرسی سے بھڑا لی تھیں۔

کھچڑی مونچھوں والے کوتوال نے آغاز کلام کیا۔

" دیکھئے چودھری صاحب، ہماری بات آپ کے ان دوست مولانا حکیم جی سے پکی ہوگئی ہے۔ ان کی امانت کا ایک ہزار روپیہ ہمارے حوالے کیجیے ان کی جان آبرو بچائیے بیچارے شریف آدمی ہیں اور حکیمی پیشہ۔ آپ کو پرچہ بھیج کر مع امانت کے بلایا ہے۔ چکر میں آگئے ۳۶۳ دفعہ تعزیرات ہند تو کھلی ہوئی عائد ہے، چلتی ریل میں سے بنئے کی نابالغ لونڈیا پھانس لائے، 'کڈنیپنگ' کا کھلا ہوا جرم، وہ سہی حکیم جی، پھرنا تجربہ کار کل کے لونڈے، اندھی جوانی دیوانی، بے چارے اندھلا گئے، چکا چوند ہو کر مزے میں بھر کر، ہوں پھر تالونی چنگل۔ نبض قارورہ تو ہوتا ہی نہیں۔"

غوں۔ غاں۔ غپ۔ دوسرے پولیس افسر نے اپنی جانب متوجہ کیا تیور بدستور نرم تھے البتہ حکیم جی کے متعلق بات کرتے ہوئے چہرہ بدل جاتا تھا۔ میں اپنی عمر میں آج پہلی مرتبہ کسی پولیس والے سے بالمشافہ بات چیت میں آیا تھا، تاہم اس محکمہ کی روایتی بوالعجیاں سُن رکھی تھیں، ساتھ ہی ساتھ ریل میں لڑکی اور حکیم جی سے لے کر اس وقت یہ بھی پہلی مرتبہ علم میں آیا تھا کہ یہ فعل سنگین جرم بھی ہے۔ اور یہ احساس اس وقت دوسرا رخ اختیار کر گیا کہ معاملہ

اس پہلو سے بھی بہت نازک ہے ورنہ اس وقت تک تو صرف بدنامی اور گھر والوں کا ڈر تھا۔ بات تو سانپ کے مُنہ کی چھچھوندر بن گئی تھی کم بخت۔ گھر تو گھر اطلاع۔ اگر صادق حسین یا چچا کو مدد کے لیے پکاریں تو بھی ڈوب مرنے کا مقام، لمبے چوڑے اختیارات والے پونے انسروں کے منہ سے ہائی کورٹ کے بڑے جج سے بھی بڑھی چڑھی بات سن کر میرے بدن میں مار گزیدہ کی طرح خون سرد ہو کر جمنے لگا۔ ان پڑھ ماہرینِ نفسیات کے وردیوں میں ملبوس جسموں میں سے ڈائنمو کے کرنٹ نکل نکل کر میرے اندر نفوذ کر رہے تھے اور مجھے صریحاً اپنے کمر کے زیریں حصہ سے برف کی سلائی گردن اور سر کے جوڑ تک چڑھتی اترتی محسوس ہوئی۔ الحفیظ والاماں! کڈنیپنگ کا مہیب اور گھنونا لفظ کبھی کبھی اخباروں میں جرائم کی خبروں پر چھچھلتی نگاہ ڈالتے ہوئے پڑھا ضرور تھا، وہ بھی چھوٹے چھوٹے بچّوں کی چوری کے معنیٰ میں نہ کہ بدچلن عورت کو اس کی مرضی سے ساتھ لے جانے پر اطلاق! گویا یہ سب کڈنیپنگ تھا جو اس رات ریل سے آج تک ہوتا رہا اور اس مجرم کے پیچھے بھی پولیس، ڈاکو، رہزن، قاتل کی طرح لگ سکتی ہے، ہمارے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ میں بھی اور حکیم جی بھی "میاں بیوی راضی تو کیا.... کرے قاضی" سمجھ رہے تھے۔ اگرچہ میں ملوّث نہ تھا تاہم اپنی گردن پھنسانے میں کوئی دقیقہ اپنے پاؤں چل کر اٹھا بھی نہ رکھا تھا۔ تین چار دن میں کارونیشن ہوٹل میں احمد بائی کی سرائے، احمد بائی کی سرائے سے کارونیشن ہوٹل تک سڑک ناپ ناپ کر۔ لیکن ارتکابِ جرم کی خوشبو سے بھی محفوظ رہا تھا۔ حوصلہ یوں بھی ذرا صحیح سا تھا گو کہ ضمیر میرا بھی ملوث تھا اور پھر اس وقت ان دونوں پولیس افسروں کا برتاؤ مزید حوصلہ زا اور امید افزا تھا۔

"دیکھیے چودھری صاحب۔ ہم تفتیش مکمّل کر چکے ہیں۔ یہ آخری مرحلہ ہے۔ حکیم جی ادھر ہوتے ہیں یا ادھر ویسے آپ بالکل پریشان نہ ہوں حالاں کہ بھرپور کیس پہلے تو قانوناً اعانت جرم میں تو اوں، آں، آپ بھی لپٹتے ہیں۔" انچارج نے کہا۔

لیکن کوتوال نے اس کے مُنہ کی بات لے لی۔ "نہیں میاں، ہمیں آپ سے کوئی تعرض نہیں ہے، ہم نے تو آپ کو بغیر ہی دیکھے پہچان لیا تھا۔ شریف النفس، نیک بخت جوان صالح۔ واردات کا آپ سے کوئی تعلق نہیں، یہ اعانت وغیرہ کچھ نہیں لیکن اگر حکیم جی پر کیس چلتا ہے تو کم

از کم گواہی مشاہدی میں تو آپ کو یاں سے واں تک ضرور جانا پڑے گا اور حکیم جی پر اگر کیس چلتا ہے تو دفعہ ۳۶۳ کے ساتھ ساتھ ۳۶۵، ۲۷۹ وغیرہ تعزیرات ہند بھی عائد ہوتے ہیں۔"

"جی ج۔ج۔ج کیا؟ اس کا کیا مطلب عائد ہوتا ہے۔" میں نے ہکلا کر پوچھا۔

"جناب کڈنیپنگ، نابالغ کا اغوا۔ حبس بے جا کسی کو پکڑ کر حراست میں رکھنا۔ زنا بالجبر زبردستی نابالغ لڑکی کی آبروریزی کرنا، اور چوری کرنا یا داشتن مال مسروقہ، لڑکی کے خالی کپڑے اور کالوں کے ٹھندے پائے جانا، جرائم اس کے ساتھ آپوں آپ عائد ہو جاتے ہیں۔ سمجھے میاں۔" پولیس افسر نے پرائیوی کونسل لندن کے ایڈوکیٹ جنرل کی طرح تیور بنا کر مولوی نذیر احمد کی وضع کی ہوئی قانونی اصطلاحیں بیان کر دیں۔

ادھر ہر دوئی والا بوڑھا کوتوال سگریٹ کے دھوئیں میں میرا چہرہ بھانپتا رہا اور بولا میاں ایک ایک جرم میں سات سات قید بامشقت، مگر وہ تو معاملہ ہی ختم ہو گیا۔ ابھی حکیم جی سے ہماری بات پکی ہو گئی بے کار تفصیل کراتے ہیں تضیع اوقات، ویسے ہم تفتیش کرتے ہوئے پوست کندہ صورت حال تک پہنچ گئے ہیں اور حکیم جی نے ہمارے روبرو اقبال جرم کر کے معاملہ رفع دفع بھی کرا دیا بات پکی ہو گئی۔ آپ سے نہ کوئی مواخذہ قانونی تھانہ ہے، آپ محض حکیم جی کے امانت دار ہیں، انھوں نے وہ رقم ہمیں دے دی ہے۔ اب آپ ہمارے امین ہوئے، ہمیں عنایت فرمائیے، پکی بات ہے ایمانی، کوئی دغل فسل نہیں ان کا دستخطی پرچہ آپ کے پاس ہے، رقم حوالے کیجیے ان کے۔"

میں نے کنکھیوں سے کوتوال کے تیور دیکھے تو تسلی ہوئی۔ ورنہ مطالبہ نہایت ہی دھاندلی کا تھا اور جملہ ختم کرتے کرتے تھانہ دار انچارج چاندنی چوک کا لہجہ بھی روکھا ہو گیا تھا اور شاید اس کا اندازہ کر کے کوتوال نے بھی تلافی مافات کی۔

"آپ بالکل فکر نہ کریں، شرافت، شرافت کو خوب پہچانتی ہے، ہم لوگ بحمداللہ شریف ہیں آپ لوگ بھی ماشاءاللہ ہم ہی جیسے شریف خاندان اور شریف النفس، ویسے تو جرائم ایک سے

ایک بڑھ کر سنگین ہیں۔ بتایا ہی ابھی، مگر حکیم جی کی شرافت اور ان کے پیشہ کی نزاکت پر نظر کرتے ہوئے ہم نے خود ہی خیال کیا، پھر یہ بھی چیز مد نظر تھی کہ پیشہ طبابت سے اگر کیریر برباد ہو گیا تو خیر ان کی تو یہ ہے جیسی کرنی ویسی بھرنی، مگر عمر بھر میں لکھو کھا بندگان خدا اور پھر وہ بھی کون دکھی مریض مخلوق جو ان سے مستفید ہوتی وہ محروم ہو جائے گی۔ سب ٹھونک بجا کر انھوں نے برضا و رغبت ہم سے معاملہ کیا ہے لہٰذا ان کی وہ رقم ہمیں مرحمت فرمائیے۔"

"خیر وہ تو میں نے آپ کی بات یقین کر لی، مگر میں ان سے ایک بات کروں گا اور آپ کے معاملے میں اور آپ تو تجربہ کار اور قانون پیشہ آدمی ہیں، دنیا جہاں کا دستور ہے روپیہ پیسہ کے معاملہ میں ہاتھ کو ہاتھ پہچانتا ہے۔"

انچارج تھانہ نے کہا۔۔۔ "میاں آپ خواہ مخواہ مفت میں پس و پیش کر رہے ہیں' وہ حکیم جی بے چارے مجمع عام میں کیسے بندھے تماشہ بنے بیٹھے ہیں' اور بھئی ہمیں تو شرفا کی عزت کا ہر پہلو سے لحاظ رہتا ہے۔" پھر اپنی نوکری کو (گالی)۔۔۔ "یہ کام ہی ایسا پاجی ملا کہ شریف کمین سبھی سے نبٹنا پڑتا ہے۔"

اور مجھے اندازہ ہوا کہ ہر دو پولس افسران شرفا کی عزت کے تحفظ میں حد سے بڑھے ہوئے راسخ و صنعدار ہیں' بات اس طرح سے ہو رہی تھی جیسے بنئے سے سودا ہو رہا ہے۔ میں نے ایک ذرا توقف کیا تو کوتوال نے کچھ کچھ تفاصیل بیان کرنا شروع کیں۔

"میاں ہم تو شریفوں کی پردہ داری اپنا اصول رکھتے ہیں ورنہ دیکھئے بجائے اس کے کہ ہم حکیم جی کو ہتھکڑیاں چڑھائے لے کر وہاں پہنچتے پنڈت کے کوچہ آپ کے چچا کے یہاں تو بات پہلے دلی میں آپ کے حلقوں میں آرے آرے ہو جاتی پھر آپ کے شہر آکے آپ کے بزرگوں اور متعلقین میں یہاں سے واں تک بدبو پھوٹتی۔۔۔ حکیم جی کا سوا سو برس کا جما جمایا مطب برباد ہو جاتا۔ پشتیں بھوکی مرتیں۔۔۔ ساکھ مٹی میں مل جاتی۔ مگر خیریت گزری ان کی آنکھیں فوراً کھل گئیں۔۔۔ موتی کی آبرو"۔ اور میں نے غور کیا تو بوڑھا گھاگھ کوتوال میرے چیسٹر کی اندر والی جیب کو اوپر سے بھانپ کر۔ اندازہ لگا رہا ہے کہ میں رقم لایا ہوں یا میں چھوڑ آیا ہوں جہاں مقیم تھا۔

میں نے ان کے نرم رویہ سے ذرا حوصلہ لے کر کہا۔۔۔ "دیکھیے۔ روپیہ پیسہ کا معاملہ ہے۔

میں نے عرض کیا نہیں ابھی رسمی بات کروں گا اور رقم ان کے مواجہ میں پیش کروں گا، ورنہ کل کو وہ میری گردن پکڑ سکتے ہیں۔"

"دیکھیے ـــ وہ ہماری حراست میں ہیں، قانون کی رُو سے ان سے بات کرنے کا کوئی مجاز نہیں۔" انچارج تھانہ نے ذرا ضابطہ کے تیوروں سے کہا۔ اور میری جانب مشتبہ سی نگاہوں سے دیکھا۔

میرے ہونٹوں تک اس وقت ان کی بات کا جو جواب تھا۔ آتے آتے رہ گیا۔ کوتوال نے اس کا احساس کر کے معاملہ کو سنبھالا۔ "اور امانت آپ ساتھ لے کر آئے ہیں نا اس وقت؟" لہجہ میں مٹھاس تھی۔

"جی، ان کے پرچہ کے مطابق، میری جیب میں ہے ان کی رقم۔"

کوتوال نے ڈھیلا پڑتے ہوئے کہا ـــ "جانے دیجیے، بلا لیجیے انھیں بھی، بات تو ہماری پکّی ہے مگر یہیں پر ہماری سماعت مواجہ میں جو بات ہو کر لیں۔"

میں نے درست ہو کر کہا ـــ "جناب آپ لوگ جو مفت میں اتنی دیر سے بدگمانی کر رہے ہیں ـــ بھلا سوچیے تو مجھے کے رکعت کا ثواب ہے جو انھیں بہکاؤں گا، میرے مقروض بھی تو نہیں ہیں حکیم جی، بھلا جو میں یہ سمجھوں کہ آں ـــ وہ کوٹلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے میں تو خواہ مخواہ کا امانت دار ہوں، وہ جانیں ان کا کام آدمی اپنا نیک و بد خود سمجھتا ہے۔ انھیں نہیں دکھائی پڑتا اگر رقم بھر دیں گے تو ابھی گلو خلاصی ہو جائے گی ورنہ تھانہ کچہری ہو گا سیشن تک خواری ہو گی اور پھر بھی چھوٹنا نہ چھوٹنا اللہ کے ہاتھ میں تو ان کے سامنے یہ رقم پیش کر دینے کا ذمّہ دار ہوں ـــ بس۔"

کوتوال نے کہا۔" ہاں ہاں بلا لو ـــ لے آؤ۔ اور پھر میری جانب مخاطب ہو کر بولے۔ ہو تو خیر نوجوان مگر درحقیقت عقلمند بوڑھوں والی سمجھ پائی ہے اور کسی اچھے عقلمند گھرانے کے سپوت فرزند۔ زندگی میں کبھی مار نہیں کھاؤ گے ـــ بس اگر آپ کے دوست اس وقت کچھ پس و پیش کریں، پہلے تو سب طے ہے کریں گے نہیں، اور اگر بفرضِ محال کریں تو بحیثیت ایک عقلمند اور پرخلوص دوست کے یہی بات سمجھا دینا ورنہ قانون اپنا راستہ لے گا اور اس

طرح وہ آج اور ابھی اپنا رستہ پکڑیں اور ہم اپنے رستہ جائیں۔"

اور کوتوال کے انداز پر میں نے درست ہو کر کہا ـــ "صاحب ــ وہ جانیں اور ان کا فعل، میری ان کی شہرداری کی یاد اللہ چلی آتی ہے، اور اس میں یہ رہتا ہی ہے اعتبار، ہمدردی اب آخر ہزار روپے کی رقم یہاں پردیس میں انھوں نے میرے ہاتھ میں امانت دے دی ـ"

اور میں نے غور کیا کہ پولیس افسروں کے تیوروں میں بنیا جھلک رہا ہے جو ایسے نازک موقعوں پر اندر سے نکل آتا ہے۔ انھیں حکیم جی سے مطلق کوئی پرخاش نہ تھی نہ وہ حکیم جی کو کیس میں لانا چاہتے تھے وہ مفردات خصوصی والی رقم اینٹھنا چاہتے تھے اور حکیم جی کا جملہ معترضہ پوری عبارت روزنامچہ سے حذف کرنا چاہتے تھے اور سیدھا سادہ کیس بھاگیرت پر چالو کرنا چاہتے تھے، جس کی اسٹوری انھوں نے اپنے ذہن میں گڑھ رکھی تھی حکیم تو تفتیش کے درمیان کا معمولی سا روڑا تھے ایسے کیسوں میں تو رپورٹ ابتدائی سے ہائی کورٹ تک نہ معلوم کتنے نشیب و فراز سے گذرتے جیبیں گرم کرتے چلے جاتے ہیں اور یہاں تو جیب کے ساتھ پہلو گرم ہونے کا بھی سامان تھا..... میں نے خود کہا کہ پولیس افسروں کا... معاملہ کر لینے کی جانب رجحان شدید ہے۔ اور حاکم عامل ہو یا سیٹھ ساہوکار یا رہزن ڈاکو، یا لارڈ ولیم بنٹنگ کے زمانہ والا تاریخی ٹھگ گنتی یاد رکھنے کے معاملے میں سب یکساں ذہین ہیں، اور سمجھ گیا کہ اس وقت حکیم جی رنگے ہاتھوں ان کے شکنجے میں ہیں اور یہ حکیم جی کو بہ ایں ریش دستار قانوناً اسی طرح باندھ کر لے جانے کے قطعی مختار و مجاز ہیں اور سیشن ہائی کورٹ جج تک گھسیٹ بھی سکتے ہیں اور پچاس فی صدی سے زیادہ امکان ہے کہ قید کرا سکتے ہیں لیکن ہاتھ کے ہاتھ چٹ پٹ حکیم جی سو فی صدی جبھی چھوٹ سکتے ہیں اور انھیں بھی ہزار روپیہ کی رقم جبھی مل سکتی ہے، جب معاملہ ہو جائے حکیم جی پر کیس چلا کر سزا کراتے ہیں تو ان کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا ہزار روپیہ تو ان کی سال بھر کی تنخواہ ہے، اور حکیم جی اگر عدالت سے چھوٹ گئے تو محکمہ کی جانب سے جواب طلبی اور اعمال نامہ میں سیاہ اندراج ہے اور سزا ہو گئی تو معمولی فرض منصبی کی ادائیگی ..... اور فربہ شکار پہلی جھپٹ میں ہاتھ آتا ہے، بقیہ مقدمے چلاتے رہیں گے ـ

تھانہ دار انچارج تیزی سے اٹھ کر باہر گیا اور چڑھاوے کے بکرے کی طرح کشاں کشاں حکیم جی

کو اندر لے آیا۔

کوتوال صاحب نے بزرگانہ تیوروں اور مشفقانہ انداز میں کہا ۔" میاں حکیم جی، ہماری بات آج تک کچی نہیں ہوئی، جس کی بات نہیں اس کا باپ نہیں ۔ ہم تو شریف زادے ہیں اور شریف زادوں کی عزت کا پاس کرتے ہیں اور یہ کار منصبی ہی ایسا پاجی ہے (اپنے آپ کو گالیاں)۔

حکیم جی سے میری نگاہیں چار ہوئیں ۔ آنکھیں روئی ہوئی تھیں ۔ بھووں کے اشارہ سے دریافت کیا کہ رقم حوالہ کر دی؟ میں نے نفی میں اشارہ کیا، انھوں نے اشارہ کیا کہ دیدو ۔ اور میں نے حد شرعی پوری کرتے ہوئے پرس نکال کر حکیم جی کے ہاتھ کی جانب بڑھایا لیکن وہ اچھی طرح گرفت میں لے بھی نہ پائے تھے کہ انگلیوں کی نوک میں سے کوتوال نے کھینچ لیا اور جس طرح سال بھر خون پسینہ ایک کر کے کسان گیہوں بیچ کر آڑھتی سے قیمت پانے کے بعد اطمینان سے شمار کرتا ہے، اسی طرح کوتوال نے پرس کھولا، اور رقم شمار کی اور پنچوں بیچ گن کر اندر والی جیب میں رکھ لی، اور پر انچارج نے کنجی جیب سے نکال کر ہتھکڑی کھول دی۔ حکیم جی کھٹ سے آزاد ہو گئے۔ ہاتھ کھلتے ہی انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے غلیظ بوسیدہ تہمد کی گھنڈی درست کی، اب میں نے سر سے پاؤں تک پرتالا تو غور کیا کہ حکیم جی کے بدن پر ایک پھٹی میلی بنیان ہے اور ٹانگوں میں جھاڑن یا پچھنا جیسا کپڑا ہے، جس کو تہمد کہہ سکتے ہیں۔

انچارج اور کوتوال صاحب کے خدوخال میں جیب گرم ہونے کے بعد والی اطمینانی کیفیت رونما ہو گئی اور کوتوال بزرگوار نے سگریٹ سلگا کر شرفا کی عزت کے تحفظ اور اپنی وضعداری کے اصول پر مختصر سا لکچر دیا، اور اپنی ۲۷ سالہ سروس کا یہی موٹو بتایا۔ اور سماں باندھ دیا۔

تھانے دار انچارج نے کہا ۔" چلیے باہر "۔ اور باہر نکلتے ہی تماشبینوں کو ایک ڈانٹ "بھاگو، گدھوں، کیسی برات لگائی ہے " اور مرغا بنے اس چھوکرے کے لات رسید کی بھاگ (نکال) اور میں نے پہچانا یہ وہی ذات شریف چھوکرا تھا جس نے مجھے اتنے چکروں پہ چکر دیئے اور حکیم جی کو مقفل رکھا تھا اور کھانا چار ناشتہ پہنچا کر سرائے کے منیجر کو بھی رسید نہ دی تھی کہ عیش کدہ میں بند ہیں ۔ اور میں نے ماحول کا جائزہ لیا تو برآمدہ کے ایک کونے میں وہ مسماۃ

دبکی نظر آئیں ریشمین ساڑی میں گول گٹھری سی بنی ہوئیں۔ غور کرنے پر آہستہ آہستہ رونے کی سسکیاں سُنائی دیں۔

تھانہ دار نے تحکمانہ آواز میں کہا۔ "سرائے کے منشی کو حاضر کرو رجسٹر سمیت"، اور منشی کہیں ادھر ہی اُدھر سے رجسٹر لینے دفتر کی جانب بھاگتا ہوا آگیا۔ دونوں پولیس افسروں کا رویہ میرے ساتھ انتہائی دوستانہ اور پر خلوص تھا، میں نے ذرا بے تکلفی کے ساتھ کوتوال سے تمام کیس کا مجملاً حال سُنانے کی درخواست کی، موڈ بہت گھریلو ہو رہا تھا بولے.... "وہ کہار، دھمیر بچہ بھاگیرت (گالی) اس کو میری پارٹی نے اسٹیشن سے بارہ میل ایک گاؤں میں گرفتار کیا اور اس کے ذریعہ سراغ لینے ادھر ادھر دلی کا رخ کیا' (گالی) اب یہاں چاندنی چوک تھانہ میں حوالات میں بند ہے۔ سیٹھ جی کی بھاری چوری اور نابالغ لڑکی کے اغوا کی مہر دونی کو توالی میں رپٹ ہوتے ہی میں نے تین چار گھاگ تجربہ کار افسروں کی سرکردگی میں ادھر ادھر پارٹیاں دوڑا دیں اور خوش نصیبی سے اپنا رخ ادھر کو ہو گیا، اندھیرے میں تیر چلایا، نشانہ پر صحیح بیٹھا' سراغ تفتیش میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ بھاگیرت ملزم سے آپ دونوں کا سراغ ملا، دہلی پہنچے، پھر پہلے اسٹیشن سے آپ کے جائے قیام کارونیشن ہوٹل تک پہنچے۔ وہاں رجسٹر میں آمد و روانگی دیکھی اور پتہ چل گیا کہ اکیلے آئے تھے اور اکیلے ہی چلے گئے اور کوچہ پنڈت گئے، اتفاق سے آپ کے ان عزیز سے ہوٹل کا منیجر واقف بھی تھا، لیکن آپ کو چھیڑنا خلاف احتیاط سمجھا۔ اندیشہ تھا کہ آپ کے ذریعہ ہم سے پہلے ملزم کو مخبری ہو جائے اور وہ مغویہ کو لے کر دہلی سے ہی فرار ہو جائے، لیکن کارونیشن ہوٹل سے آپ کی سرگرمیوں کا سراغ لیتے احمد بائی کی سرائے تک پہنچے اور رجسٹر میں حکیم جی کا اندراج دیکھ لیا اور پکڑ لیا، حکیم جی نے مغویہ کو اپنی مریضہ درج کروایا تھا اور بغرض علاج دہلی میں آمد' میاں یہ ہمارا پیشہ ہے اور معمول کا کار منصبی"۔

جیب گرم ہونے کے بعد کوتوال نے استادانہ انداز میں مجملاً اپنی کارگذاری سنا کر تھانہ دار انچارج چاندنی چوک سے کہا۔ "کیا دیر ہے۔ بھئی لے چلو نا۔ ابھی تو مدعیہ کو یہیں رکھنا ہے تمہارے تھانے میں دو چار دن" اور بوڑھے کوتوال کی آنکھوں سے سرور سا چھلک پڑا۔

تھانہ دار نے مسکراتے ہوئے ہونٹوں پہ دھری خضاب میں رنگی سیاہ چمک دار مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے زیرلب کہا "ہوں' ہاں' آپ تو اکیلے ہیں۔ پھر میرے ساتھ میرے دو افسر دو یم بھی ہیں' اور دیوان جی بھی اخیر پر۔"

کوتوال بڑبڑایا۔ "بھئی دیوان جی تو ہمارے بھی ہیں، سبھی کو باری باری سے نبٹنا ہے۔"

جیبیں اور بغل دونوں ہی گرم تھیں، دہلی اور ہر دوئی دونوں پولیس پارٹیوں پر مخصوص لوفرپن کی فضا طاری ہوگئی۔ کوتوال سے لے کر کانسٹیبل اور کانسٹیبل سے لے کر کوتوال ہر ایک پر ایک رنگ سا بکھر گیا۔ کوئی بڑبڑایا۔ اجی بس یہیں دتی بہتی گنگا ہے جیسے دھو ملے، ہاتھ دھو لو" کسی نے کہا" ہر دوئی پہنچ کر تو پھر ستی سیتا ہو جائیں گی" اجی "باکرہ نوچی" (گالی)۔

تھانہ دار نے ہیڈ کانسٹیبل سے مخاطب ہو کر کہا۔" چلو۔ اب یہاں تک کی بات تو ختم ہی ہوگئی، مدعیہ کو لے چلو"

اور چاند تارا مارکہ وسمہ اور مہندی میں رنگی سرخاب کی دم کی طرح لال داڑھی والے ہیڈ کانسٹیبل نے لڑکی کے قریب کھڑے ہوئے کانسٹیبل سے کہا۔

"اٹھاؤ، اور تھانہ لے چلو۔"

اور کانسٹیبل نے کہا۔" لو اٹھو نیک بخت، چلو۔"

اور پورے کے پورے درجن بھر چھوٹے بڑے پولیس اہل کاروں کی نگاہیں بھگونتی کی ریشمین سوٹ پر ایسی بلی والی چمک کے ساتھ مرکوز ہوگئیں جیسے مارنے سے قبل کبھی کبھی شکار کے شوق میں چوہے سے کھیلا کرتی ہے اور بھگونتی بجائے اٹھنے کے اور بھی زیادہ سکڑ سمٹ کر رہ گئی۔

کوئی بولا۔" سکڑ لو جتنا سکڑ ملے۔ اکھی، نچیلی، سجیلی (گالی) پھر تو دلی سے ہر دوئی تک قدم قدم پر بگھوں میں پھیلو گی بگھوں میں۔ لال داڑھی والا ہیڈ کانسٹیبل بڑبڑایا، اجی بگھوں ایکڑوں میں تو کل صبح تک یہیں چاندنی چوک تھانہ ہی میں پھیلا دی جائیں گی شریمتی۔"

چاند چوک کے تھانہ دار انچارج نے کہا۔" سکڑنا تھا تو گھر پر سکڑ لیتیں۔ اس مسٹنڈے بدنصیب کہار کو لے کر کیوں بھاگ کھڑی ہوئی تھیں۔" کوتوال کی جانب اشارہ کرتے ہوئے۔" جو یہ

بچارے ہمارے استاد بزرگ آلنگ پہ آئی گھوڑی کے پیچھے باگ ڈور لیے لیے ہر دوئی سے دلی تک چابک سوار کی طرح پیچھے پیچھے آئے۔"

سب نے پریڈ کے انداز میں قہقہہ لگایا۔ بھگونتی پتہ نہیں ان تمام اصطلاحوں کا مفہوم سمجھ رہی تھی کہ کہار اور حکیم جی کے بعد اب تیسری پولیس نام کی پارٹی سے دوچار ہونا ہے.... شاید شرم سے اٹھنے میں پس و پیش ہوا اور لال داڑھی والے دیوان جی نے مشفقانہ ناصحانہ آواز میں پچکارتے ہوئے اور بھرپور شیطانی تیوروں میں بولے۔ "لو اٹھ بھی بیٹھو بھلی مانس نیک بخت، مسماتی، اب تو اٹھی سہی اٹھی رہوگی (گالی)۔"

اور بھگونتی مسلسل رو رہی تھی۔ کوتوال نے کہا۔ "روتی کاہے کو نیک بخت، چل اٹھ، ایسا ایسا گدگدائیں گے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل ڈال دیں گے۔"

اور اس کانسٹیبل نے کہا جس نے اندر پھاند کر عین موقع پر گرفتار کیا تھا، مزہ لے لے کر تضحیک کے ساتھ مخصوص آواز میں ہنستے ہوئے انکشاف کیا۔ "ابی اٹھ کیسے بیٹھیں بچاری۔ ہم تینوں گوشہ محل کے پچھاڑے والی دیوار پھاند کر صحن میں ہوتے ہوئے پیچھے والے دروازے سے کمرے کے اندر جاکر کھڑے ہو گئے۔ ہوں اور جب لحاف گھسیٹا تو پتہ چلا کہ پولیس آگئی سو ویسی کی ویسی یہ خالی ساڑی میں اوپر سے نیچے تک لپٹی ہوئی ہے اب تک" پھر ذرا آواز بدل کر مخصوص مشفقانہ انداز میں بولے۔ "اب جا۔ اندر سے شلوکا، پیٹی کوٹ لے لے۔"

"ساڑی باندھ ای آ۔ چلنا ہے۔" کوتوال نے اسی موڈ میں لقمہ دیا۔ "رونا رینگنا چھوڑ، آدمی بن، بالغ ہوئی بھی تو نابالغ کر دیں گے ہم پولیس والے تھانے سے سیشن جج تک اب تو ہے اور ہم۔"

اور بھگونتی ذرا اٹھی، اور میں نے غور کیا سر سے پاؤں تک اسی ساڑھی میں لپٹی ہوئی ہے جو ریل میں پہلی رات حکیم جی سے تقریب ملاقات کے بعد بجائے لہنگے دوپٹہ کے ان کے جسم پر بندھی ہوئی تھی اور یہ ہئیت کذائی دیکھ کر حکیم جی تو ایسے ہو گئے کہ جیسے اپنے دواخانے کی بخار اتارنے والی حب ہفت تلخیات کھا کر اوپر سے عرق منقی حمیات کی خوراک لی ہے، میں بھونچکارہ گیا اور سب کے سب پولیس والوں نے پھر پریڈ کے انداز میں قہقہہ لگایا۔ اتنے میں سرائے کا منیجر جس کا انتظار تھا وہ بھی آگیا۔ پورے کا پورا دفتر لادے ہوئے۔

تھانہ دار نے کئی رجسٹر الٹے پلٹے۔ تھوڑا سا رسمی معائنہ کیا اور پھر تھانہ انچارج چاندنی چوک نے اس رجسٹر کی جلد بغور دیکھی جس میں حکیم جی اور بھگونتی کی آمد و روانگی کا اندراج تھا اور آہستہ آہستہ وہ صفحہ جلد کی سلائی میں سے کھینچ لیا اور پھاڑ کر چھوٹے چھوٹے پرزے پرزے کر دیئے۔ ادھر سرائے کے مینیجر نے اپنا بل حکیم جی کی جانب بڑھایا جس کو دیکھ کر حکیم جی دانت پیس کر رہ گئے۔ عاجزی کے ساتھ بغلیں جھانک گئے اور میری جانب دیکھا۔

میں نے کہا۔ "کیوں دیدو، نا چالیس روپے تو تمہارے پاس تھے۔ جیب میں رہنے دیئے تھے تم نے۔ جب یہاں اس روز، اور باہر نکلے نہیں تم، اور یہ بل تو اٹھائیس ہی روپے کا ہے، گھر تک کا کرایہ اور اوپر بہتیرے بچتے ہیں۔"

مگر حکیم جی نقب پہ پکڑے ہوئے چور یا دفتر کے اندر اسپیشل پولیس کے چنگل میں رنگے ہاتھوں پھنسے ہوئے راشی اہل کار کی طرح حلق کے اندر پھنسی ہوئی سرگوشی میں بولے۔" وہ تو ویسے کے ویسے شیروانی کی جیب میں پڑے تھے اور، اور چھاپہ مارتے ہی کھونٹی پر ٹنگی شیروانی ان لوگوں نے ٹٹول لی تھی اور روپے وہیں کھڑے کھڑے بانٹ لیے تھے۔"

اور میں خریداری کر کرا کے اپنی جیب تقریباً خالی کر چکا تھا۔ گھر تک کا واپسی کا کرایہ باقی تھا، وہ بھی چچا کے پاس۔۔۔ اس وقت بلا سوچے سمجھے چچا سے پیچھا چھڑا کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ تانگے کے پیسے اور ایک روپیہ جیب میں تھا اور اللہ کا نام۔ ایک روپیہ اس وقت میری حیثیت تھا۔ ادھر بات سانپ کے منہ میں چھچھوندر بن گئی تھی۔

تھانہ دار نے اندراج خود ہی تلف کر دیا تھا جس کی رو سے بل واجب ہوتا تھا۔ اس وقت گو مگو سے اندازہ کر کے ذرا سٹ پٹایا، صفحہ پھاڑنے کے بعد باوجود پولیس افسر ہونے کی ذمہ داری محسوس کر رہا تھا، یوں سرائے اس کے تھانہ کے حلقہ میں تھی اور اندراج تلف ہو جانے مگر بات کا وجود بغیر بل ادا کیے کلی طور پر نہ مٹتا تھا، جس میں رشوت لینے کے بعد خود اب پولیس کی دلچسپی بھی ملوث تھی۔ غالباً ہماری سرگوشی سن بھی لی اور سمجھ گیا حالاں کہ جانتا تھا کہ دستور سے چھاپہ مارنے والے کانسٹیبلوں کو ایسی رقمیں حق اور شیر مادر ہوا کرتی ہیں، ذرا پنچائتی انداز اور اپنائیت

کے لہجہ میں کہا۔

"اماں یار یہ بل ادا کر دو نا، قصہ پاک ہو، اندراج تو ہم نے تمہارے سامنے تلف کر دیا، وقوعہ آمد روانگی کھانے پینے کرایہ کا کوئی کہیں وجود باقی نہیں، آپ لوگ اپنا رستہ پکڑیں۔ یہاں آپ کا ہونا اب ٹھیک نہیں، دلّی شہر ہے افسران بالا بھی ہیں۔ اور مفت ہیں۔۔۔"۔ مگر حکیم جی میمنے کی طرح جگالی کر کے رہ گئے، اور اتنی بات مُنہ سے نہ نکل سکی کہ چالیس روپیہ چھاپہ مارنے والوں نے جیب سے نکال لیے ہیں، مگر تمام بات جانتے ہوئے کوتوال نے تایا ماموں کی طرح ناصحانہ انداز میں کہا۔" اماں کیسے لوگ ہو، ہو نا کل کے لونڈے معاملہ دفن ہو گیا پھر یہ مفت کی چرّاند! جلدی کرو!" اور غالباً پیادہ سے چڑھے فرزیں کے گھر تک پہنچے کانسٹیبل لغایتہ کوتوال بزرگ، کھچڑی داڑھی کوتوال نے اپنی تعزیرات ہند وضابطۂ فوجداری مرتب سنجیدگی میں ایک پھکڑ قہقہہ لگایا اور بھانڈوں کی پوری چوکی کی طرح کوتوالی ہردوئی لغایتہ چاندنی چوک پولیس نے اس قہقہہ کے ساتھ گٹکری ملائی۔ فارسی داں پرانی چال وضع کے کوتوال نے ایک نوعیت کی بزرگانہ شفقت سے ہم لوگوں کی جانب دیکھا اور خاص طور پر مجھ سے مخاطب ہوئے مگر تایا چچا کے ناصحانہ انداز میں۔" میاں ختم کرو، معاملہ یہیں دفن کرو آج اور ابھی۔"

اور حکیم جی کے متعلق تو انھیں بھی زیادہ اچھی طرح علم تھا کہ اندر باہر ننگے ہو چکے ہیں اور خالی جیب شیروانی کھونٹی پر جھول رہی ہے۔ البتہ مجھ سے امید کیا حکم تھا کہ ہوٹل سرائے کے کھانے ٹھہرنے کے واجبات حکیم جی کو قرض کے بطور دے دوں اور گھر جا کر حکیم جی ادا کر دیں ورنہ معاملہ دفن کرنے کے لیے انھیں اپنی رقم میں سے کاٹ کر بہر حال یہ اپنے حلقہ و اختیار سماعت کا معاملہ ختم کرنا ہی پڑتا۔ جبکہ میں بے باق ہو چکا تھا بے تحاشا خریداری کی تھی صرف گھر تک کا ڈیل کا کرایہ باقی تھا وہ بھی چچا مرحوم کے پاس امانت تھا۔ جبکہ پولیس کی موجودگی میں یہیں یہاں سے نو دو گیارہ ہو جانا تھا یہ پولیس، سرائے کے منیجر اور خود ہمارے مفاد میں تھا۔

کوتوال نے سرائے کے مالک منیجر سے قیام وطعام کا بل اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے

بغیر پڑھے میری جانب بڑھا دیا۔ اتنے میں بھگونتی اندر سے پیٹی کوٹ بلاؤز پہن کر اچھی طرح قاعدہ سے ساڑی باندھ کر برآمد ہوئی لمبا سا گھونگھٹ نکالے کمر کسے نئی مہم کے لیے کسی بنی۔ کوتوال نے سر سے پاؤں تک پرتالا اور مخصوص انداز میٹھی آواز میں دلاسا دیا۔ ”اری گھبرائی کیوں جاتی ہے، میری جانِ من“ ہم سے گھونگھٹ نکالتی ہے، اس کہار مردود اور ان کل کے لونڈوں سے یہ بڈھا مترا نہیں ہے ابھی۔ جی خوش ہو جائے گا جی“ اور پوری پارٹی کو کوئک مارچ کا کاشن دیا اور سب کے سب چل پڑے۔

۱۹۸۲ء

سُود در سُود

لالہ پکوڑی مل کہنے کو ویش یا جتے اگرچہ مہاجن قومیّت کے تعارف، پہچان، تعریف میں دسیوں قدیم کہاوتیں چلی آتی ہیں جو اس کے ارزل ترین ہونے کی سند ہیں اور مہاجن کا مقام شُدر کی اُس نیچی سطح "اچھوت" سے بھی پست متعین کرتی ہیں، جو انسانیت سے بھی خارج ہے۔ ویسے سُود بیاج بتّہ شاستروں کی رُو سے جائز ہے، لیکن "دام دوپٹ" (اصل دوگنی) ہو جانے پر در سُود کا پہیّہ ٹھہر جاتا ہے اور سادہ سُود چلتا ہے، لیکن مہاجن کا مقروض اُس کی من مانی شرح اور شرائط پر اُس مکھی کی طرح ہو جاتا ہے جو مکڑی کے جالے میں پھنسی ہوتی ہے اور مکڑی جیتی سے لے کر مری تک اسے آہستہ آہستہ چوستی رہتی ہے اور شرائط قرض خواہ کی شدّتِ ضرورت کی مجبوری اور مہاجن کی مرضی کی منّت گیری اندر ہی اندر گھومتے ہیں — چنانچہ منوجی نے سماج سازی میں مہاجن کو اتنا گرا دیا ہے کہ اس کا مقام جیسے اس بھنگی سے بھی نیچے ہے جو گوہ کا بھرا ٹوکرا سر پر اٹھا کر لے جاتا ہے، گویا صیغۂ انسانیت ہی سے خارج کر دیا ہے۔ اگرچہ شہنشاہ اکبر نے شاید کبھی لاتے لے جاتے نظر پڑ جانے پر، اس کی اہم ترین خدمت کے زیرِ نظر اس کو "مہتر" کے خطاب سے نوازا، اور

تین سو برس بعد ان کے شاگردِ رشید بے تاج کے سیاسی تاجدار نے شدروں کو "ہری جن" (خدا کا بیٹا) پکار کر ہندو قوم کو گنتی کی حد تک ملانے کے لیے "مرن برتھ" کا سوانگ رچایا، اور ڈاکٹر امبیدکر کو چاروں شانہ چت دے مارا۔ لیکن یہ من گھڑی بات آج کی نہیں نہ تین سو برس ابھی کل کے مغل دور کی۔ بات جب کی ہے جب ماتا پاربتی اور پتا مہادیو نے سمندر متھ کر پانی کے اندر سے پھول پر براجمان ہو کر دن رات، صبح شام بنائے، اور اپنا تولید و تناسل کا کاربار پھیلایا، تو فرائض اور تیوہاروں کی تقسیم ہوئی۔ اور سال کی تاریک ترین رات "دیوالی" کے تیوہار پر بجز ویش کے اپنے گھر میں کسی کو روشنی کرنے کا حکم و حق نہ تھا۔ لیکن کرنا ایشور کا ایسا ہوا کہ ایک تیلی نے جس کے گھر کے دو دروازے تھے اپنے پچھیت والے دروازہ پر چپکے سے ایک دیا بار کر رکھ دیا۔ اور آن ہوتی ہوئی اور پھر ان نیائی ہوئی۔ اسی چراغ کی لو پر لچھمی ماتا گھر کے اندر آ براجیں اور تیلی و لچھمی ماتا کے ملاپ سے ایک نئی گڑی جنمی، اور یوں ہاتھی کے پانچویں پاؤں کی طرح برہمن چھتری ویش شدر کے بیچ مہاجن آ ٹپکا۔ یوں تو دو ٹانگ پر کھڑا آدمی سا تھا۔ مگر ماتا لچھمی کے پیٹ کا جنما دولت اس سے قول ہاری تھی لیکن ناحق اور انسانیت کے خارج جملہ اوصاف پر پورا اترتا ہوا۔ برہمن، چھتری ویش اور تو اور ارزل شدر اس کی روائتی اصل و حقیقت کے زیر نظر اس ناچتے مور کو یہ کوے اپنے تنگ میں نہ آنے دیتے اور پھر یہ بھی بے لگام دو غلے مقدر خچر کی طرح خود رو ہو گیا، اور اپنی خود سر راہ خود متعین کر لی۔ لامتناہی شرائط اور لاتعداد شرح بیاج، سماج کی ڈھیل کے تحت دولت کے سہارے سب کے سب تیوہار خواہ راجپوتوں کا دسہرہ ہو یا ویشوں کی دیوالی یا شدروں کسانوں کی ہولی جی کھول کر آپ اپنے میاں مٹھو منانا اور ان کے آس پاس پورن ماشیوں، اماوسوں سے لگے ہوئے اشنان بھی بڑی دھوم کے ساتھ مناتا۔ یہ اور بات تھی کہ اونچی قومیں اپنے اپنے پربت برہمن کی دعوتیں پکّی روٹی، پوری کچوری پکوان اور لڈو پیڑے سے اپنے گھر بلا کر کھلایا کرتیں اور مہاجن گھر بلاتا تو کچی جنس، گھی کھانڈ، میدہ اور کیا کیا باندھ کر

پوٹلیاں ساتھ کر کے پنڈت جی سے دعاؤں کا لین دین کرتا اور ان او نچوں سے دو چار اشلوک، آشیرواد کے بول زیادہ ہی پڑھواتا اور مہاجن کے یہاں سے پنڈت جی، سب سے آخر میں اپنے گھر بھر کے لیے پوری فصل کے کھانے بھرے لدے پھندے آیا کرتے۔ کیوں کہ مہاجن ازل مخلوق تھی اور دولت ستار العیوب۔ اگرچہ، ہر دور میں تنظیم زر اور ہر قدم پر سیاست مدن میں مہاجن کا مقام سب سے اہم اور از اوّل تا آخر رہا ہے، اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اس کے باوجود روایتی طور پر مہاجن درشن بگاڑ بھی تصوّر رہا ہے۔ اونچی قوموں کی بستیوں میں صبح ہی صبح نہ نکلتا۔ بڑی جاتی والوں کی گلیوں میں جوتا پہن کر نہ جا سکتا، گھوڑے پر سوار ہونے کا تو سوال ہی نہیں، اکثر دیہات میں اپنی چھوٹی بستی اونچی ذات والوں سے میل ڈیڑھ میل بھر علیحدہ ایک جانب کو بساتا۔

یہ بات شہنشاہ جہانگیر اور شہنشاہ شاہ جہاں کے دور کی ہے، ابا حضرت و دادا حضرت جنّت مکانی، شہنشاہ جلال الدین اکبر اپنے ابتدائی دور میں ہیمو بقال کی بغاوت کا سامنا کر چکے تھے، جو تاریخ ہند میں اور بڑی حد تک اُس وقت تک تاریخ عالم میں بھی یہ عجوبہ اور یہ مظاہرہ مہاجن قومیت کا خرقِ عادت عمل تھا۔ یوں سراغ ملتا ہے کہ خواہ متوازی نہ ہو تاہم مغل نشاۃِ ثانیہ کے زریں حصّہ کے اندر جاگیر داری نظام کے ساتھ کیسے ہی نہ کیسے، ساہوکارانہ نظام نہ سہی تاہم کچھ نہ کچھ دھندلی دھندلی صورت نمایاں ہو چکی تھی۔ ہر دو مغل شہنشاہوں، جہانگیر و شاہ جہاں کے ادوار بڑے امن و امان کے ہیں، بغاوتیں معدوم ہو چکی تھیں ایک آدھ سرکشی ہوئی تو نہایت کمزور قسم کی ایک معمولی سی سرکوبی میں دبا دی۔

ملک کے اندر جاگیر داروں کی چھوٹی چھوٹی پاکٹیں تھیں اور یہی امن و امان اور نظم و نسق کے ذمہ دار تھے۔ ساتھ ہی ملک کا زیادہ رقبہ گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا، جہاں امن و امان کا مسئلہ ذرا زیادہ سنگین تھا یہ جنگل باغیوں کے نہ سہی رہزنوں ڈاکوؤں کی بازی گاہ اور پناہ گاہ تھے، پھر چھوٹے چھوٹے جاگیر دار، کبھی کبھی سرکشی

کا انداز دکھلاتے، مالیہ نذرانہ، محاصل ادا نہ کرکے خود مختاری کا نہ سہی خودسری کا انداز پیش کرنے کی کوشش کرتے تو ان کی پاکٹوں گھاٹوں کے درمیان چند اک گاؤں حکومت کی جانب سے مراعات کے ساتھ ان کے مخالف قوم یا کیسے ہی نہ کیسے متضاد خاندانوں کے آباد کر دیے جاتے اور یہ درمیان میں حائل ہو کر سرکشی میں توازن رکھتے، اور یوں حکومت کی پالیسی علاج بالمثل اور کبھی علاج بالضد کی منطق سے کام لیتی۔

اور سُنتے چلے آئے تھے کہ گلاب سنگھ اتراج سنگھ کے پُرکھے ناہر سنگھ شبیر سنگھ، گھمنڈ سنگھ اس گھنے جنگل کے شیر تھے، اس کے درمیان بڑی کچّی اہم شاہراہ گزرتی تھی جو وزیر کے ملک اودھ اور دارالسلطنت دہلی کو ملاتی تھی۔ مسافروں اور سوداگروں کے قافلوں کی تو حقیقت ہی نہ تھی قدم قدم پر روتنا (راہ داری ٹیکس) پکڑ کر وصول کر لیتے، سرکاری فوج کی ذرا کم زوری پر نقل وحرکت میں بھی مخل ہوتے۔ اور یہاں دہلی اور لکھنؤ دونوں حکومتوں کو ذرا المحہ، فکر ہوتا، اس کی سرکوبی کے لیے جانبین میں پہلے تو جنگلوں میں فوجی یلغار کی تو بات وہی ڈھاک کے تین پات رہی، بچارے ڈاکو ظاہر ہے، مغل فوج کے ادنیٰ سے دستے کا بھی کیا مقابلہ کر پاتے لیکن ان کی پناہ گاہیں، نہایت محفوظ تھیں۔ گھنے جنگل کے اندر اور ناقابلِ رسائی۔ دبک گئے اور پھر فوج کے گشت کے ہٹتے ہی غارت گری اور بھی زیادہ شدّت کے ساتھ ہونے لگی، تو مغل سیاست و ڈپلومیسی بروئے کار آئی، جو اپنے دور کی دنیا کی عظیم سیاستوں و سفارت کاریوں میں سے ایک تھی اور جس سے ان کے بعد آنے والے قابض انگریز بھی کام اور رہنمائی لیتے رہے۔ یہ آج کی اصطلاح میں "ٹیبل ٹاک" والی بات تھی، چنانچہ صوبہ دار نے ڈاکوؤں کے مقتدرین کو دعوت دی، اور پروانہ شاہی کے ذریعہ، جنگل کے اندر جو تھوڑے تھوڑے جگہ جگہ کاشتہ علاقے تھے وہ انھیں معافی دوام نانکار نسلاً بعد نسلاً بطناً بعد بطناً تفویض کیے۔ اور "بن کٹی" نام کا پورا رقبہ جتنا جنگل صاف کر سکیں، اس پر پوری ایک نسل تک کے لیے مالیہ معاف کیا، اور انعامات کے ذریعہ عام اعلان کیا۔ چوہان ٹھاکر راجپوت سب سے اونچا مانا ہوا خاندان تھا جنھوں نے بجائے لوٹ مار کے چاروں طرف میلوں رقبہ پر کاشتہ علاقہ پھیلا لیا اور اس کے بیچوں بیچ اپنا

چوہان گڑھ نامی گاؤں بسایا اور چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد ہوئے جن میں شدر قومیں بسائیں۔

اور اب تو جنگل کا نام و نشان نہ تھا، نام کو یہ پرگنہ بن کٹی کہلاتا۔ بڑے بڑے زرخیز رقبے پھیلے ہوئے تھے گیہوں کپاس اور گنے کی اعلیٰ فصلیں تھیں۔ بڑے پرانے اور تاریخی گاؤں چوہان گڑھ کے گھروں کا ملحق کاشتہ رقبہ زمیندار کی خود کاشت سے شروع ہوتا تھا۔ بیچوں بیچ گاؤں کی آبادی کے اندر بارہ کمروں پر مشتمل چودہ سیڑھی اونچی چوپال تھی، بقیہ کُل آراضی موروثی دخیل کاروں، موروثی حق داروں اور خالصہ کاشت کاروں میں تقسیم تھی جو دستور دیہی واجب الارض کے مطابق نقد، یا جنس زمیندار کو بطور لگان بٹائی ادا کرتے تھے اور اپنی اپنی مقبوضہ آراضیات کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے خس پوش ذیلی دیہات بنائے بسے ہوئے تھے۔ چمار، لودھے، کسان، دھانک، جولاہے، جھوجھے، مولازادے پاسی سب کے سب شدر، لیکن ایک کنارے پر ایک چھوٹی سی بستی، جو سُنتے ہیں کبھی جب بسی تھی تو صرف اکیلے ایک ہی گھر کی تھی خاص بڑے گاؤں سے میل ڈیڑھ میل بھر علیحدہ مہاجن نگری نام کی آباد تھی، جو ایسے مقام پر واقع تھی جہاں کو کوئی کچّا راستہ بھی نہ جاتا تھا اور تقریباً سب نے ہی اس کا راستہ دیکھا تھا۔ یہ "کوڑیا مہاجن" کی تاریخی بستی تھی جس کے متعلق دیہاتی معتبر تحقیق تھی کہ چوہان گڑھ کی چوپال کے ساتھ ساتھ ایک ہی دن میں شاہ جہانی دور میں آباد ہوئی۔ مہاجن کی چوپال تو خیر چھوٹی تھی اور زیادہ اونچی بھی نہیں ہو سکتی تھی، مگر کوڑیا مہاجن کی قدیم حویلی بڑی لق و دق تھی، چورُخے دالان در دالان، کوٹھریاں، کوٹھریاں، صحنچیاں، اور ذرا تنگ سا صحن، جس کے درمیان میں حویلی کی بنیاد کے ساتھ کا نصب کیا ہوا نیم کا مشہور تین چار سو سالہ، پرانا چھتنا در درخت۔ ساتھ ہی ایسی بستیوں سے ملحق، چھوٹے بڑے تالاب ضرور ہوتے ہیں جو ان کی آبادی کے شروع دور کے مٹی اٹھانے کے شاہد ہوتے ہیں پھر سال کے سال میں دو مرتبہ لسائی لپائی کے لیے ان میں سے مضبوط

چکنی مٹی اٹھتی رہتی ہے اور یہ تالاب اچھا گہرا تھا اور مہاجن نگری بستی کے کنارے ہی پر لگا ہوا تھا۔

گلاب سنگھ اتراج سنگھ کے یہاں میرا شکار کے سلسلہ میں آنا جانا تھا اور یہ دونوں بھائی، بارہ ماسی شکاری تھے۔ گھنے جنگل کا شکار تو گرمیوں اور برسات میں بند ہو جاتا ہے، لیکن کھیتوں کا شکار تمام سال مختلف طریقوں سے چلتا رہتا ہے، جو میدانی ہرنوں کا ہوتا ہے، اور گاہے گاہے بھورے بھیڑیوں کا، جو ان پر اور فالتو بکریوں پر گزر کرتے ہیں۔ چڑیوں کالے بھورے تیتروں کا، وقت وقت پر کھیلنے ہفتہ عشرہ کے لیے میں ان کے یہاں پہنچا کرتا اور سال پیچھے شہر کے کاموں میں وہ میرے یہاں مہمان ہوا کرتے۔ تمام ماحول میرا قدموں کا جانا پہچانا تھا۔ کوڑیا مہاجن کی بستی جو سنتے ہیں صدیوں قبل بھی ایک اکیلے گھر کی تھی اب بھری پُری چھوٹی سی آبادی تھی۔ مہاجن کے بیٹے تو خیر دو ہی تھے، لیکن مقروض آسامی جن کی موروثی آراضیات کوڑیا کے پاس سُود در سُود کے چکر میں رہن دخلی تھیں اور ادائیگی کی شرائط کا جال ایسا تھا کہ سال کے سال کُل پیداوار سے بھی قرضہ ادا نہ ہو سکتا تھا اس لیے چھوٹے سے گاؤں میں ان کے موروثی کاشت کار آبسے تھے۔ اُن سے اُن ہی کے کھیتوں پر کاشت کراتا اور پھر فصل کے فصل، ماہ بماہ انھیں کھانے کے لیے گھٹیا غلّہ، جو گجئی، بیجھڑ، باجرہ، جوار اپنے یہاں سے دیتا رہتا اور حساب جمع خرچ میں لکھتا رہتا۔ سال بھر ادائیگی و وجوب میں سرپٹ دوڑ رہتی۔ بیساکھ میں رقم قرضہ سُود در سُود کے چکر میں پیداوار سے دوگنی ہو جاتی اور بات وہی ڈھاک کے تین پات جوں کے توں، وہ جو کہاوت ہے، چت بھی میرا، پٹ بھی میرا اور انٹا میرے باپ کا! جنس اعلیٰ پیداوار کے ساتھ ساہوجی کے گھر کا رُخ کرتی، اور لچھمی مائی کوڑیا مہاجن سے قول ہاری تھیں، تاہم سب کچھ واجبی واجبی روایتی استحصال جیسا تھا۔

گلاب سنگھ، اتراج سنگھ دونوں بھائیوں کے نزدیک کوڑیا مہاجن کے پوت ساتویں پشت میں بھی لالہ پکوڑی مل نہ تھے بلکہ پکوڑیا مہاجن ہی تھا اور روایتی بے وقعت

جنہیں چوہان گڑھ بستی کے اندر جوتا پہن کر کسی گلی میں گزرنے کی اجازت نہ تھی۔ علی الصبح اور سرِ شام چراغوں جلے اونچے طبقہ والوں کے حصّہ میں بستی کے اندر آنے جانے کی احتیاط برتتے۔ راجپوت خصوصاً ٹھاکر راجپوتوں کی چوپال پر جانا ہوتا تو بالعموم کسی بقایا دار موروثی کاشت کار کو اس کے ذمہ وجوب زمیندار کے بالمشافہ اس کو ہاتھ کے ہاتھ قرضہ دیتے سوا اس وقت بھی اور سب تو علی القدر مراتب حسبِ روایات تپائی اور سرکنڈوں کے مونڈھوں پر بیٹھا کرتے لیکن مہاجن اپنا کیسہ کمر میں باندھے عاجزی کے ساتھ روایتی انداز میں کھڑا رہتا۔ چراگاہوں پر عام کاشت کار اور بے زمین کھیت مزدور اپنے مویشی چراتے اور ہفتہ میں ایک دن کا صرف دودھ زمیندار کے یہاں بھیجتے لیکن مہاجن کو ایک ہفتہ کا گھی بھی زمیندار کو دینا پڑتا۔ ویسے پکوڑی مل مہاجن کے تھان پر بیل یا کونے میں ہل قسم کی کسی چیز کا وجود نہ تھا تاہم بھینسیں گائیں پالنا ہی پڑتیں۔ اب یہ اور بات تھی کہ ان کی داشت چرائی خوراک اور ٹہل ٹکور کا انتظام ان کے مقروض آسامی کیا کرتے، جو اُن کے چھوٹے سے گاؤں میں گھر کے اردگرد آباد تھے۔ ان مقروض آسامیوں سے ایک کے بجائے دو بیگاریں زمیندار کو پہنچتیں ایک زمیندار کی اپنی شد آمد قدیم دستور دیہی واجب الارض کی رو سے اور دوسری مہاجن کی جانب سے روایتی اور یہ سب قدیم تھیں۔ مہاجن نگری ہی کھیتی کیاری پھیلنے اور چوہان گڑھ بسنے کے ساتھ آئی تھی اور مہاجن کے منحوس درشن بھی، چنانچہ ہولی، دیوالی، دسہرہ تیوہاروں کو پکوڑی مل مہاجن کو دو دو تی نذریں گزرانی پڑتیں، برہمن پربت کو کچّی جنس دینا پڑتی۔ لیکن ان تمام خساروں، ذلتوں، خواریوں کو پکوڑی مل مہاجن خندہ پیشانی سے اور بزرگوں کی روایت ہونے کے باعث فخریہ روایات کا حامل محسوس کرتے۔ ویسے مہاجن قومیت میں تولید و تناسل بھی نہ معلوم کیوں محدود تھا۔ شدروں اور اونچی قومیت والوں کی طرح بستیاں تو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی تھیں، لیکن مہاجن نگر ایک آدھ چھوٹا سا چند گھروں والا گاؤں اونچی چوپال اور وسیع حویلی والا ہوتا، جس کے اردگرد بالعموم پشتینی مقروض آسامیوں کے خس پوش گھر لگے ہوئے،

مویشیوں میں صرف بھینسوں کا اور گئو خانہ کا باڑا اور ساتھ ہی ساتھ دُور دُور تک پھیلا ہوا قرض بیوپار کا کاروبار۔ پکوڑی مل کے ہاں، حاجت مند، قرض خواہ پیدل چل کر پہنچا کرتے، ڈھنگ کا کوئی کچا راستہ بھی نہ تھا، لیکن ذی اختیار زمیندار طبقہ کے لوگ انھیں بھنگی قاصد بھیج کر بلوایا کرتے۔

کھیوٹ و فردِ حقیت تو خیر زمینداروں کے بیٹوں کا مُقدّر اور کاغذات سرکاری میں صرف راجپوت ٹھاکروں کا خانہ تھا۔ اور لالہ پکوڑی مل کا کوئی تعلق اس سے ناممکن تھا لیکن قرضہ اور سُود در سُود کے روپیہ کی طاقت سے سُنتے ہیں ان کے پرکھوں سے شاہ جہانی دور کی تاریخی بڑی بات اور چھوٹی سی بستی چلی آتی تھی کہ کوڑیا مہاجن نے اس علاقے بھر میں اپنی رقم اور ٹھاکر کے انتظام سے، جنگل کٹوائے، کھیت بنائے اور ٹھاکروں کے لیے مالیات کے ذریعہ کاشت پھیلانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ ورنہ گلاب سنگھ اتراج سنگھ ٹھاکروں کے پرکھے گھمنڈ سنگھ بل بیر سنگھ چوہان ڈاکو لٹیرے تھے۔ ان دونوں بھائیوں کے وقت میں پہنچ کر یہ مہاجن ہارون رشید کا البرامکہ بن گیا۔ ان کا باپ ذرا روایتی ٹھاکر تھا۔ مہاجن اور اپنے درمیان اثر و نفوذ کا روایتی فاصلہ رکھے رہا، اور توازن رہا۔ تاہم ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈھنڈورے کی آواز کے مطابق ملک بادشاہ کا حکم کمپنی بہادر کا ...... رہا۔ موروثی کاشت کار ایسٹ انڈیا کمپنی اور شہنشاہ دہلی کی دوعملی میں مبتلا رہے، اور یہ روایت میں ترمیم بنتی گئی۔ مہاجن کھیتی کے لیے تمام لاگت، بیج فراہم کرتا کاشت کاروں کے ذمّہ فصل کے فصل زمیندار کے وجوب قرضہ دے کر ادا کرتا۔ کاشت کاروں کو شادی بیاہ، بیماری، موت اور تیوہاروں پر مگر اپنی من مانی شرح سود پر فوری اور نقد قرضہ فراہم کرتا اور پھر اپنے ٹھنڈے اثر و نفوذ کے ساتھ ساتھ ان پر نرم رویّہ رکھتا ساتھ ہی ساتھ زمیندار کے تمام تر روایتی امور جو گوناگوں استحصال اور ذلتیں ہوتیں خوشی خوشی فخر کے انداز میں قبول کرتا، اور نتیجہ میں ان کاشت کاروں کی پیداکی ہوئی اجناس اعلیٰ گندم، چنا، کپاس، کھانڈ گھر میں بھر لیتا۔ اسی طرح دُور دُور تک ایک نوعیت کے نادر رہن داخلی لین کا دستور رائج تھا، جو ضابطہ دیوانی، سول پروسیجر کوڈ اور ٹینینسی ایکٹ میں کہیں نہ پایا

جاتا تھا۔ ذیلی کار، پشتینی موروثی کاشت کار اپنے مقبوضہ رقبوں پر مہاجن کی لاگت کے ذریعہ کاشت کرتے، اور اسی کے گودام کٹھار سے اپنی خوراک پاتے، اور یوں مہاجن کا کبھی ایک گھر کا چھوٹا سا گاؤں اچھی خاصی چھوٹی سی بستی بن گیا۔ ویسے حکم تو انہیں دونوں بھائیوں کا چلتا، لیکن یہ چلاتے نہ تھے، روایت اور قانون کے پابند تھے، چنانچہ کسی نہ کسی راستے پیداوار کا بڑا حصّہ مہاجن کے گھر میں پہنچتا تھا اور ان کے وجوب لگان اسی ذریعہ سے بہ آسانی ادا ہو جاتے۔

گلاب سنگھ میرا دوست تھا اور اتراج سنگھ اس کا چھوٹا بھائی، جیسے دیہاتی خلوص میں میرا بھی حقیقی جیسا، چھوٹا بھائی تھا۔ پکّے اور سچّے دیہاتی، اپنے جدّ امجد کی روایات پر نازاں، اور جدّ امجد ہی کے لاقانونی عمل کا ردّ عمل ڈاکوؤں کے بیٹے، لیکن بڑے امن پسند، بڑے روایت پرست اور میں اپنے چھوٹے سے قصبہ کے طول و عرض اور قصبیہی تمدن، نام کے شہر کا نواحی مضافاتی اور میرے دوست، بڑے ضلع کے دور افتادہ اندرونِ دیہات بسے ہوئے روایتی دیہاتی، زمیندار کاشت کار۔ اور یہی میرے ان کے مابین قدرِ مشترک تھی کہ زمیندار تھے، اپنے آبائی مملوکہ گاؤں کی آراضیات پر وہ بھی اپنے ہاتھ اور کھیت مزدوروں کی امداد سے خود کاشت کرتے والے سیردار اصطلاح میں کہلانے والے زمیندار مالک کاشت کار، اور میں بھی کچھ ایسا ہی کلکٹ سا۔ اور لالہ بکوڑی مل نہ دیہاتی نہ مضافاتی، نہ شہری، اپنی اندرونی دیہات اور آس بستی اور نواح کے موروثی کاشت کاروں سے لین دین، کھات خوراک بھینٹ بیگار لینے اور زمیندار کو اپنے ذرائع و معرفت سے ڈوبی دلوانے کے ذمہ دار، پھر شہر میں کچہری کے اور دیہات میں گاؤں کے دلالوں، عرائض نویسوں اور رجسٹری دفتر کے وثیقہ نویسوں سے خلا ملا بھی رکھنا پڑتا۔ دیہات کے بے کمیشن للہی دلال تو دور کے قرض خواہوں کی ضرورتوں کی شدّت کی نوعیت کی خبریں دیتے جن سے لالہ بکوڑی مل اپنی من مانی شرح سود کا ریٹ متوازن رکھتے۔ ایک خاص قسم کے قرض خواہ اور آتے رہتے یہ بالعموم

چاندی کے زیور اور گاہے گاہے کبھی کبھی سونے کا زیور گروی رکھ کر قرضہ لینے کے لیے۔ ان سے شرح سود بالعموم کم رہتی لیکن ساتھ ہی ساتھ شرائط سخت۔ فصل پر اگر چھڑانے نہ آتا تو دیہات یا شہر کے سونا ہو یا چاندی، سناروں سے بھٹی میں گلوا دیتے اور اینٹوں کی شکل میں مسخ کر کے گھر میں زیرِ زمین دفن کر دیتے۔ اور یہ تمام لالہ پکوڑی مل کو ان کے باپ سے نصیحتیں توریثی سلیقہ سے علمِ سینہ اور دولت علمِ سفینہ کے انداز میں پہنچی تھی۔ تاہم اس آخر الذکر گروی زیور والے قرضہ کی معاملت سے ڈرتے تھے سود کی شرح بھی کم اور پھر دغدغہ یہ کہیں، ڈکیتی چوری کا مال نہ ہو اور شناخت کر کے پولیس نہ پکڑ لے اس لیے سادہ اسٹامپ نشانی انگوٹھا لگا کر رکھ لیتا تھا اور اُلٹی سیدھی دونوں جانب انگوٹھا ثبت، جتنا چاہو لکھوا لو، اور تین تین سال سُود کی اندراج وصولیابی کے ساتھ میعاد بڑھا لو، اور یوں پشتہا پشت بارہ بارہ چوبیس چوبیس برس تک کام چلا لو۔

اور میں جب اپنے راجپوت دوستوں کے یہاں مہمان ہوتا ان مہاجن ذات شریف سے آتے جاتے یاد اللہ ہو ہی جاتی۔ ویسے جاتا تو شکار کے لیے اور شکار بھی یک رُخا، صرف میدانی گلّہ بنا کر رہنے والے ہرن کے شکار کے لیے جو تمام سال کسی نہ کسی صورت میں چلتا رہتا ہے اور کھیتوں کا شکار ہے۔ فصل سے بھرے اور فصلیں کٹے ہر میدانوں کا، اونچی فصلوں میں ہانکے کا اور گاہے گاہے ان پر گزر کرنے والے بھیڑیوں کا، جو میدانی ہرنوں کے شیر ہیں یا پھر گلہ بانوں کے چور۔ اور ہرن آدمیوں کے درمیان میں رہنے والا وحشی چرندہ ہے اور اس کے شکار کے طریقے کھیتوں میں فصلوں کے ساتھ متنوع ہوتے رہتے ہیں اور اسی تضاد و تنوّع میں اس کی دل چسپیوں کا راز ہے۔ ویسے اکتوبر تا فروری مارچ شمالی پہاڑوں کے پار کے چین، ٹینڈرا اور سائبیریا سے روس کے زمستانوں سے چلی ہوئی قازیں، مرغابیاں بھی ٹُنگ کے ٹُنگ پہنچتی ہیں، اور جھیلیں، جوہڑیں، تالاب، چھوٹی بڑی مرغابی، جنگلی بطخوں سے بھری ہوتی ہیں اور ہر بندوق کا لیسنس دار خواہ ہو نہ ہو شکاری ہو جاتا ہے۔ یوں تو ہم کھیتوں

کے اندر بارہ مہینے کے شوقین شکاری تھے۔

صبح ہی صبح ناشتہ کے بعد چوپال کے چبوترہ پر بیٹھے گپ کر رہے تھے کہ نیچے گلی میں سے پکوڑی مہاجن کی آواز آئی، اور بتایا کہ ان کے گاؤں کے قریب بستی کے ملحق جو تالاب ہے اس میں دو تین روز سے سرِ شام سے قازیں آتی ہیں اور رات بھر سنگھاڑہ کیسر و چگ کر گجر دم اڑ جاتی ہیں۔ شکار کا مژدہ اور مہاجن کے منہ سویرے ہی سویرے نحس درشنوں کے ساتھ۔ شکاری تو بڑا وہمی ہوتا ہے، انگریز شکاری بھی اچھے برے شگون لیتے ہیں۔ بڑے بھائی نے تو آواز دے کر گلی میں سے اوپر بلایا لیکن چھوٹے اتراج نے سلام کے بجائے جواب میں گالی بڑبڑائی۔ گلاب سنگھ نے ڈھنگ کے ساتھ بات کی۔ قازوں کے آنے اور جانے کے اوقات پوچھے اور ٹنگوں کے رُخ دریافت کیے۔ شام کا قاز کا اور شروع سیزن کا شکار اور آسان ہوتا ہے۔ اگرچہ بسیرا اور چگائی کا وقت ہونے کے سبب بڑے شائقین میں اَن اسپورٹنگ خیال کیا جاتا ہے، اور پھر دلچسپی یہ بھی کہ ساری رات کا مشغلہ تھا۔ قازیں خوب صورت قطاریں بنا کر بولتی گاتی، بجاتی چلتی ہیں اور اپنی آمد کی میلوں دور سے اطلاع دے دیتی ہیں، پھر جہاں جس پانی پر چارہ ہوتا ہے وہاں سبک پر، اور نیچی پرواز ہو جاتی ہیں، ایک ایک چکر لگا کر شکاری کو بہترین اور آسان ترین فلائنگ شاٹ کا موقع دیتی ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ چھوٹے بڑے ٹنگوں میں گاتی بجاتی آتی رہتی ہیں ایک ٹنگ پر فیر ہو تو دوسرا ٹنگ میلوں دُور دراز ہوتا ہے، آنے والوں کو خبر نہیں ہوتی وہ پہنچتا ہے تو اس پانی پر سکون ہوتا ہے، جہاں ابھی ذرا دیر قبل آگے آنے والی ہم جنسوں پر قیامت بیت چکی ہوتی ہے اور پھر چانس کی تکرار ہوتی ہے تمام رات کا مشغلہ ہے، اور یوں بڑا دلچسپ شکار ہے۔ میلوں سے آواز سن کر ایک کے بعد دوسرے ٹنگ کے استقبال کے لیے بس پانی کے کنارے اک ذرا کے ذرا گڑھے یا گھاس میں دبک جاؤ اور پہلے نیچے اُڑتے ہوئے چکر میں فیر کر کے بیگ بھرتے رہو۔ تمام دن کی بھوک ہوتی ہے، یوں بھی اندھلا جاتی ہے، تاہم جہاں بیٹھنا ہوتا ہے اس پانی کا چکر ضرور

لیتی ہے اور اسی چکر میں شکار ہو جاتا ہے۔

اور آج اماوس کی اندھیری رات تھی، ہم نے صبح کے مہاجن درشن بگڑے شگون شام کو مزید بگاڑ نامناسب خیال نہ کیا اور پھر بے سود تھا۔ آج ہرن کے شکار کے ہفتہ کے بعد ہمارے آرام کا دن تھا اور آج کی رات WILD GOOSE CHASE انگریزی ضرب المثل کے مطابق قاز ہی کے شکار کے لیے وقف کر دی اور اندھیرا پڑے کھانا ذرا جلدی کھا کر فارغ ہو گئے۔ رہلو پر سوار ہو کر چپکے سے مہاجن نگری گونٹے کے کنارے جوہڑ جھیٹر پر جا کر دبک گئے۔ تینوں ایک محاذ میں پچاس پچاس گز کے فاصلے پر، جدھر سے اُڑتی ہوئی چڑیوں کی آمد ہوتی تھی۔ تمام رات کا پروگرام، کہتے ہیں انتظار ویسے تو موت سے زیادہ شدید ہوتا ہے لیکن اُمیدوں سے پر ہو تو طرب ہی طرب ہوتا ہے، مگر آج خلاف اُمید کسی بھی متوقع سمت سے قاز کا تنگ آنا تو در کنار کدھر ہی سے دُور کی آواز بھی نہ آئی، سرِ شام سے گیارہ بج گئے، اور بجز کیچڑ کے پانی کے حشرات کی آوازیں، جو دیہات کی جھیلوں کے کنارے سناٹے کا جُز ہوتی ہیں صدائے برخاست۔ اور آواز سنائی پڑی تو اُلو کی جو مہاجن کی چوپال پر ایستادہ نیم پر بول پڑا۔ بڑی اُمیدوں اور مستند خبر پہ گئے تھے اور سخت ناامید ہوئے، اُلو خوب رَچ رَچ کر بول رہا تھا۔ ویرانی اور تباہی کا نقیب، اپنی کڑک سے ہیبت پھیلانے والا۔ اور ہم خیر خائف تو نہ ہوئے، لیکن ناامیدی اور ناکامی میں ہماری نااُمیدی فزوں تر ہو گئی۔ جاڑوں کی طویل رات گیارھویں گھنٹہ تک پہنچ گئی اور احساسِ محرومی زیادہ کہ خلاف اُمید تینوں کے تینوں یکایک چونک پڑے۔ جوہڑ کے اُس کنارے سے بستی کے گھر لگے ہوئے تھے اور بستی کے اندر یکایک، دھماکوں کی آواز سنائی دی، چونک کر دیکھا تو اندھیری فضا میں ہوائیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ آوازوں اور ان شعلہ باریوں سے پہچان لیا کہ بھرمار بندوق کے ہوائی فیر ہیں، رُخ سے اندازہ ہوا کہ مہاجن کی حویلی کی چھت اور گاؤں کی گلیوں کے ناکوں

سے ہو رہے ہیں۔ ہم تینوں اپنی اپنی نشستوں سے اچھل کر جمع ہو گئے مہاجن کے یہاں ڈکیتی پڑ رہی ہے شبہ کی گنجائش نہ تھی، تینوں متفق تھے۔ اتراج سنگھ نوجوان کا اندر والا ٹھاکر راجپوت جیسے جست لگا کر باہر آگیا۔ بڑے بھائی نے، اطمینان اور ٹھنڈے انداز میں روکا۔

"شانت ہو، ذرا غم کھا، ..ے۔ لڑکے ٹھاکر"۔ مگر میں نے شیخ بیٹھا بیٹھا دیکھ کے بجائے آہستہ سے کہا۔" بھائیو، کچھ نہ کرو، بہر حال یہ چور ہیں، مثل مشہور ہے چور کے پاؤں نہیں ہوتے، اگرچہ ہمارے رینج سے باہر ہیں لیکن ہم تینوں گر اپ کی دو چار والیاں اس چوپال والے نیم کی پھنگیوں کی جانب مار دیں تو یہ بھاگ کھڑے ہوں گے اور مہاجن لٹنے مرنے سے بچ جائے گا"۔

" وہ بھی دیکھیں گے خیر، بھگانا ہی نہیں ہمیں تو ان سور ماؤں سے نبٹنا ہے جو میرے دنگل میں ڈکیتی مارنے میری مونچھیں جھلسنے آئے ہیں"۔

اور اتراج سنگھ پھر اچھل کر جا پڑا بڑھنے کا انداز بنایا بڑے بھائی نے اس کی بندوق پکڑ لی ابھی وقت نہیں آیا، ذرا اس مہاجن کی اچھی طرح لوٹ مار ہو لے تب ان سور ماؤں سے بھی نبٹنا ہے جو گھمنڈ سنگھ بل بیر سنگھ کے دنگل میں ڈکیتی مارنے آئے ہیں۔ پھر اس مہاجن کی گندی ہو لے، دُنیا لوٹ کر (گالی) نے گھر میں بھر لی (گالی) بھلا چور کے گھر میں مور! ہے ایشور تیری لیلا!۔ ابھی اتنے نہیں گر پائے ہیں کہ ایسے ویسے لُٹیرے ڈکیتی مار کر ثابت نکل جائیں چوہان گڑھ سے! پھر ایک موذی مر لینے دے ذرا اچھی طرح پہلے۔ کوڑیا مہاجن سے لالہ کوڑی مل ساہ تک کبھی تین سو برس اور چودہ پشت میں کوئی ہل بیل چلاتے نظر پڑا ہے اور دنیا بھر کی پیداوار نے (گالی) اس گھر کا رستہ دیکھ لیا ہے، سونے چاندی کے ڈھیر ہیں"۔ بڑا بھائی بڑبڑایا، اتراج سنگھ کچھ سمجھا، کچھ نہ سمجھا۔ تاہم نوجوان راجپوت کا خون ذرا مندھیا ضرور اور بندوق نیچی کر لی۔ اور ہم تینوں نے بستی کے شور پر کان لگا دیئے، اب دھماکے بھی ٹھہر ٹھہر کر ہو رہے تھے اور بے تفصیل شور سنائی دے رہا تھا۔ ایک آدھ چیخنے چلانے سے زیادہ واضح ڈکرانے یا کتے کے بھونکنے

جیسی آدمی کی آواز ذرا واضح ہو کر سمجھ میں آجاتی۔

گلاب سنگھ بولا" میاں، میں تو ان سور ماؤں سے ضرور نبٹوں گا جو میرے دنگل میں ڈکیتی مارنے آئے ہیں، پھر ذرا اس بیاج خورے کو (گالی) بھگت لینے دو"۔

میں نے شیخ والی ترکیب پھر پیش کی" یار تم میری نہیں مانتے، ہم تینوں ادھر رُخ کر کے ٹھائیں ٹھائیں دو چار گراپ کی والیاں مار دیں، رینج سے ذرا باہر ضرور ہے ویسے ے7 (بڑا گراپ) کام بھی کرے شاید اور کچھ نہیں تو چوپال کے نیم پر شاخیں پتیاں ہی ٹوٹیں گی، ڈاکو سمجھیں گے پولیس آگئی شاید، اور یہ ہُر ہُر چڑیاں اُڑ جائیں گی، چور کے پاؤں نہیں ہوا کرتے"۔

اور گلاب سنگھ نے بات کاٹ دی" اجی آپ مجھے فلسفہ پڑھا رہے ہیں"۔

نہیں ایک موذی مرنے دو۔ اچھی طرح ایک آدھ گھنٹے میں ۔۔

پھر ان سور ماؤں سے نمٹوں گا۔ تم تماشہ دیکھنا۔ ابھی نکلتے ہی" اور پھر بھائی سے مخاطب ہوا" دیکھ بے لڑکے، یہ ادھر پورب کو نکلیں گے، اور دو تین اُدھر مخالف رُخ پستارہ ڈالتے ضرور جائیں گے جہاں پیال کے گٹھر پڑے ہیں، میں اِس کنارے اور تو اُس کنارے نکڑ پر دبک جانا قطار بنا کر نکلیں گے ہی، اندھیرے میں، میں قطار کے سب سے پیچھے والوں دو کو وَن وَن فیروں پر دھر لوں گا اور تو پستارہ والے دونوں کو دھمک دینا اور پھر پیال کے گٹھروں کی ٹالیں لگی ہیں، لاشوں کو آن کی آن میں دیا سلائی دکھلا کر برابر کرم کر دیں گے"۔

میں نے کہا" ٹھاکرو تم خیر سے راجپوت، میں شیخ، میری مونچھیں نیچی، اس مہابھارت میں پڑنا نہیں چاہتا، معاف کرنا، ساتھ چھوڑ رہا ہوں، میں چوپال جا کر سوتا ہوں۔ رہلو وہ برگد تلے کھڑا ہے، ناحق چوٹ جلا ہا کھائے کرگھا چھوڑ تماشہ جائے، یہاں تا زیں مارنے آئے تھے ڈاکو مارنے نہیں، اور کیوں جی تم دونوں بھائی بھی کوئی تھانہ دار ہو یا شکاری، کیوں خطرہ مول لیتے ہو مفت میں؟"

"نہیں نہیں، مجھے اِن سورماؤں سے نمٹنا ہے، جو میرے دنگل میں ڈکیتی مارنے آئے تھے، اور میاں یہ ہمارا مسئلہ ہے۔"

میں نے بات کاٹ دی۔ "مسئلہ ہے تو انہیں بھگا دو، ابھی، دو تین گراپ کی والیوں میں بھاگ جائیں گے۔۔"

"نہیں نہیں مزہ چکھا کر، اور پھر مہاجن بچّہ تو کورا بچ جائے گا۔ سانپ مرے پھر لاٹھی بھی ٹوٹے تب مزہ ہے، یہ سانپ اور دشمن لڑ رہے ہیں، پہلے ان میں ہو لینے دو پھر ہم نپٹیں گے۔"

"کیا جہالت ہے! خیر بھائی میں تو جاتا ہوں، نہ پولیس والا ہوں اور نہ مجھے مہاجن سے مفت کی پرخاش ہے۔"

ادھر شور سمجھ میں آنے لگا۔ بندوقوں کی آوازیں کم ہوتی گئیں۔ ہراس پورا طاری ہو گیا۔ اور میں نے پلٹ کر بیل رہلو میں لگائے اور گاؤں کی جانب چل پڑا۔ چوہان گڑھ گاؤں اس چھوٹی سی بستی سے اک ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر تھا، فیروں کی آوازیں وہاں تک پہنچیں، تو لوگ گومگو میں تھے، جنہیں اندازہ تھا کہ ہماری بندوقوں کے فیر نہیں ہیں، وہ اور بھی زیادہ پر چول میں تھے اور میں نے پہنچتے ہی حویلی کی ڈیوڑھی پر سنا دی کہ مہاجن کے یہاں ڈکیتی پڑ رہی ہے اور دونوں بھائی مقابلہ کے لیے تیار ہیں۔

سامنے تو آتی نہ تھیں لیکن سر ڈھکے چوپال سے ملحقہ گئو خانہ بھینس باڑے میں دودھ کے جانوروں کی دیکھ بھال کرنے اور نوکر نہ ہو تو دودھ کاڑھنے نظر آ جایا کرتیں، اور بہوئیں تو آواز کا پردہ کرتی تھیں۔ سو چھوٹے تو چھوٹے بڑے سبحان اللہ، بیٹے خواہ مخواہ کے محاذِ جنگ پر تھے، حویلی میں سے بڑی ٹھکرائن اس گھڑی چیختی ہوئی اس برزخ سے برآمد ہوئیں کہ دوپٹہ راجپوتی بندش مونڈیسے کی طرح سر پہ بندھا ہوا اور لہنگا راجپوتی دھوتی کے انداز میں لنگ چڑھا دو بیچ پیچھے کو کسا ہوا، ہاتھ میں سُر گیاش خسر اور سیکنڈھ باشی شوہر اثاث البیت ورثے میں پرانے پرکھوں سے پہنچا ہوا

پانچ سیر وزنی شیاموں گولوں، موٹھوں منڈھا گرز سالٹھ۔ قد جیسے ہاتھ بھر اونچا، مردانہ وار تنی ہوئی اور دونوں بہوئیں دائیں بائیں بغیر گھونگھٹ کے سربلند۔ ساس بہوئیں گاؤں کے بیچوں بیچ قدیم کنوئیں کی جگت پر جا دھمکیں۔

اور ساس نے جگت پر تلسی کے پودے پر سے پتے کھسوٹ کر منہ میں رکھے اور وہیں سے دیہاتی روایت کے بموجب " دوہائی " پکار دی، صدائے امداد، جو مظلوم ہو یا مقتدر آڑا وقت پڑے، مدد کے لیے پکارنے کا مخصوص طریقہ ہے، اور چوپالوں پر سے خاتون کی آواز کے ساتھ گھروں میں سے الاؤوں اور بستروں سے اٹھ اٹھ کر کاشت کار، دخیل کار موروثی اور رعایا، کھیت مزدور آواز پر لٹھ لیے چل پڑے۔ کوا ریر پڑی، تو ارد گرد کی ذیلی چھوٹی بستیوں سے، چمار پاسی، مولا زادے پٹھان، جھوجھے، باڑھوں سے کاچھی، جھونپڑیوں میں رہنے والے اور گاڑھا کھدر بننے والے جولاہے، دھنے، کھیت مزدور، چمار پاسی، لودھے، ساتوں قوم ٹھکرائن کے گرد جمع ہو گئے اور آن کی آن میں بستی کا ایک بھی نوجوان، جوان یا بوڑھا گھر میں نہ رہا جیسے ہر کوئی ایک سے ایک بڑھ کر سر ہتھیلی پر لیے اپنی بوڑھی مالکن کے گرد موجود تھا۔ اور بوڑھی ٹھکرائن کی آواز ہی جیسے بدل گئی، کڑک کر لام بندی پکار دی، بغیر مفصل سمجھے کہ مسئلہ کیا ہے، اور نہ ایسے وقت ضرورت ہوتی ہے کہ تفصیل سے بتایا جائے اور سمجھ سے بھی کام لیا جائے اور صرف "کر" کے سلیقہ میں، بے ہنگم طور پر، ہر کوئی مارنے مرنے پر تل گیا۔ چند لفظوں میں بتایا کہ دونوں آقاؤں کا ڈاکوؤں سے مقابلہ ہے، کہاں اور کدھر؟ اس کی شاید اس اندھیری رات میں ضرورت بھی نہ تھی اور ٹھکرائن نے پانچ سو سر فروش لٹھ بند جوانوں کے ساتھ مہاجن نگری کا رخ کیا۔ بستی سے باہر بنجر کے میدان پہ ایک دو سو گز بڑھے ہی تھے کہ مہاجن نگری کی جانب سے ون، ون دو فیروں کی آواز سنائی دی، جواب تک کے فیروں سے مختلف تھی اور ٹھکرائن اچھل پڑیں، وہ بیٹوں کی کارتوسی بندوقوں کی آواز پہچانتی تھیں یک دم بول پڑیں " یہ میرے اتر جا کی برج لوٹ چلی " اور بندوق کی آواز پر مجمع کا جوش فزوں تر ہوا۔ اور قدم تیز اور چند ہی ساعت بعد دوسرے

ٹھن، ٹھن فیر ہوئے، اور ٹھکرائن نے پھر اچھل کر کہا۔ "یہ میرے گلبا کی تُمن چلی"۔ اور مجمع اور بھی زیادہ مہمیز ہو کر بڑھا اور میں چوپال کے چبوترہ کی مُنڈیر سے شیخ بیٹھا بیٹھا دیکھ، باوجود اندھیری رات ہونے کے شروع رات کے منصوبہ کی روشنی میں جیسے روزِ روشن میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور ڈیڑھ کوس آگے کی نظر آرہی تھی اور اب تیسرے اقدام کا منتظر تھا۔ ساتھ ہی ساتھ فیروں کی آوازوں سے اندازہ کر لیا کہ کلوز رینج سے اور بھر پور بھرے پڑے ہیں۔ تمام منصوبہ ابھی ذرا دیر پہلے میرے مواجہّ میں جو ہڑکنا لے بنا تھا اور رابطہ جیسے مشینی انداز میں منصوبہ کے مطابق تھا اور تیسری شق میں چند منٹ بعد مہاجن نگری کے قریب سے بڑے زور سے آگ بھڑکی جو میرے علم میں اور دونوں بھائیوں کے منصوبہ کی آخری کڑی تھی۔ اور اب چوپال سے اُتر کر میں بھی مجمع کے سو سوا سو گز پیچھے پیچھے ہو لیا۔ دونوں بھائیوں کے آپریشن کی ایک ایک شق میرے ذہن میں تھی اور یہ آخری عمل تھا میدانوں میں تا حدِ نگاہ چاروں طرف روشنی پھیل گئی، وہ جو کہتے ہیں ایک سوئی بھی پڑی ہو تو نظر آجائے، اور اب روزِ روشن کی طرح ہر چیز سامنے تھی، اور دیہاتی ڈکیتوں میں ایسی آتش زنیاں، ڈکیتوں کو فوراً بھاگنے پر مجبور، اور لوٹ مار کو ناکام بناتی ہیں پولیس تفتیش کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتی ہیں، ہر صورت میں ڈاکوؤں کی موت کے مترادف ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس وقت تو مخالف سمت فرار ہوتے ہوئے ڈاکوؤں کی لمبی لمبی پرچھائیاں بھی نظر آگئیں اور فرار کے رُخ کا تعین ہو گیا۔ مجمع اور بڑھا اب روشنی تھی، جیسے دن پھیلا تھا۔ اک فرلانگ بھر میدان میں بڑھ پائے تھے کہ سامنے سے دونوں بھائی دوڑنے اور لپکنے کے بین بین چال بڑھتے نظر آئے، بندوقیں کندھے پر لٹکی ہوئیں، تاہم اتنی اہم مہم سر کرنے کے باوجود بدحواس نہیں۔ مجمع کو شانت کیا۔ ماں کو تسلّی دی اور سب کو واپس کیا۔ کوئی بات نہیں، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔

اس طرح، بیٹوں کی خاموش منصوبہ بندی، اور ماں کی بے تکی پکار کا یہ

ڈرامہ کامیاب ربط ضبط کے ساتھ اختتام پذیر اور ڈراپ سین ہوا۔ مہاجن شاید سمجھا کسی نے پتائی میں آگ لگادی۔ دونوں بھائیوں کے فیروں کی آواز ماں نے تو دو میل سے سُن کر پہچان لی، لیکن مہاجن نگری کی رستخیز میں کون تمیز کر پاتا۔ تاہم ڈکیتی اور لوٹ مار بھی کامیاب رہی، پر خلوص، سادہ مزاج دیہاتی مخلوق مالکن کی پکار پہ مارنے مرنے کے لیے جمع ہو گئے تھے، مالکوں کی ہدایت پر واپس ہو گئے۔ اب آدھی رات کھس چکی تھی، اپنے اپنے ٹھکانوں میں جا سوئے۔ بستی پیچھے ایک آدھ کائیاں ہوتا ہے، ایسے ایک صاحب نے، جو چوہان گڑھ کے مانے ہوئے بولنے والے تھے، شادیاں پٹانے والے غالباً حجام تھے کوئی ایسے ہی ویسے، استفسار اور دریافت حال کرنا چاہا، لیکن گلاب سنگھ نے جھڑک دیا اور اتنے بڑے وقوعہ کے ہم تین اصل محرمِ راز درون پردہ تھے۔ یوں یہ تمام علاقہ کا، تھانہ اور ضلع کے پورے حلقہ کا اور ہائی کورٹ تک کا رازِ تھا جسے آتش زدگی اور دھماکوں نے روزِ روشن کا راز بنا دیا تھا۔ لطف یہ کہ اس آتشزدگی میں کارگزاری ایسی پسِ پشت جا پڑی تھی کہ راکھ ہو گئی تھی اور تو اور پیشہ ور تفتیش کرنے کے مجاز سرکاری محکمہ کے علم و رسائی سے باہر ہی رہنے کے امکانات روشن تھے۔ اب ہم تینوں چوپال میں ایک مداخل کمرے کے اندر آبیٹھے۔ چلم بھر بھر کر دینے والے چھوکرے کو بھی ہٹا دیا۔ اور میں نے گلاب سنگھ کو اس کے منصوبہ کے لفظ بہ لفظ درجہ بدرجہ کامیاب ہونے پر خراجِ تحسین پیش کیا، جو میرے علم میں اس طرح تھا، جیسے میرے چلے آنے کے بعد سب کچھ میرے روبرو بیتی ہے اور گلاب سنگھ نے سرگوشی کے انداز میں روئداد بیان کی۔

" میاں بات سیدھی سادی تھی، جیسے ہرن کے شکار میں ہوا کرتی ہے، کچھ ویسی ہی، وہ پستارہ ڈالنے والے دو (اتراج) کے سامنے سے گزرے اور اس نے دھر لیے اپنی بھاگ بھری کی نوک پر، ٹھن ٹھن دو فیروں میں کھوپڑیاں پاش پاش کر دیں، اور اُدھر مخالف سمت میرے سامنے سے پوری اڑتیس کی قطار کی قطار گزری، جیسے ہرنوں کی ڈار۔

کے شکاری کی طرح کالا ہرن، چلتا ہے، میں دبکار ہا اور سب سے پیچھے والے جو بالعموم گروہ کے سردار مکھیا ہوتے ہیں جب میرے سامنے پڑے تو میں نے گراپ کے دن دن فیروں میں لپیٹ لیے اور تم نے دیکھا ہی تھا پیال پتائی کے جوہڑ کی پوری دھان کی فصل کے ڈھیر تھے، پہاڑ لگے تھے۔ لاشیں زیادہ گھسیٹنی بھی نہ پڑیں گٹھروں کے بیچ تھیں، وہیں ذرا نکال کر دیا سلائی دکھلا دی آن کی آن میں گٹھر بھڑک اٹھے ڈاکو ادھر بھاگ رہے تھے اور ہم دونوں ادھر اپنے گاؤں کی جانب ــــ سب کچھ روشن تھا۔ اور تم اور ماتاجی لام لے کر ادھر سے بڑھ رہی تھیں، وہ جو کہاوت، سوتے کا چوما، نہ ماں کا نہ باپ کا ہوا۔ جس گڑ ہی بھاگڑ، یاں سے واں تک، کوس بھر کے اندر کھلے میدان، اور دن دوپہر اجالا ہونے کے باوجود نہ ڈکیتوں کو معلوم نہ مہاجن ہی کو، اور تو اور نہ اپنے گاؤں والوں کو کہ ہوا کیا!" قہقہہ پڑا۔

میں نے کہا۔" لیکن سنگین پولیس کیس ہے، تفتیش ہوگی، اور قانون دانون تو نہیں ہے لیکن بندوق کے لیسنس دار کم بخت کی ذمہ داری ہے کہ گورمنٹ کی مدد کرے، اور اسے پولیس نے اپنا مجاز اور حق بنا لیا ہے، یہاں تک کہ ایسے موقعوں پہ پولیس نہ پہنچے تو لیسنس دار بندوق سر سے کفن باندھ کر جا پہنچے۔ ممکن ہے کہ تم سے مطالبہ کریں کہ فیروں کی آواز پر تم کیوں نہیں پہنچے تو کہہ دینا ہم اندر حویلی میں سوئے تھے، ہم نے فیر نہیں سنے، دو تین میل کی بات ہے۔"

اور گلاب سنگھ نے بات کاٹ دی۔" بھائی آپ اطمینان رکھیں ہم نبٹ لیں گے، دھماکوں کی آواز ہوں، شادی میں گولے چلتے ہیں، رہا تپائی پیال ڈھیروں میں سے کچھ جلی لاشوں کی ہڈیوں پھولوں کا معاملہ، کہیں تو اس کو صبح نکلتے نکلتے بغیر ہی ٹھنڈا ہوئے بھوبھل کو جوہڑ میں ڈلوا دیں۔"

"اماں لاحول ولا قوۃ! پہلے تو کریدیں گے نہیں پولیس والے، اور بفرضِ محال کوئی چیز برآمد کر بھی لیں تو ہم کیا جانیں، ہماری تو موجودگی ہی وہاں کہیں آس پاس نہیں ہے وہ تو گلیا میں گڑ پھوٹ گیا۔"

اور گلاب سنگھ نے بشاش ہو کر کہا " ڈاکوؤں کو بھی مزہ چکھا دیا کہ آئے تھے گھمنڈ سنگھ کے دنگل میں ڈکیتی مارنے اور مہاجن کی بھی پشتوں کی کھائی پی نکل گئی ہوگی، وہ جو کہی تھی، سانپ تو مرا پر لاٹھی بھی ٹوٹی، مزہ ہی آ گیا۔"

" وہ تو سب کچھ ہے، لیکن ہمیں پولیس کے پہنچنے سے قبل پہنچ کر جائزہ لینا ہے، اور مجھے قبل دوپہر چلا جانا بھی ہے، بھئی بے کار میں پولیس کے سوالات جوابات میں کیوں پڑوں، اِس بستی سے لام بندی اور مدد مقابلہ کے لیے اجتماع ہوا ہے، اگر پوچھیں تو کہہ دینا کہ ہم تو اندر سوتے رہے۔ بستی والے دھماکوں پر چل پڑے تھے کہ اُدھر سے کسی نے آگ لگا دی۔"

ہم بقیہ رات باتیں کرتے رہے۔ اتراج سنگھ ہماری چلمیں بھر بھر کر حقوں پر رکھتا رہا۔ اور صبح تڑکے اصطبل سے تینوں گھوڑیاں کس کر بغیر ایک سائیس بھی ساتھ لیے مہاجن نگری پہنچے تو ڈکیتی پڑے ساتواں گھنٹہ تھا اور پوری ہراس۔ بستی جاگ پڑی تھی لیکن اپنے گھروں کے اندر سے دروازے بند کیے اور بستی میں موت کا سناٹا اور خوف کا دور دورہ تھا۔ ہم نے مختصر سی آبادی کا ایک چکر لگایا تنگ نلقیوں اور پتلی گلیوں سے گزرے گھوڑیوں کی چاپ ہوئی اور ہم نے ہمت بندھائی آوازیں دیں تو لوگ گھروں سے نکلے، سراسیمہ، خائف، پینک زدہ بدحواس سے، جو رات کے وقوعہ کا فطری ردِّ عمل تھا۔ ہم نے ہمّت افزائی کی، اور ہراس میں کمی ہوئی، ساتھ ہی ساتھ اندازہ ہوا، جو رات کی خاموشی میں ڈکیتی شروع ہوتے ہی جو ہڑ پر بیٹھے بیٹھے آوازوں سے ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ مہاجن اپنی حویلی کے اندر سے مدد کے لیے پکار دیتا رہا، لیکن لوگوں نے جاگتے ہونے کے باوجود کروٹ نہ لی تھی۔ حتیٰ کہ مہاجن کی پکار پر آواز بھی کسی ایک آسامی نے نہ دی تھی نہ ہی کسی نے ہمّت بندھاتی آواز ہی دی تھی، اور مہاجن اپنی بپتی میں اکیلا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ایک بوڑھی عورت کی "دُہائی" اور رات کی صدائے استمداد اور روزی رساں مہاجن

کی مصیبت بیتی آوازوں کا مقابلہ کیا۔ دونوں بھائی گلاب سنگھ اتراج سنگھ کی جانب دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بات ہو گئی، سُود در سُود کے میزان کُل میں یہ مدّ شرط نہیں آئی ہے مہاجن لٹتا رہا، مدد کے لیے مویشی کی طرح ڈکرا ڈکرا کر اپنے آسامیوں کو پکارتا رہا، جن کی روزی کا کفیل بھی ہے، لیکن مدد کے لیے گھر سے باہر آنا تو درکنار کسی ایک نے اپنے گھر کے اندر سے ہمّت بندھاتی ایک آواز بھی نہ نکالی۔ ورنہ بعض بعض گھر تو حویلی اور چوپال سے اتنے ملحق تھے کہ اپنی نیچی دیواریں پھاند کر اور کچھ نہیں تو مہاجن کی چوپال اور مویشی خانہ کے چھپروں میں ہی آگ لگا سکتے تھے اور بات بن سکتی تھی، ڈاکوؤں کو بھاگتے ہی بن پڑتی، اور ستم یہ کہ اس گھڑی ہمارے پہنچتے ہی سب کے سب ہمارے آس پاس جمع تھے اور یہ سُود در سُود اور وجوب لگان آراضی دو سال کے سال واجب ہونے والی رقوم کے مثبت منفی ردِّ عمل اور اثرات تھے۔ خیر ہم مہاجن کی حویلی کی ڈیوڑھی پر پہنچے، تو پیش دروازہ مہاجن کا کتا، جو نمک کی آخری ڈلی ادا کر کے کسی ڈاکو کی گولی کا شکار مرا ہوا پڑا تھا تب حویلی کی چھتوں اور اندر ڈاکو داخلہ لے سکے تھے۔ باہر سے مضبوط کواڑوں کی کُنڈی لگی ہوئی تھی جو چلتے وقت ڈاکو لگا گئے تھے اور پہنچنے والوں میں ہم تینوں اپنے گھر سے اور بستی والے اپنے اپنے گھروں سے پہلے لوگ تھے۔ اور حویلی میں گھستے گھستے جیسے گلاب سنگھ کا نظریہ میرے ذہن میں گونج گیا، جیسے مہاجن نگری کے کسان اور چوہان گڑھ کا ٹھاکر یہاں سے وہاں تک دونوں اپنی اپنی جگہ پر مہاجن کے معاملہ میں بیک رائے متفق تھے۔ اس ظالم نے جوہڑ کے کنارے سے میری تجویز کے مطابق ڈاکوؤں کو فوراً ہی ڈرا کر بھگانے کے لیے دھماکے نہ کرنے دیے اور یہ سُود در سُود کے نمک حرام گھروں میں بیٹھے رہے۔

حویلی کے اندر پہنچے تو سب سے پہلے ہمیں گلاب سنگھ کی آرزو کے مطابق صحن میں سادہ تمسکوں اسٹامپوں کے پرزے پڑے نظر آئے جو ڈاکو پھاڑ کر پھینک گئے تھے اور یوں دُور دُور کے رہنے والے مقروض آسامی گھر بیٹھے بیباق کر گئے تھے۔ میں مہاجن کی حویلی میں پہلی مرتبہ آیا تھا۔ چوکی، دالان در دالان صحنچیوں، کوٹھریوں، کوٹھکیوں والی لق ودق دونی حویلی اور صحن میں ایک نیم کا درخت، جو کہتے ہیں تین سو سال پرانا تھا۔

اور سامنے والے دالان سے کراہنے کی آواز سُنائی دی، بڑھے تو مہاجن زمین پر پڑا تھا اور رات کی کھُدی، تازہ مٹی کی ڈھیری سے لپٹا رو رہا تھا، پاس پہنچے تو کو لہوں، تو ند اور جسم پر آبلے اور جلے ہوئے لمبے لمبے آبلوں چھوٹے زخم تھے، جنہیں دیکھتے ہی ہم نے اندازہ کرلیا کہ لپٹوں اور سلاخوں سے داغے گئے ہیں۔

اور دیہاتی ڈکیتیاں ہمیشہ ایک تکنیک پر ہوتی ہیں، چوروں کی طرح بستی میں داخل ہو کر پہلے گلیوں میں نکڑوں پر قبضہ کرتے ہیں پھر کسی نہ کسی طرح جس گھر میں لوٹ مار کرنا ہوتی ہے داخل ہو کر چھت پر قابض ہوتے ہیں اور بندوق کے دھماکوں سے ہراس فضا قائم کر کے بالعموم زینہ کے راستے صحن میں اترتے ہیں۔ ڈیوڑھی کی اندر سے کُنڈی کھول دیتے ہیں اور گروہ گھر میں داخل ہو جاتا ہے اور مار پیٹ، اذیت کے مختلف ذرائع سے گھر میں بالعموم زیر زمین دفن دولت کا پتہ پوچھتے ہیں۔ اس عمل داری کے قیام میں کم و بیش دو گھنٹے لگتے ہیں، اور ڈاکو لوٹ مار کر کے فرار ہوتے ہیں۔ اذیت اور دریافت حال میں مہاجن چمٹوں اور گرم سلاخوں سے گزرا تھا، تب کہیں جا کر ڈاکوؤں کو مطلب و مال برآری ہوئی تھی اور مہاجن کو ان چرکوں اور لپٹوں کے زخموں اور آبلوں کی سوزش کا مطلق احساس نہ تھا۔

تشریح البدن کے ماہرین کی دریافت کے مطابق دماغ اعصاب کا منبع و مخرج ہے، اور اعصاب ذریعۂ خبر و موجبِ حس ہے، لیکن اس گھڑی معاملہ دل کا تھا اور دماغ ان آبلوں چرکوں سے بے نیاز اور صرف دلِ ضیاعِ زر کے غم میں مبتلا تھا۔ اور ہم نے اس کی اپنائیت والے انداز میں فریاد اور آہ و بکا کو تو اِن سوزشوں اور چرکوں پر محمول کیا جو ڈاکوؤں نے زیر زمین دفن دولت کا پتہ ذرائع واقفیت پوچھنے میں استعمال کیے تھے، آگ کی لپٹوں پر بٹھایا تھا۔ چمٹوں اور سلاخوں سے داغا تھا تب انکشاف ہوا تھا۔ لیکن مہاجن گڑھے پر بیٹھا اپنی بارہ گرہ زیر زمین دفن اشرفیوں کے نقصان پر ہمیں دیکھ کر فریاد کے انداز میں ڈیک مار کر رویا۔ ” لے گئے! لے گئے! لے گئے! “ جو رکا یک

ہماری سمجھ میں بھی نہ آیا اور گلاب سنگھ ہی اطمینان اور خوشی کے فھوالمُراد ھونکاروں کے ذریعہ سمجھاتا گیا، اور میں سمجھ گیا کہ یہ اس کے رات کے منصوبہ کا آخری عمل اور رشق ہے جو پوری ہوئی۔ اور مہاجن رینگتا لڑھکتا ہوا، دوسرے ایسے ہی گڑھے پر پہنچا، اور وہاں پہنچ کر رات کی کھدی ہوئی مٹی پر دوسرا واویلا مچایا، جیسے باپ کی کریا کے راکھ کے پھولوں پر رو رہا ہے، "لے گئے! لے گئے! سونے کی اینٹیں، پرکھوں کے وقتوں کی دبی ہوئی۔ ہائے ہائے ہائے!" اور مجھے پھر رات کی بات یاد آئی۔

"اجی مہاجن کی اچھی طرح کندی ہونے دو، دنیا بھر لوٹ لوٹ کر گھر میں بھرلی ہے، (گالی) اور پھر گلاب سنگھ ڈاکوؤں کو بھگانے والی ترکیب اور ہم تینوں کی تجویز سے انکار کرتے ہوئے نظر آیا۔ اور اتنے میں مہاجن پھر لڑھکا اور ایک صحنچی میں جا پہنچا، "بڑی گولی والے (دام شاہی) ہزار روپیا! ہزار روپیا! ہزار روپیا! لے گئے! لے گئے! ہائے ہائے سب لے گئے!" اور اتنے میں دوسری جانب سے ایک بھرّائی ہوئی نسوانی آواز سنائی پڑی، مہاجنی بین کر اٹھی، اس کے کپڑے تار تار، جھرلیوں دار چہرہ پر نیل اور جگہ جگہ اسی قبیل کے جلانے چیکنے اور مارنے کے نشان اور گھسیٹنے کی رگڑیں، اس نے فریاد کے انداز میں اپنے کرچے کی رقوم کے حوالے دیتے ہوئے مار کے ساتھ زیرِ زمین لوٹ کے کھُدے ہوئے نشان دکھا کر فریاد کی، اور سینہ کوبی کرنے لگی، اور مہاجن جورو کو مغلضات گالیاں دینے لگا۔ پتہ نہیں کرچا کرنے پر یا دبا ہوا مال بتانے پر۔ تاہم گلاب سنگھ کا موڈ بدستور رہا۔ بڑبڑایا "اری نیک بخت تونے کون سے ہل جوت کر، اور گیہوں بیچ کر جمع کیے تھے، چوری میں موری، تیرے خصم نے دنیا بھر کو لوٹ کر گھر بھرا اور تونے (گالی) اس کو چھل فریب دے کر کرچا کیا! لیکن فریاد تو بہر حال فریاد ہے اور متقدر ہستیوں کو کیسے ہی نہ کیسے سننا پڑتی ہے، اور اظہارِ ہمدردی خواہ نوک زبان ہی سے کیوں نہ ہو کرنا ہی ہوتا ہے، لیکن گلاب سنگھ باوجود شکاری اور اسپورٹس مین ہونے کے زیرِ لب گالیوں ملاحیوں کو نہ روک سکا، اور موڈ بدستور

رہا، اور اس پر مجھے اک ذرا جذبۂ نفرت سا ہوا اور چھوٹے بھائی کو شاید بڑے بھائی کے اس روّیہ و ردّعمل پر انفعال سا ہوا، جیسے یہ سب انھیں قبلہ کا کیا دھرا ہے، جنھوں نے میری اٹھی بندوق پکڑ لی تھی، ورنہ ڈکیتی ہی نہ ہو پاتی، اور نہ یہ سب ہو پاتا جو ہم اس گھڑی دیکھ رہے ہیں۔

مہاجن کے گھر میں بقیہ افراد اس کے دو جواں سال بیٹے ایک نوخیز بیٹی اور دو نوجوان بہوئیں تھیں، اور جب ہم لق و دق حویلی کے اس حصّہ میں پہنچے جہاں نیم کا چھتنا ور درخت صحن میں کھڑا تھا تو عجیب ہی منظر پایا۔ نیم کی موٹی شاخوں میں دو لاشیں سی بندھی لٹکتی دیکھیں تو یک نظر میں تو سمجھ ہی نہ سکے کہ کیا ہے، لیکن فوراً ہی پہچان لیے، موٹی موٹی رسّی سے دونوں بیٹے اُلٹے ٹنگے ہوئے ہیں اور زندہ تو ہیں تاہم ناک سے خون رِس رہا ہے۔ ہم نے مہاجن نگری کے آسامیوں سے اتارنے کے لیے حکم دیا، اور کئی آدمیوں نے چڑھ کر رسان رسان اتارا، مارنے پیٹنے، گھسیٹنے کے بعد لٹکائے گئے تھے، اور سامنے ہی عورتیں خراب کی گئی تھیں۔ بے ہوش تھے، نیم کے نیچے چارپائیوں پر ڈال دیئے، اور اب تینوں عورتوں کو تلاش کیا تو ذرا اندر صحنچی میں بے ہوش پڑی پائیں، اور ہمیں اندازہ ہوگیا کہ مہاجن کی نوجوان بہوئیں اور نوخیز بیٹی تینوں عورتیں چالیس کے چالیس ڈاکوؤں کی بے تکی اور بے اندازہ ہوس کا نشانہ بنی ہیں، اور یوں چور چور اور بے حال ہیں۔ مجھے تو ملال اور عبرت ہوئی لیکن یہاں سے گلاب سنگھ کے موڈ نے اُلٹا موڑ لیا۔

"ہائے ہائے، یہ کنّیائیں، ناریاں ہائے ہائے کیسی ہوئی، تم نے تو پہلے دھما کے پر کہا تھا، اِن کی عصمت بچ جاتی اگر میں بدبخت تمہیں ڈاکوؤں کو بھگانے سے نہ روکتا۔ ہائے ہائے یہ میں نے کیا کیا! یہ معصوم داسیاں شکار ہوئیں، ارے ہم تو ہرنی پر بندوق نہیں اٹھاتے ہیں، اور یہ عورتیں ڈاکوؤں کی ہوس کا نشانہ بنیں۔ اب اپنے کیے کی پاداش میں میں خود ــ خودکشی کروں تو بھی یہ کلاپ پورا نہ ہوگا۔ ہائے

ہائے! میں نے یہ کیا کیا!"

اور جواں سال راجپوت پر آثار شدید ہوتے گئے اور اب ہم باہر آگئے اور چل پڑے، دن چڑھ گیا تھا، گھوڑیوں پر سوار ہو کر چلے تھے تو ہاتھ میں کوڑے تھے اور بندوقیں چوپال کی ہتھیاروں والی کوٹھری میں تھیں اور معاً میرے دماغ میں بجلی سی کوند گئی۔ آثار کی شدت اور جذبات کے چڑھاؤ کا اندازہ کر کے مجھے چھٹی حس نے آواز دی ۔" یہ چوپال میں پہنچتے ہی اپنے بندوق نہ مار لے۔ بیڈھب ہو رہا ہے، لیکن خیریت سے اس کوٹھری کی کُنجی اتراج کی انٹی میں تھی، وہ اپنی گھوڑی شاہ گام چلاتا ہوا ہم سے ذرا علیحدہ کو ہو گیا۔ میں نے اپنی گھوڑی کی کنوتی ملاتے ہوئے اتراج سنگھ سے زیرِ لب کہا۔

" دیکھ رہے ہو دِدّا کو بہت ملول ہو رہے ہیں' اور بے حد منفعل۔ بندوقوں کی کُنجی مجھے دے دو، ورنہ کچھ کر بیٹھیں، ٹھیک نہیں ہے۔"

اور وہ چھوٹے بھائی کی حیثیت سے مجھ سے زیادہ ان کا مزاج آشنا، موڈ شناسا تھا اور خود شاید ایسے ہی اندیشہ میں مبتلا تھا۔ گھبرا کر کُنجی میرے حوالہ کر دی، چوپال پر پہنچتے ہی خوں بار آنکھوں سے گلاب سنگھ نے چھوٹے بھائی سے کُنجی مانگی، اور چھاتی پھاڑ کر آواز نکالی ۔" ہائے ہائے معصوم کنّیا اور باعصمت عورتوں کا یہ انجام، اور میرے قصور میں، ہائے اب مروں گا۔ اتراج سنگھ رونے لگا۔ اور میں نے ڈپٹا کیا بکتے ہو جی! تو جذبات میں بھرا بھاری ولایتی تالے پر کھینچ کھینچ کر زور کرتے لگا۔" کیوں پاگل ہوئے ہو، ہوں نہ تالا ٹوٹے گا نہ تم کو مرملے گا، بیکار بکواس، لونڈے چھورے بنے ہو۔ ہوش میں آؤ، تو بڑے زور سے پچھاڑ کھائی۔ خودکشی کی حد تک پہنچے ہوئے جذبات نے مجبور ہو کر دوسرا راستہ اختیار کیا، بڑے زور سے کوٹھری کے کواڑوں پر سر پٹخا اور نوجوان اتراج سنگھ نے جواں سال برادرِ معظم کو میرے اشارہ پر قابو کر کے روک لیا۔ اور میں نے ڈپٹ کر ہاتھ پکڑے تو جاڑا سا چڑھ رہا تھا اور جوش و خروش کا ردِ عمل تھا۔

اور مجھے گھر پہنچے تیسرا دن تھا اور منتظر تھا کہ اتراج سنگھ پہنچا۔ گلاب سنگھ کا سادہ

دستخطی کاغذ اور اس کی بندوق مع لیسنس میرے حوالہ کی، اور ساتھ ہی ایک رقعہ۔
" بھائی میں اب کبھی بندوق نہ چھوؤں گا، تم میرا لیسنس کینسل کرنے کی درخواست کلکٹر صاحب کے روبرو گذار دو اور بندوق داخل خانہ کر دو"۔ اور میں شوقین اسپورٹس مین کے خود سزا کے اس پہلو کو سمجھ گیا، میں نے بندوق لیسنس اور درخواست کا دستخطی کاغذ رکھ لیا اور دو روز قیام کے بعد اتراج سنگھ چلا گیا اور جاڑوں کے سیزن بھر عمر میں پہلی مرتبہ ہمارا شکار بند رہا۔ ہرنوں کے شکار کے دو تین موقعے اور موسم یوں ہی نکل گئے اور تین مہینہ بعد اتراج سنگھ ہی پھر آیا، اور گلاب سنگھ کا رقعہ لایا " بھائی، اس لڑکے نے بھی میرے ساتھ شکار چھوڑ دیا اب تم آؤ ذرا اس کو سمجھاؤ اور کھیلو؛ میں تو کھیلنے نہ جاؤں شاید۔ اُس رات مہاجن نگری کی جوہڑ پر میں نے اِس کی بندوق پکڑ لی تھی اور تمہاری تجویز پر عمل نہ ہونے دیا تھا ورنہ تین عصمتیں برباد نہ ہوتیں، اور اس سزا میں میں نے تو عمر بھر بندوق نہ اٹھانے کا بردان دیا ہے"۔

۱۹۸۵ء

ہر بڑا فکشن نگار ایک بھرپور قطعہ زمین کا مالک ہوتا ہے۔ اس حقیقی بساط پر وہ اپنے افسانوی مہروں یعنی کرداروں کو حرکت میں لاتا ہے۔ ان کی باہمی آویزشوں سے طرح طرح کے نقشے بنتے اور بگڑتے ہیں۔ ابوالفضل صدیقی ہمارے عہد کے ایک بڑے افسانہ نگار ہیں۔ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے کی دیہاتی زندگی کی تصویر کشی میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ کہنے کو وہ دنیا مٹ چکی لیکن انسانی جبلتوں، خواہشوں، کمزوریوں اور عظمتوں میں کہاں فرق آتا ہے۔ اس لیے اس بیتے دور کے نقش و نگار میں بہت کچھ ایسا ہے جو جانا پہچانا اور اپنا ہی قصہ معلوم ہوتا ہے۔

"دن ڈھلے" میں شامل افسانوں میں ابوالفضل صدیقی کا فن اپنے عروج پر ہے۔ "مفردات خصوصی" کو شاہکار کا درجہ ملنا چاہیے۔ اس کا سیاہ مزاح اور چونکا دینے والا اختتام ناقابل فراموش ہے۔ "ریوڑیوں کا کھیت" اردو کے بہترین مزاحیہ افسانوں کی صف میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ "شکار گاہ" میں افسانے اور رپورتاژ دونوں کا لطف ہے اور جنگل سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔ "زیر دام کون" اور "سود در سود" میں بات شکار سے شروع ہو کر ڈرامائی اور الم ناک رخ اختیار کرتی ہے۔ کھلی فضاؤں میں پھیلتے سمٹتے یہ افسانے ہمارے ادبی منظر نامے میں تازہ ہوا کا جھونکا ہیں۔

ISBN: 969-8225-03-5